# عباد الرحمٰن

## حضرت مسیح موعودؑ اور خلفاء احمدیت

کے

## ارشادات کی روشنی میں

(لجنہ اماء اللہ اسلام آباد)

(صرف احمدی احباب کے لئے)

# عباد الرحمٰن

## حضرت مسیح موعودؑ اور خلفاء احمدیت

کے

## ارشادات کی روشنی میں

مرتبہ

حنیف احمد محمود

(شائع کردہ: لجنہ اماء اللہ اسلام آباد)

# انڈیکس

# پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے اور عبادت کے حقوق ادا کرنے والے کو ''عبد'' کے لفظ سے یاد کیا۔ اور سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے عبادالرحمٰن کی علامات بیان فرمائیں۔ اور ان کی تشریح و تفسیر میں جو خطبات، خطابات اور ارشادات سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفائے احمدیت نے بیان فرمائے اُن کو اس کتابچہ میں افادہ عام کے لئے اس دُعا کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کرہ ارض پر محیط تمام احباب جماعت کو حقیقی معنوں میں اپنا عبادالرحمٰن بنائے۔ آمین

عبادالرحمٰن میں اپنے آپ کو شامل کئے رکھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی سعادت اور عطاء ہے اور اس طرح جہاں فرشتوں سے مماثلت ہو رہی ہوتی ہے وہاں تمام انبیاء بالخصوص ہمارے بہت پیارے محسن آقا خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عادات اور خصائل کے اعتبار سے انسان اپنے آپ کو ملا لیتا ہے۔ کیونکہ ان تمام کو اللہ تعالیٰ نے ''عبد'' کہہ کر پکارا ہے۔

جہاں تک فرشتوں سے مماثلت کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ''عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ'' کہہ کر پکارا ہے (الزخرف:20) اور ان کی صفات قرآن کریم میں یہ بیان ہوئیں کہ

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَ هُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَایُؤْ مَرُوْنَ ٥ (التحریم:7)

اور یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (الزمر:76)

کہ اللہ نے (فرشتوں) کو جو حکم دیا ہے اس کی وہ نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ (انہیں) کہا جاتا ہے وہی کرتے ہیں...... اور وہ (فرشتے) اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

یہی دو صفات درحقیقت خلاصہ ہے سورۃ الفرقان آیات 64 تا 78 میں بیان

فرمودہ عبادالرحمٰن کی صفات کا اور ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے مومن بندوں کو فرشتوں کی اقتداء میں آنحضور ﷺ پر درود بھیجنے کی نصیحت بھی کی ہے جیسے فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًاo (الاحزاب:57)

کہ یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم بھی اس پر درود اور خوب خوب سلام بھیجو۔

دوسری طرف انبیاء کو عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (الانبیاء:27) یعنی قابل احترام بندے قرار دیا ہے۔اور آنحضور ﷺ کو سورۃ الجن آیت 20 میں جہاں عبداللہ کہہ کر پکارا گیا ہے وہاں آپ ﷺ کو دو حکموں کی تعمیل کا بھی ارشاد ملتا ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ پکار اور نہ اس کا شریک ٹھہرا۔ (۲) اور مخلوق کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچنے پائے۔

پس وہ لوگ کیا ہی خوش نصیب ہیں جو سورۃ الفرقان میں بیان فرمودہ عبادالرحمٰن کی صفات پر عمل کر کے اپنے آپ کو فرشتوں اور انبیاء سے مماثلت میں شامل کرتے ہیں۔

عبادالرحمٰن کی صفات کو تفصیل سے جاننے کے لئے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام اور خلفائے احمدیت کے ارشادات کو ایک مائدہ کی صورت میں لجنہ اماء اللہ اسلام آباد پیش کر رہی ہے۔ جسے مکرم حنیف احمد محمود صاحب نے ہمارے لئے تیار کیا ہے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہم عبادالرحمٰن کی تمام خصوصیات کے حامل بنیں تا ہمارا اندرونہ صاف ہو۔ ہمارا اپنے خالق سے تعلق مضبوط ہو اور ہم اللہ تعالیٰ کی دائمی جنتوں کے وارث ٹھہریں۔آمین

سیدہ ذاکرہ ناصر

صدر لجنہ اماء اللہ ضلع اسلام آباد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٤﴾

٦۴۔اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو (جواباً) کہتے ہیں ''سلام''۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿٦٥﴾

٦۵۔اور وہ لوگ جو اپنے ربّ کے لئے راتیں سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٦﴾

٦٦۔اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے ربّ! ہم سے جہنم کا عذاب ٹال دے یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والا ہے۔

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿٦٧﴾

٦٧۔یقیناً وہ عارضی ٹھکانے کے طور پر بھی بہت بُری ہے اور مستقل ٹھکانے کے طور پر بھی۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٨﴾

٦٨۔اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو اِسراف نہیں کرتے اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ اس کے درمیان اعتدال ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٩﴾

٦٩۔اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کو جسے اللہ نے حرمت بخشی ہو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا گناہ (کی سزا) پائے گا۔

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٧٠﴾

٧٠۔اس کے لئے قیامت کے دن عذاب بڑھایا جائے گا اور وہ اس میں لمبے عرصہ تک ذلیل وخوار حالت میں رہے گا۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧١﴾

٧١۔سوائے اس کے جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل بجا لائے۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن کی بدیوں کو اللہ خوبیوں میں بدل دے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿٧٢﴾

٧٢۔اور جو توبہ کرے اور نیک اعمال بجا لائے تو وہی ہے جو اللہ کی طرف توبہ کرتے ہوئے رجوع کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾

۷۳۔اور وہ لوگ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ لغویات کے پاس سے گزرتے ہیں تو وقار کے ساتھ گزرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ﴿۷۳﴾

۷۴۔ اور وہ لوگ کہ جب انہیں ان کے ربّ کی آیات یاد کروائی جاتی ہیں تو ان پر وہ بہرے اور اندھے ہوکرنہیں گرتے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

۷۵۔ اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنے جیون ساتھیوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ﴿۷۵﴾

۷۶۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اس باعث کہ انہوں نے صبر کیا بالاخانے بطور جزا دیئے جائیں گے اور وہاں ان کا خیر مقدم کیا جائے گا اور سلام پہنچائے جائیں گے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۶﴾

۷۷۔ وہ ہمیشہ اُن (جنتوں) میں رہنے والے ہوں گے۔ وہ کیا ہی اچھی ہیں عارضی ٹھکانے کے طور پر بھی اور مستقل ٹھکانے کے طور پر بھی۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

۷۸۔ تُو کہہ دے کہ اگر تمہاری دعا نہ ہوتی تو میرا ربّ تمہاری کوئی پرواہ نہ کرتا۔ پس تم اُسے جھٹلا چکے ہو سو ضرور اس کا وبال تم سے چمٹ جانے والا ہے۔

(سورہ الفرقان: 64 تا 78)

# ارشادات

# حضرت مسیح موعود علیہ السلام

جب کافروں اور بے دینوں اور دہریوں کو کہا جاتا ہے کہ تم رحمان کو سجدہ کرو تو وہ رحمان کے نام سے متنفر ہوکر بطور انکار سوال کرتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے (پھر بطور جواب فرمایا) رحمان وہ ذات کثیر البرکت اور مصدر خیرات دائمی ہے جس نے آسمان میں بُرج بنائے ۔ بُرجوں میں آفتاب اور چاند کو رکھا جو کہ عامۂ مخلوقات کو بغیر تفریق کافر و مومن کے روشنی پہنچاتے ہیں۔ اسی رحمان نے تمہارے لئے یعنی تمام بنی آدم کے لئے دن اور رات بنائے جو کہ ایک دوسرے کے بعد دورہ کرتے رہتے ہیں تا جو شخص طالب معرفت ہو وہ ان دقائق حکمت سے فائدہ اُٹھاوے اور جہل اور غفلت کے پردہ سے خلاصی پاوے اور جو شخص شکر نعمت کرنے پر مستعد ہو وہ شکر کرے۔ رحمان کے حقیقی پرستار وہ لوگ ہیں کہ جو زمین پر بُردباری سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے سخت کلامی سے پیش آئیں تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے ان کا معاوضہ کرتے ہیں یعنی بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دعا دیتے ہیں اور تشبّہ باخلاق رحمانی کرتے ہیں کیونکہ رحمان بھی بغیر تفریق نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بے شمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمان کا لفظ ان معنوں کر کے خدا پر بولا جاتا ہے کہ اس کی رحمت وسیع عام طور پر ہر یک بُرے بھلے پر محیط ہو رہی ہے۔

(براھین احمدیہ۔ روحانی خزائن جلد اول ص448-449حاشیہ)

خدا وہ ہے کہ جو رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات لاتا ہے تا جس نے یاد کرنا ہو وہ یاد کرے یا شکر کرنا ہو تو شکر کرے یعنی دن کے بعد رات کا آنا اور رات کے بعد دن کا آنا اس بات پر ایک نشان ہے کہ جیسے ہدایت کے بعد ضلالت اور غفلت کا

زمانہ آجاتا ہے۔ایسا ہی خدا کی طرف سے یہ بھی مقرر ہے کہ ضلالت اور غفلت کے بعد ہدایت کا زمانہ آتا ہے۔

(براھین احمدیہ۔ روحانی خزائن جلد اول ص 654)

۞ وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان:64) کی تفسیر میں حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔

خدا کے نیک بندے صلح کاری کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی۔ روحانی خزائن جلد10ص 348)

۞ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًاوَّقِیَامًا ٥(الفرقان:65) کی تفسیر میں آپؑ فرماتے ہیں۔

سچے مسلمان ہمیشہ غلبہ اسلام کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اور تہجد بھی پڑھتے ہیں اور نماز میں بھی ان کو رقّت طاری ہوتی ہے اور آیت یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًاوَّقِیَامًا کا مصداق ہوتے ہیں۔

(انوار الاسلام۔ روحانی خزائن جلد9ص 84)

عرب اور دُنیا کی حالت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی تھے۔کھانے پینے کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔نہ حقوق العباد سے آشنا، نہ حقوق اللہ سے آگاہ۔چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ اُن کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ یَاْکُلُوْنَ کَمَاتَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (محمد:12) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًاوَّقِیَامًا (الفرقان:65) کی حالت ہوگئی یعنی اپنے رب کی یاد میں راتیں سجدے اور قیام میں گزار دیتے تھے۔اللہ اللہ! کس قدر فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب سے ایک بینظر انقلاب اور عظیم الشان تبدیلی واقع ہو گئی۔حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزان اعتدال پر قائم کر دیا اور مُردار خور

اور مُردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا۔ دونوں ہی خوبیاں ہوتی ہیں علمی یا عملی۔ عملی حالت کا تو یہ حال ہے کہ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان:65)

(ملفوظات جلد اول ص 180)

رسول اللہ ﷺ کو جو جماعت ملی وہ ایسی پاکباز اور خدا پرست اور مخلص تھی کہ اس کی نظیر کسی دنیا کی قوم اور کسی نبی کی جماعت میں ہرگز پائی نہیں جاتی۔ احادیث میں اُن کی بڑی تعریفیں آئی ہیں۔ یہاں تک فرمایا کہ اَللّٰہُ اَللّٰہُ فِی اَصْحَابِی اور قرآن کریم میں بھی اُن کی تعریف ہوئی یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان:65)

(ملفوظات جلد 2 ص 60)

روحانیت اور پاکیزگی کے بغیر کوئی مذہب چل نہیں سکتا۔ قرآن شریف نے بتلایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پیشتر دنیا کی کیا حالت تھی یَاْکُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد:12) پھر جب انہی لوگوں نے اسلام قبول کیا تو فرماتا ہے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (الفرقان:65) جب تک آسمان سے تریاق نہ ملے تو دل درست نہیں رہتا۔ انسان آگے قدم رکھتا ہے مگر وہ پیچھے پڑتا ہے۔ قدسی صفات اور فطرت والا انسان ہو تو وہ مذہب چل سکتا ہے اس کے بغیر کوئی مذہب ترقی نہیں کر سکتا اور اگر کرتا بھی ہے تو پھر قائم نہیں رہ سکتا۔

(ملفوظات جلد 3 ص 431)

میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ خواہ کیسا ہی پکا دشمن ہو اور خواہ وہ عیسائی ہو یا آریہ جب وہ ان حالات کو دیکھے گا جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب کے تھے اور پھر اس تبدیلی پر نظر کرے گا جو آپؐ کی تعلیم اور تاثیر سے پیدا ہوئی تو اسے بے اختیار آپ کی حقانیت کی شہادت دینی پڑے گی۔ موٹی سی بات ہے کہ قرآن مجید نے اُن کی پہلی حالت کا تو یہ نقشہ کھینچا ہے یَاْکُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (محمد:12) یہ تو ان

کی کفر کی حالت تھی پھر جب آنحضرت ﷺ کی پاک تاثیرات نے ان میں تبدیلی پیدا کی تو ان کی یہ حالت ہوگئی یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (الفرقان: 65) یعنی وہ اپنے رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے راتیں کاٹ دیتے ہیں۔ جو تبدیلی آنحضرت ﷺ نے عرب کے وحشیوں میں کی اور جس گڑھے سے نکال کر جس بلندی اور مقام تک انہیں پہنچایا۔ اس ساری حالت کے نقشہ کو دیکھنے سے بے اختیار ہو کر انسان رو پڑتا ہے کہ کیا عظیم الشان انقلاب ہے جو آپؐ نے کیا۔ دُنیا کی کسی تاریخ اور کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ نری کہانی نہیں یہ واقعات ہیں جن کی سچائی کا ایک زمانہ کو اعتراف کرنا پڑا ہے۔

(ملفوظات جلد5ص117)

۞ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان: 68) کی تفسیر میں فرمایا۔

اپنے خرچوں میں نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ تنگ دلی کی عادت رکھتے ہیں ۔۔۔اور میانہ روش چلتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی۔ روحانی خزائن جلد10ص357)

۞ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (الفرقان: 73) کی تفسیر میں فرمایا۔

جھوٹوں کی مجلسوں میں نہیں بیٹھتے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی۔ روحانی خزائن جلد10ص 361)

اگر کوئی لغوبات کسی سے سُنیں جو جنگ کا مقدمہ اور لڑائی کی ایک تمہید ہو تو بزرگانہ طور پر طرح دے کر چلے جاتے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ بات پر لڑنا شروع نہیں کر دیتے۔ یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے اس وقت تک ہنگامہ پردازی کو اچھا

نہیں سمجھتے اور صلح کاری کے محل شناسی کا یہی اصول ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو خیال میں نہ لاویں اور معاف فرماویں اور لغو کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے سو واضح ہو کہ عربی زبان میں لغو اس حرکت کو کہتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی بکواس کرے یا بہ نیت ایذا ایسا فعل اس سے صادر ہو کہ دراصل اس سے کچھ ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا۔ سو صلح کاری کی یہ علامت ہے کہ ایسی بیہودہ ایذا سے چشم پوشی فرماویں اور بزرگانہ سیرت عمل میں لاویں لیکن اگر ایذا صرف لغو کی مدّ میں داخل نہ ہو بلکہ اس سے واقعی طور پر جان یا مال یا عزت کو ضرر پہنچے تو صلح کاری کے خلق کو اس سے کچھ تعلق نہیں بلکہ اگر ایسے گناہ کو بخشا جائے تو اس خلق کا نام عفو ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی۔روحانی خزائن جلد10ص349)

کبھی انسان کا غصہ کتاب اللہ کے برخلاف ہوتا ہے۔گالی سُن کر اُس کا نفس جوش مارتا ہے۔تقویٰ تو اُس کو سکھلاتا ہے کہ وہ غصہ کرنے سے باز رہے جیسے قرآن کہتا ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (الفرقان:73)

(ملفوظات جلد اول ص15)

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان کسی کا مقابلہ کرتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے جیسے مقدمات میں ہوتا ہے۔اس لئے آرام اسی میں ہے کہ تم ایسے لوگوں کا مقابلہ ہی نہ کرو۔سدّ باب کا طریق رکھو اور کسی سے جھگڑا مت کرو۔زبان بند رکھو۔ گالیاں دینے والے کے پاس سے چپکے سے گزر جاؤ گویا سُنا ہی نہیں اور ان لوگوں کی راہ اختیار کرو جن کے لئے قرآن شریف نے فرمایا ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا اگر یہ باتیں اختیار کرلو گے تو یقیناً یقیناً اللہ تعالیٰ کے سچے مخلص بن جاوگے۔

(ملفوظات جلد5ص131)

۞ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًاO (الفرقان:75) کی تفسیر میں آپؑ فرماتے ہیں۔

نکاح سے ایک اور غرض بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم میں یعنی سورۃ الفرقان میں اشارہ ہے اور وہ یہ ہے وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا یعنی مومن وہ ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے خدا! ہمیں اپنی بیویوں کے بارے میں اور فرزندوں کے بارے میں دل کی ٹھنڈک عطا کر اور ایسا کر کہ ہماری بیویاں اور ہمارے فرزند نیک بخت ہوں اور ہم ان کے پیش رو ہوں۔

(آریہ دھرم۔ روحانی خزائن جلد10ص23)

یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر ایک شخص جس کو کوئی خواب سچی آوے یا الہام کا دروازہ اُس پر کھلا ہو وہ اس نام سے موسوم ہو سکتا ہے بلکہ امام کی حقیقت کوئی اور امر جامع اور حالت کاملہ تامہ ہے جس کی وجہ سے آسمان پر اس کا نام امام ہے؟ اور یہ تو ظاہر ہے کہ صرف تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے کوئی شخص امام نہیں کہلا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا (الفرقان:75) پس اگر ہر ایک متقی امام ہے تو پھر تمام مومن متقی امام ہی ہوئے اور یہ امر منشاء آیت کے برخلاف ہے۔

(ضرورت الامام۔ روحانی خزائن جلد13ص472-473)

انسان کو سوچنا چاہئے کہ اسے اولاد کی خواہش کیوں ہوتی ہے؟ کیونکہ اس کو محض طبعی خواہش ہی تک محدود نہ کر دینا چاہئے کہ جیسے پیاس لگتی ہے یا بھوک لگتی ہے لیکن جب ایک خاص اندازہ سے گزر جاوے تو ضرور اس کی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا جیسا کہ فرمایا۔ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الزاریات:57) اب اگر انسان خود مومن

اور عبد نہیں بنتا ہے اور اپنی زندگی کے اصل منشاء کو پورا نہیں کرتا ہے اور پورا حق عبادت ادا نہیں کرتا بلکہ فسق و فجور میں زندگی بسر کرتا ہے اور گناہ پر گناہ کرتا ہے تو ایسے آدمی کی اولاد کے لئے خواہش کیا نتیجہ رکھے گی؟ صرف یہی کہ گناہ کرنے کے لئے وہ اپنا ایک اور خلیفہ چھوڑنا چاہتا ہے۔ خود کونسی کمی کی ہے جو اولاد کی خواہش کرتا ہے۔ پس جب تک اولاد کی خواہش محض اس غرض کے لئے نہ ہو کہ وہ دیندار اور متقی ہو اور خدا تعالیٰ کی فرمانبردار ہو کر اُس کے دین کی خادم بنے بالکل فضول بلکہ ایک قسم کی معصیت اور گناہ ہے اور باقیات صالحات کی بجائے اس کا نام باقیات سیئات رکھنا جائز ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں صالح اور خداترس اور خادم دین اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو اس کا یہ کہنا بھی نرا ایک دعوی ہی دعوی ہوگا جب تک کہ وہ اپنی حالت میں ایک اصلاح نہ کرے۔ اگر خود فسق و فجور کی زندگی بسر کرتا ہے اور مُنہ سے کہتا ہے کہ میں صالح اور متقی اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو وہ اپنے اس دعوی میں کذاب ہے۔ صالح اور متقی اولاد کی خواہش سے پہلے ضروری ہے کہ وہ خود اپنی اصلاح کرے اور اپنی زندگی کو متقیانہ زندگی بنادے تب اس کی ایسی خواہش ایک نتیجہ خیز خواہش ہوگی اور ایسی اولاد حقیقت میں اس قابل ہوگی کہ اس کو باقیات صالحات کا مصداق کہیں لیکن اگر یہ خواہش صرف اس لئے ہو کہ ہمارا نام باقی رہے اور وہ ہمارے املاک و اسباب کی وارث ہو یا وہ بڑی ہی نامور اور مشہور ہو اس قسم کی خواہش میرے نزدیک شرک ہے۔

یاد رکھو کسی نیکی کو کبھی اس لئے نہیں کرنا چاہئے کہ اس نیکی کے کرنے پر ثواب یا اجر ملے گا کیونکہ اگر محض اس خیال سے نیکی کی جاوے تو وہ ابتغاء لمرضات الله نہیں ہو سکتی بلکہ اس ثواب کی خاطر ہوگی اور اس سے اندیشہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت اسے چھوڑ بیٹھے مثلاً اگر کوئی شخص ہر روز ہم سے ملنے کو آوے اور ہم اس کو ایک روپیہ دے دیا کریں تو وہ بجائے خود یہی سمجھے گا کہ میرا جانا صرف روپے کے لئے ہے۔ جس دن سے روپیہ نہ ملے اسی دن سے آنا چھوڑ دے گا۔ غرض یہ ایک قسم کا باریک شرک

ہے اس سے بچنا چاہئے۔ نیکی کو محض اس لئے کرنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ خوش ہو اور اس کی رضا حاصل ہو اور اس کے حکم کی تعمیل ہو۔ قطع نظر اس کے کہ اُس پر ثواب ہو یا نہ ہو۔ ایمان تب ہی کامل ہوتا ہے جبکہ یہ وسوسہ اور وہم درمیان سے اُٹھ جاوے اگرچہ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اِنَّ اللّٰہَ لَایُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (التوبہ: 120) مگر نیکی کرنے والے کو اجر مدنظر نہیں رکھنا چاہئے۔ دیکھو اگر کوئی مہمان یہاں محض اس لئے آتا ہے کہ وہاں آرام ملے گا۔ ٹھنڈے شربت ملیں گے یا تکلف کے کھانے ملیں گے تو وہ گویا ان اشیاء کے لئے آتا ہے حالانکہ خود میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حتی المقدور اُس کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ کرے اور اس کو آرام پہنچاوے اور وہ پہنچاتا ہے لیکن مہمان کا خود ایسا خیال کرنا اس کے لئے نقصان کا موجب ہے۔

تو غرض مطلب یہ ہے کہ اولاد کی خواہش صِرف نیکی کے اصول پر ہونی چاہئے۔ اس لحاظ سے اور خیال سے نہ ہو کہ وہ ایک گناہ کا خلیفہ باقی رہے۔ خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ مجھے کبھی اولاد کی خواہش نہیں ہوئی تھی حالانکہ خدا تعالیٰ نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر کے درمیان ہی اولاد دے دی تھی۔ یہ سلطان احمد اور فضل احمد قریباً اسی عمر میں پیدا ہو گئے تھے اور نہ کبھی مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ بڑے بڑے دنیادار بنیں اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچ کر مامور ہوں۔ غرض جو اولاد معصیت اور فسق کی زندگی بسر کرنے والی ہو اس کی نسبت تو سعدیؒ کا یہ فتویٰ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ

پیش از پدر مُردہ بہ ناخلف

پھر ایک اور بات ہے کہ اولاد کی خواہش تو لوگ بڑی کرتے ہیں اور اولاد ہوتی بھی ہے مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ اولاد کی تربیت اور ان کو عمدہ اور نیک چلن بنانے اور خدا تعالیٰ کے فرمانبردار بنانے کی سعی اور فکر کریں۔ نہ کبھی اُن کے لئے دُعا کرتے

ہیں اور نہ مراتب تربیت کو مدنظر رکھتے ہیں۔

میری اپنی تو یہ حالت ہے کہ میری کوئی نماز ایسی نہیں ہے جس میں میں اپنے دوستوں اور اولاد اور بیوی کے لئے دعا نہیں کرتا۔ بہت سے والدین ایسے ہیں جو اپنی اولاد کو بُری عادتیں سکھا دیتے ہیں۔ ابتداء میں جب وہ بدی کرنا سیکھنے لگتے ہیں تو ان کو تنبیہہ نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن بدن دلیر اور بے باک ہوتے جاتے ہیں۔ ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکا اپنے جرائم کی وجہ سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اس آخری وقت میں اس نے خواہش کی کہ میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ جب اُس کی ماں آئی تو اُس نے ماں کے پاس جا کر اُسے کہا کہ میں تیری زبان کو چوسنا چاہتا ہوں۔ جب اُس نے زبان نکالی تو اُسے کاٹ کھایا۔ دریافت کرنے پر اُس نے کہا کہ اسی ماں نے مجھے پھانسی پر چڑھایا ہے، کیونکہ یہ مجھے پہلے ہی روکتی، تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لوگ اولاد کی خواہش تو کرتے ہیں مگر نہ اس لئے کہ وہ خادم دین ہو بلکہ اس لئے کہ دنیا میں اُن کا کوئی وارث ہو اور جب اولاد ہوتی ہے تو اس کی تربیت کا فکر نہیں کیا جاتا۔ نہ اس کے عقائد کی اصلاح کی جاتی ہے اور نہ اخلاقی حالت کو درست کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ اس کا ایمان درست نہیں ہو سکتا جو اقرب تعلقات کو نہیں سمجھتا۔ جب وہ اس سے قاصر ہے تو اور نیکیوں کی اُمید اس سے کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی خواہش کو اس طرح پر قرآن میں بیان فرمایا ہے۔ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (الفرقان:75) یعنی خدا تعالیٰ ہم کو ہماری بیویوں اور بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرماوے اور یہ تب ہی میسر آ سکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کی زندگی بسر نہ کرتے ہوں بلکہ عبادالرحمٰن کی زندگی بسر کرنے والے ہوں اور خدا کو ہر شے پر مقدم کرنے والے ہوں

اور آگے کھول کر کہہ دیا وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا . اولاد اگر نیک اور متقی ہو تو اُن کا امام ہی ہوگا۔اس سے گویا متقی ہونے کی بھی دعا ہے۔

(ملفوظات جلد اول ص 560تا563)

میں دیکھتا ہوں کہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ محض دنیا کے لئے کرتے ہیں۔ محبت دُنیا اُن سے کراتی ہے خدا کے واسطے نہیں کرتے۔اگر اولاد کی خواہش کرے تو اس نیت سے کرے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَاماً (الفرقان:75) پر نظر کر کے کرے کہ کوئی ایسا بچہ پیدا ہو جائے جو اعلاء کلمہ اسلام کا ذریعہ ہو جب ایسی پاک خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ زکریّا کی طرح اولاد دے دے مگر میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی نظر اس سے آگے نہیں جاتی کہ ہمارا باغ ہے یا اور ملک ہے وہ اس کا وارث ہو اور کوئی شریک اس کو نہ لے جائے مگر وہ اتنا نہیں سوچتے کہ کم بخت جب تُو مر گیا تو تیرے لئے دوست دشمن اپنے بیگانے سب برابر ہیں۔میں نے بہت سے لوگ ایسے دیکھے اور کہتے سُنے ہیں کہ دعا کرو کہ اولاد ہو جائے جو اس جائیداد کی وارث ہو۔ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد کوئی شریک لے جاوے۔اولاد ہو جائے خواہ وہ بدمعاش ہی ہو۔یہ معرفت اسلام کی رہ گئی ہے۔

(ملفوظات جلد3ص578۔579)

ان (اولاد) کی پرورش محض رحم کے لحاظ سے کرے نہ کہ جانشین بنانے کے واسطے بلکہ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (الفرقان:75) کا لحاظ ہو کہ یہ اولاد دین کی خادم ہو لیکن کتنے ہیں جو اولاد کے واسطے یہ دعا کرتے ہیں کہ اولاد دین کی پہلوان ہو۔بہت ہی تھوڑے ہوں گے جو ایسا کرتے ہوں۔اکثر تو ایسے ہیں کہ وہ بالکل بے خبر ہیں کہ وہ کیوں اولاد کے لئے یہ کوششیں کرتے ہیں اور اکثر ہیں جو محض جانشین بنانے کے واسطے اور کوئی غرض ہوتی ہی نہیں صرف یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شریک یا

غیر ان کی جائیداد کا مالک نہ بن جاوے۔ مگر یاد کھو کہ اس طرح پر دین بالکل برباد ہو جاتا ہے۔ غرض اولاد کے واسطے صرف یہ خواہش ہو کہ وہ دین کی خادم ہو۔

(ملفوظات جلد3ص599تا600)

۞ أُولَـٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝(الفرقان:76-77) کی تفسیر میں فرمایا۔

باوا صاحب کا ایک شعر یہ ہے۔

اوچوتھان سوہاوناں اوپر محل مرار سچ کرنی دے پائے درگھر محل پیار

یعنی وہ بہشت اُونچا مکان ہے اس میں عمارتیں خوبصورت ہیں اور راست بازی سے وہ مکان ملتا ہے اور پیار اس محل کا دروازہ ہے جس سے لوگ گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں اور یہ شعر اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے جو قرآن شریف میں ہے۔ أُولَـٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ. حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا(الفرقان:76-77)

یعنی جو لوگ راست باز ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں انہیں بہشت کے بالاخانوں میں جگہ دی جائے گی جو نہایت خوبصورت مکان اور آرام کی جگہ ہے۔ دیکھو اس جگہ صریح باوا صاحب نے اس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔ کیا اب بھی کچھ شک باقی ہے کہ باوا صاحب قرآن شریف کے ہی تابعدار تھے۔ اس قسم کا بیان بہشت کے بارہ میں وید میں کہاں ہے بلکہ انجیل میں بھی نہیں تبھی تو بعض نابینا عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں جسمانی بہشت کا ذکر ہے مگر نہیں جانتے کہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ جسم اور روح جو دونوں خدا تعالیٰ کی راہ میں دُنیا میں کام کرتے رہے ان دونوں کو جزا ملے گی۔ یہی تو پورا بدلہ ہے کہ روح کو روح کی خواہش کے مطابق اور جسم کو جسم کی خواہش کے مطابق بدلہ ملے لیکن دنیوی کدورتوں اور کثافتوں سے وہ جگہ بالکل پاک

ہوگی اور لوگ اپنی پاکیزگی میں فرشتوں کے مشابہ ہوں گے اور بایں ہمہ جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے لذت اور سرور میں ہوں گے۔ اور روح کی چمک جسم پر پڑے گی اور جسم کی لذت میں روح شریک ہوگا اور یہ بات دنیا میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں جسمانی لذت روحانی لذت سے روکتی ہے اور روحانی لذت جسمانی لذت سے مانع آتی ہے مگر بہشت میں ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس روز دونوں لذتوں کا ایک دوسری پر عکس پڑے گا اور اس حالت کا نام سعادت عظمیٰ ہے۔ غرض باوا صاحب نے یہ نکتہ معرفت قرآن شریف سے لیا ہے کیونکہ دوسری تمام قومیں اس سے غافل ہیں اور اُن کے عقیدے اس کے برخلاف ہیں۔

(ست بچن۔ روحانی خزائن جلد10 ص222۔223)

۞ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ج فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝ (الفرقان:78) کی تفسیر میں آپؑ نے فرمایا۔

کافروں کو کہہ کہ اگر تم خدا کی بندگی نہ کرو تو وہ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے سو تم نے بجائے طاعت اور بندگی کے جھٹلانا اختیار کیا۔ سو عنقریب اس کی سزا تم پر وارد ہونے والی ہے۔

(براہین احمدیہ۔ روحانی خزائن جلد اول ص 626 حاشیہ)

چونکہ خدا کے قانون میں یہی انتظام مقرر ہے کہ رحمت خاصہ انہیں کے شامل حال ہوتی ہے کہ جو رحمت کے طریق کو یعنی دُعا اور توحید کو اختیار کرتے ہیں۔ اس باعث سے جو لوگ اس طریق کو چھوڑ دیتے ہیں وہ طرح طرح کی آفات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ۔ یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم دعا نہ کرو اور اس کے فیضان کے خواہاں نہ ہو۔ خدا کو

تو کسی کی زندگی اور وجود کی حاجت نہیں۔ وہ تو بے نیاز مطلق ہے۔

(براھین احمدیہ۔روحانی خزائن جلد اول ص563۔564حاشیہ)

ان کو کہہ دے کہ اگر تم نیک چلن انسان نہ بن جاؤ اور اس کی یاد میں مشغول نہ رہو تو میرا خدا تمہاری زندگی کی پرواہ کیا رکھتا ہے اور سچ ہے کہ جب انسان غافلانہ زندگی بسر کرے اور اُس کے دل پر خدا کی عظمت کا کوئی رعب نہ ہو اور بے قیدی اور دلیری کے ساتھ اس کے تمام اعمال ہوں تو ایسے انسان سے ایک بکری بہتر ہے جس کا دودھ پیا جاتا ہے اور گوشت کھایا جاتا ہے اور کھال بھی بہت سے کاموں میں آجاتی ہے۔

(تبلیغ رسالت جلد 10صفحہ 101از تفسیر حضرت مسیح موعودؑ جلد3ص545)

اُن لوگوں کی نسبت (جو خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی یا پرواہ نہیں کرتے اور اپنی زندگی فسق و فجور میں گزارتے ہیں) فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:78) یعنی میرا رب تمہاری کیا پرواہ کرتا ہے اگر تم اس کی عبادت نہ کرو۔

(ملفوظات جلد اول ص116)

انسان کی پیدائش کی اصل غرض تو عبادت الٰہی ہے لیکن اگر وہ اپنی فطرت کو خارجی اسباب اور بیرونی تعلقات سے تبدیل کر کے بیکار کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ اُس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:78) میں نے ایک بار پہلے بھی بیان کیا تھا کہ میں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ میں ایک جنگل میں کھڑا ہوں۔ شرقاً غرباً اس میں ایک بڑی نالی چلی گئی ہے اس نالی پر بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اور ہر ایک قصاب کے جو ہر ایک بھیڑ پر مسلط ہے ہاتھ میں چھُری ہے جو انہوں نے اُن کی گردن پر رکھی ہوئی ہے اور آسمان کی طرف منہ کیا ہوا ہے۔ میں ان کے پاس ٹہل رہا ہوں میں نے یہ نظارہ دیکھ کر سمجھا کہ یہ

آسمانی حکم کے منتظر ہیں تو میں نے یہی آیت پڑھی قُلْ مَایَعْبَئُوابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَادُعَآؤُکُمْ یہ سنتے ہی ان قصابوں نے فی الفور چھریاں چلادیں اور یہ کہا کہ تم ہو کیا؟ آخر گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔

غرض خدا تعالیٰ متقی کی زندگی کی پرواہ کرتا ہے اور اس کی بقاء کو عزیز رکھتا ہے اور جو اُس کی مرضی کے برخلاف چلے وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا اور اس کو جہنم میں ڈالتا ہے اس لئے ہر ایک کو لازم ہے کہ اپنے نفس کو شیطان کی غلامی سے باہر کرے۔ جیسے کلوروفارم نیند لاتا ہے۔ اسی طرح پر شیطان انسان کو تباہ کرتا ہے اور اُسے غفلت کی نیند سُلاتا ہے اور اسی میں اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

(ملفوظات جلد اول ص118۔119)

جانوروں کی زندگی دیکھ لو کہ محنتیں ان سے لی جاتی ہیں اور ان کو ذبح کیا جاتا ہے۔ پس جو انسان خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کرتا ہے اس کی زندگی کی ضمانت نہیں رہتی چنانچہ فرمایا قُلْ مَایَعْبَئُوابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَادُعَآؤُکُمْ (الفرقان:78) یعنی اگر تم اللہ کو نہ پکارو تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا رکھتا ہے۔

یادرکھو جو دُنیا کے لئے خدا کی عبادت کرتے ہیں یا اس سے تعلق نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ اُن کی کچھ پرواہ نہیں رکھتا۔

(ملفوظات جلد اول ص379)

کامل عابد وہی ہوسکتا ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے، لیکن اس آیت میں اور بھی صراحت ہے اور وہ آیت یہ ہے قُلْ مَایَعْبَئُوابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَادُعَآؤُکُمْ یعنی ان لوگوں کو کہہ دو کہ اگر تم لوگ رب کو نہ پکارو تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ عابد کی پرواہ کرتا ہے۔

(ملفوظات جلد2ص221)

انسانوں میں سے بھی جو سب سے زیادہ قابل قدر ہے اسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھتا ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا سچا تعلق رکھتے اور اپنے اندرونہ کو صاف رکھتے ہیں اور نوع انسان کے ساتھ خیر اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں اور خدا کے سچے فرمانبردار ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف سے بھی ایسا ہی معلوم ہے قُلْ مَایَعْبَئُوابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَادُعَآؤُکُمْ (الفرقان:78) اس کے مفہوم مخالف سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ دوسروں کی پرواہ کرتا ہے اور وہی لوگ ہوتے ہیں جو سعادت مند ہوتے ہیں۔ وہ تمام کسریں اُن کے اندر سے نکل جاتی ہیں جو خدا سے دُور ڈال دیتی ہیں اور جب انسان اپنی اصلاح کر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ سے صُلح کر لیتا ہے تو خدا اس کے عذاب کو بھی ٹلا دیتا ہے۔ خدا کو کوئی ضد تو نہیں چنانچہ اس کے متعلق بھی صاف طور پر فرمایا ہے۔ مَایَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ (النساء:148) یعنی خدا نے تم کو عذاب دے کر کیا کرنا ہے اگر تم دیندار ہو جاؤ۔

(ملفوظات جلد2ص305)

مومن شخص کا کام ہے کہ پہلے اپنی زندگی کا مقصد اصلی معلوم کرے اور پھر اس کے مطابق کام کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَایَعْبَئُوابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَادُعَآؤُکُمْ (الفرقان:78) خدا کو تمہاری پرواہ ہی کیا ہے اگر تم اس کی عبادت نہ کرو اور اس سے دعائیں نہ مانگو۔ یہ آیت بھی اصل میں پہلی آیت مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات:57) ہی کی شرح ہے۔

(ملفوظات جلد3ص185)

جب انسان کا ایک اصول ہو جاوے کہ زیستین از بہر خوردن است۔ اس وقت اس کی نظر خدا پر نہیں رہتی بلکہ وہ دُنیا کے کاروبار اور تجارت ہی میں منہمک ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور رجوع کا خیال بھی نہیں رہتا۔ اس وقت اس کی زندگی

قابل قدر وجود نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا یَعْبَئُوا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ (الفرقان:78) یعنی میرا رب تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی بندگی نہ کرو۔

(ملفوظات جلد4ص125)

بڑے بڑے صریح ظلم مظلوموں پر ڈھائے جاتے ہیں اور ہمارے سامنے ظالموں سے کوئی چنداں بازپُرس نہیں ہوتی۔ اس کا باعث بھی خدا تعالیٰ نے اِسی آیت میں فرمایا ہے مَا یَعْبَئُوا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ (الفرقان:78) یعنی خدا تعالیٰ کو تمہاری پرواہ کیا ہے اگر تم دعاؤں اور عبادت الٰہی میں تغافل اختیار کرو۔

(ملفوظات جلد4ص462)

مُورکھ وہ انسان ہے جو اس ضروری سفر کا کچھ بھی فکر نہیں رکھتا۔ خدا تعالیٰ اس شخص کی عمر کو بڑھا دیتا ہے جو سچ مچ اپنی زندگی کا طریق بدل کر خدا تعالیٰ کا ہی ہو جاتا ہے ورنہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے قُلْ مَا یَعْبَئُوا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ یعنی ان کو کہہ دو کہ خدا تعالیٰ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی بندگی اور عبادت نہ کرو۔ سو جاگنا چاہئے اور ہوشیار ہونا چاہئے اور غلطی نہیں کھانا چاہئے کہ یہ گھر سخت بے بنیاد ہے۔

(مکتوب بنام حضرت نواب محمد علی خان صاحب از مکتوبات احمد جلد2ص209)

اس نسخہ کو ہمیشہ یاد رکھو اور اس سے فائدہ اُٹھاؤ کہ جب کوئی دُکھ یا مصیبت پیش آوے تو فوراً نماز میں کھڑے ہو جاؤ اور جو مصائب اور مشکلات ہوں ان کو کھول کھول کر اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرو کیونکہ یقیناً خدا ہے اور وہی ہے جو ہر قسم کی مشکلات اور مصائب سے انسان کو نکالتا ہے وہ پکارنے والے کی پُکار کو سنتا ہے۔ اس

کے سوا کوئی نہیں جو مددگار ہو سکے۔ بہت ہی ناقص ہیں وہ لوگ کہ جب اُن کو مشکلات پیش آتی ہیں تو وہ وکیل، طبیب یا اور لوگوں کی طرف تو رجوع کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کا خانہ بالکل خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو سب سے اوّل خدا تعالیٰ کی طرف دوڑے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہو اور رجوع نہ کرو تو اس سے اس کی ذات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ تمہاری کچھ بھی پرواہ نہیں رکھتا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:78)

یعنی ان کو کہہ دو کہ میرا رب تمہاری کیا پرواہ رکھتا ہے اگر تم سچے دل سے اس کی عبادت نہ کرو۔ جیسا کہ وہ رحیم و کریم ہے ویسا ہی وہ غنی بے نیاز بھی ہے۔

(ملفوظات جلد5ص96)

دعا میں لگے رہو کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان: 78) ایک انسان جو دعا نہیں کرتا اس میں اور چارپائے میں کچھ فرق نہیں۔ ایسے لوگوں کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ یعنی چارپائیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جہنم اُن کا ٹھکانا ہے پس تمہاری بیعت کا اقرار اگر زبان تک محدود رہا تو یہ بیعت کچھ فائدہ نہ پہنچائے گی۔ چاہئے کہ تمہارے اعمال تمہارے احمدی ہونے پر گواہی دیں۔ میں ہرگز یہ بات نہیں مان سکتا کہ خدا تعالیٰ کا عذاب اس شخص پر وارد ہو جس کا معاملہ خدا تعالیٰ سے صاف ہو۔ خدا تعالیٰ اُسے ذلیل نہیں کرتا جو اس کی راہ میں ذلّت اور عاجزی اختیار کرے۔ یہ سچی اور صحیح بات ہے۔ مرنا تو بیشک سب نے ہے مگر یہ موتیں جو آجکل ہو رہی ہیں یہ تو ذلّت کی موتیں ہیں۔ خدا تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے کہ ایک ابھی دفن

نہیں ہوا تھا کہ دوسرا جنازہ تیار ہے۔ پس راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دُعائیں مانگو۔ کوٹھڑی کے دروازے بند کر کے تنہائی میں دُعا کرو کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اپنا معاملہ صاف رکھو کہ خدا کا فضل تمہارے شامل حال ہو جو کام کرو نفسانی غرض سے الگ ہو کر کرو تا خدا تعالیٰ کے حضور اجر پاؤ۔

(ملفوظات جلد5ص272)

عبادالرحمٰن کی وضاحت میں سورۃ الحجر کی آیت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝ (الحجر:43) کے تحت حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں۔

اے شیطان! میرے بندے جو ہیں جنہوں نے میری مرضی کی راہوں پر قدم مارا ہے اُن پر تیرا تسلط نہیں ہو سکتا۔ سو جب تک انسان تمام کجیوں اور نالائق خیالات اور بیہودہ طریقوں کو چھوڑ کر صرف آستانہ الٰہی پر گرا ہوا نہ ہو جائے تب تک وہ شیطان کی کسی عادت سے مناسبت رکھتا ہے اور شیطان مناسبت کی وجہ سے اُس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُس پر دوڑتا ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام۔روحانی خزائن جلد5ص354)

اور یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں جبر کے طور پر بعضوں کو جہنمی ٹھہرادیا ہے اور خواہ نخواہ شیطان کا تسلط ان پر لازمی طور پر رکھا گیا ہے یہ ایک شرمناک غلطی ہے اللہ جلشانہُ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ کہ اے شیطان! میرے بندے پر تیرا کچھ بھی تسلط نہیں۔ دیکھئے کس طرح پر اللہ تعالیٰ انسان کی آزادی ظاہر کرتا ہے۔ منصف کے لئے اگر کچھ دل میں انصاف رکھتا ہو تو یہی آیت کافی ہے۔

(جنگ مقدس۔روحانی خزائن جلد6ص232)

پھر ڈپٹی صاحب فرماتے ہیں کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ خیر اور شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے افسوس کہ ڈپٹی صاحب کیسے صحیح معنے سے پھر گئے۔ واضح ہو کہ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ خدا تعالیٰ شر کو بحیثیت شر پیدا کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ یعنی اے شیطان شر پہنچانے والے میرے بندوں پر تیرا تسلط نہیں بلکہ اس فقرہ کے یہ معنی ہیں کہ ہر ایک چیز کے اسباب خواہ وہ چیز خیر میں داخل ہے یا شر میں خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہیں مثلاً اگر شراب کے اجزاء جن سے شراب بنتی ہے موجود نہ ہوں تو پھر شرابی کہاں سے شراب بنا سکیں اور پی سکیں۔ لیکن اگر اعتراض کرنا ہے تو پہلے اس آیت پر اعتراض کیجئے کہ ''سلامتی کو بناتا اور بلا کو پیدا کرتا ہے''یسعیاہ ۷/۴۵۔

(جنگ مقدس۔روحانی خزائن جلد6ص241)

وہ لوگ جو اپنے صدق اور وفا اور عشق الٰہی میں کمال کے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں اُن پر شیطان تسلط نہیں پا سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ۔

(حقیقۃ الوحی ۔روحانی خزائن جلد22ص3-4)

جس میں شیطان کا حصہ نہیں رہا اور وہ سفلی زندگی سے ایسا دُور ہوا کہ گویا مر گیا اور راست باز اور وفادار بندہ بن گیا اور خدا کی طرف آ گیا اُس پر شیطان حملہ نہیں کر سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ جو شیطان کے ہیں اور شیطان کی عادتیں اپنے اندر رکھتے ہیں انہیں کی طرف شیطان دوڑتا ہے کیونکہ وہ شیطان کے شکار ہیں۔

(حقیقۃ الوحی ۔روحانی خزائن جلد22ص142)

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی تین حالتیں ہیں۔ایک

اَمّارہ ، دُوسری لَوّامہ ، تیسری مُطمئنّہ۔ نفس امّارہ کی حالت میں انسان شیطان کے پنجہ میں گویا گرفتار ہوتا ہے اور اس کی طرف بہت جھکتا ہے لیکن نفس لوامہ کی حالت میں وہ اپنی خطا کاریوں پر نادم ہوتا اور شرمسار ہو کر خدا کی طرف جھکتا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی ایک جنگ رہتی ہے۔ کبھی شیطان کی طرف جھکتا ہے اور کبھی رحمان کی طرف۔ مگر نفس مطمئنہ کی حالت میں وہ عباد الرحمٰن کے زُمرہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ گویا ارتفاعی نقطہ ہے جس کے بالمقابل نیچے کی طرف امارہ ہے۔ اس میزان کے بیچ میں لوامہ ہے جو ترازو کی زبان کی طرح ہے۔ انخفاضی نقطہ کی طرف اگر زیادہ جھکتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر اور ارذل ہو جاتا ہے اور ارتفاعی نقطہ کی طرف جس قدر رجوع کرتا ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے اور سفلی اور ارضی حالتوں سے نکل کر علوی اور سماوی فیضان سے حصہ لیتا ہے۔

(ملفوظات جلد اول ص69.68)

صالحین اور عباد الرحمٰن کی کبھی اللہ تعالیٰ سے جنگ نہیں ہوتی کیونکہ رضا بالقضا کے مقام پر ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ حقیقی ایمان اس وقت تک پیدا ہو ہی نہیں سکتا جب تک انسان اس درجہ کو حاصل نہ کرے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی اس کی مرضی ہو جائے دل میں کوئی کدورت اور تنگی محسوس نہ ہو بلکہ شرح صدر کے ساتھ اس کی ہر تقدیر اور قضا کے ماننے کو تیار ہو۔ اس آیت میں رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً کا لفظ اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ رضا کا اعلیٰ مقام ہے جہاں کوئی ابتلا باقی نہیں رہتا۔ دوسرے جس قدر مقامات ہیں وہاں ابتلاء کا اندیشہ رہتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ سے بالکل راضی ہو جاوے اور کوئی شکوہ شکایت نہ رہے اس وقت محبت ذاتی پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ سے محبت ذاتی پیدا نہ ہو تو ایمان بڑے خطرہ کی حالت میں ہے لیکن جب ذاتی محبت ہو جاتی ہے تو انسان شیطان کے حملوں سے امن میں آجاتا ہے۔ اس ذاتی محبت کو دعا سے حاصل کرنا چاہئے جب تک یہ محبت پیدا نہ ہو

انسان نفس امارہ کے نیچے رہتا ہے۔

(ملفوظات جلد 3 ص 507)

یادرکھو کہ کامل بندے اللہ تعالیٰ کے وہی ہوتے ہیں جن کی نسبت فرمایا ہے۔ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور:38) جب دل خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق اور عشق پیدا کر لیتا ہے تو وہ اس سے الگ ہوتا ہی نہیں۔ اس کی ایک کیفیت اس طریق پر سمجھ میں آسکتی ہے کہ جیسے کسی کا بچہ بیمار ہو تو خواہ وہ کہیں جاوے، کسی کام میں مصروف ہو مگر اس کا دل اور دھیان اسی بچہ میں رہے گا۔ اسی طرح پر جو لوگ خدا تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق اور محبت پیدا کرتے ہیں وہ کسی حال میں بھی خدا تعالیٰ کو فراموش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی کہتے ہیں کہ عام لوگوں کے رونے میں اتنا ثواب نہیں جتنا عارف کے ہنسنے میں ہے۔ وہ بھی تسبیحات ہی ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عشق اور محبت میں رنگین ہوتا ہے۔ یہی مفہوم اور غرض اسلام کی ہے کہ وہ آستانہ الوہیت پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔

(ملفوظات جلد 4 ص 16.15)

اللہ تعالیٰ کے بندوں کی علامات میں سے یہ بھی ایک علامت ہے کہ وہ دنیا سے طبعی نفرت کرتے ہیں۔ پس جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جاوے اور دنیا اور آخرت کی راحت اُسے مل جاوے وہ یہ راہ اختیار کرے۔ اگر اس راہ کو تو چھوڑتا ہے اور اور راہیں اختیار کرتا ہے تو پھر ٹکریں مار کر دیکھ لے کہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

(ملفوظات جلد 4 ص 151)

# ارشادات

## حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل نوراللہ مرقدہٗ

۞ وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًاوَّاِذَخَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْاسَلٰمًاo(الفرقان:64) کی تفسیر میں آپ فرماتے ہیں۔

رحمٰن کے فرمانبردار بندے تو وہی ہیں جو زمین میں سکینت، وقار اور تواضع کی چال چلتے ہیں۔ نہ تکبر اور سُستی کی۔ اور جب جاہل اُن سے اُلجھیں تو اُن سے ایسا سلوک کرتے ہیں۔ جس میں نہ بدی وایذاء ہو اور نہ جہل ونادانی۔

جب جاہل مخاطب کریں تو سلامتی کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

(حقائق الفرقان جلد3ص251)

۞ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا o(الفرقان: 65) کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

مومن رات عبادت کے کام کرتا ہے۔ انگریزی پڑھنے والوں کی عادت چھوڑ دو۔ کہ دو بجے سوئے اور آٹھ بجے اُٹھے!

وہی جو اپنے رب کے آگے سجدوں اور قیام میں راتیں گزار دیتے ہیں۔

(حقائق الفرقان جلد3ص251)

۞ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَھَنَّمَ ق صلے اِنَّ عَذَابَھَا کَانَ غَرَامًاo ق صلے اِنَّھَا سَآءَ تْ مُسْتَقَرًّاوَّمُقَامًاo(الفرقان:66-67)

وہی جن کی دعا ہے کہ اے ہمارے رب ہٹا دے ہم سے دوزخ کا عذاب۔ اس کا عذاب تو دائمی ہلاکت ہے اور دوزخ تو بڑی تکلیف کی جگہ ہے۔ اور بُرا مقام ہے۔

(حقائق الفرقان جلد3ص252)

۞ وَالَّذِیْنَ اِذَآاَنْفَقُوْالَمْ یُسْرِفُوْاوَلَمْ یَقْتُرُوْاوَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًاo

(الفرقان:68)

وہی فرمانبردار بندے کہ جب اموال کوخرچ کرتے ہیں تو مالوں کو نہ بے جا ضائع کریں اور نہ موقع میں دینے سے کمی دکھلاویں بلکہ خرچ میں پسندیدہ راہ اختیار کریں۔

(حقائق الفرقان جلد3ص252)

۞ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ (الفرقان: 69) کی تفسیر میں فرمایا۔

جو اللہ تعالیٰ کی یاد کے ساتھ دوسرے معبود کو نہیں پکارتے۔ اور ایسی جانوں کے ناحق قتل سے بچتے ہیں جن کا قتل اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا اور کسی قسم کا زنا نہیں کرتے۔ اور جو کوئی بندوں میں سے ایسی کرتوت کرتا ہے۔ وہ بڑی سخت بدکاری میں گرفتار ہوا۔

(حقائق الفرقان جلد3ص252-253)

۞ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الفرقان:71) کی تفسیر میں فرمایا۔

مگر بچا تو وہی بچا جس نے بدی کو چھوڑ دیا اور تمام بھلائیوں کی اصل ایمان کو اختیار کرلیا۔ اور اچھے اعمال کئے آخر ایسے لوگوں کی برائیاں جاتی رہتی ہیں۔ اور ان کے بدلہ میں نیکیاں آجاتی ہیں۔ (دیکھو عربوں کے حالات اسلام سے پہلے او پیچھے) اور ہر تائب کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کرنے والا اور اس کی توبہ پر رحم کرنے والا ہے۔

(حقائق الفرقان جلد3ص253)

۞ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ (الفرقان:72) کی تفسیر میں فرمایا۔

جو کوئی بدی کو چھوڑ کر بھلے کاموں کی طرف متوجّہ ہوا وہی اللہ تعالیٰ کی طرف پسندیدہ طور سے جُھکا۔

(حقائق الفرقان جلد3ص253)

۞ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ لا وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا o وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا o (الفرقان:74) کی آیت کا درس دیتے ہوئے فرمایا۔

کبھی موجود نہیں ہوتے دھوکے کی بات میں۔نہ خود کرتے ہیں۔

وہی رحمان کے فرمانبردار بندے ہیں جو دھوکے کے پاس بھی نہیں جاتے اور جب کبھی کسی بیہودہ کام کے پاس سے بھی گزرتے ہیں تو اس طرح گزرتے ہیں کہ بھلائیوں کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے ہیں۔وہی جن کو کبھی الٰہی نشان دکھائے گئے تو اس نشان پر اندھے اور بہرے کی طرح ٹھوکر نہیں کھاتے۔

(حقائق الفرقان جلد3ص254)

۞ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا o (الفرقان: 75) کی تفسیر میں فرمایا۔

وہی جو دعا مانگتے ہیں۔کہ اے ہمارے رب ہمارے ساتھیوں (بیبیاں ہوں یا اور دوست) اور ہماری اولاد سے ہمیں آرام دے۔وہ ہماری آنکھوں کا نور ہوں جو دل کے سُرور کا نشان ہے۔اور دُعا مانگتے ہیں کہ ہم سچے فرمانبرداروں کے واسطے آئندہ کے لئے نمونے ہوں۔

(حقائق الفرقان جلد3ص254)

۞ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا o لا خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا o (الفرقان: 76-77) کی تفسیر میں فرمایا۔

وہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنے نیک اعمال کا بدلہ بڑے بلند مقامات کو پاکر وہاں نئی زندگی اور پوری سلامتی پاویں گے۔اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ تناسخ سے بچ کر وہاں ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔واہ وہ کیسے آرام کی جگہ اور رہنے کا مقام ہے۔

(حقائق الفرقان جلد3ص254-255)

۞قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝(الفرقان:78) اس آیت کی تفسیر میں فرمایا۔

اومخاطب کہہ دے۔میرے رب کوتمہارے ہلاک وتباہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔اگر تمہاری بُت پرستی نہ ہوتی مگر تم توراستی کوجھٹلا چکے۔پس نافرمانی کالازمی وبال تم پرضرورآنے والا ہے۔

اس رکوع کے درس کے آخر پر فرمایا۔

اس رکوع میں بتایا ہے کہ رحمان کے پیارے۔رحمان کے پرستار کون ہیں؟ دیکھو۔اس وقت تم بیٹھے ہو۔سب کی آوازوں میں اختلاف۔لباسوں میں اختلاف۔ مکانوں میں اختلاف۔ صحبتوں میں اختلاف۔ مذاقوں میں اختلاف۔ غرض اختلاف ایک فطری امر ہے۔اب خدا ہی کا فضل ہے۔کہ تم ایک وحدت کے نیچے آگئے ۔میں کبھی گھبرایا نہیں کرتا۔کہ فلاں شخص کو کیوں ہمارا خیال نہیں۔کیونکہ میرے مولیٰ کاارشاد ہے۔ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ(ھود:119-120) پس جس پر فضل ہوا۔وہ اختلاف سے نکل کر وحدت ارادی کے نیچے آجائے گا۔

اس رکوع میں ان باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے جن پر چل کر انسان اختلاف سے بچ سکتا ہے۔گالی کا جواب گالی۔یہ جواں مردی کی بات نہیں۔جوایک گالی پرصبر

نہیں کرتا۔اسے آخر پھر سو گالیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔اختلاف تو بے شک ہوتے ہیں۔کیونکہ ہماری فطرتوں میں اختلاف ہے۔مگر عبادالرحمان کا طریق یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنی روش سکینت و وقار کی رکھتے۔تکبّر، تجبّر وعصیان سے کام نہیں لیتے ہیں، بھاری بھرکم رہتے ہیں وہ ہر معاملہ میں صبر، عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہیں کیونکہ اختلافوں سے بچنے کی راہ ھَوْن ہے۔میرا ایک اُستاد تھا۔اس نے مجھے نصیحت کی کہ دنیا میں سُکھی رہنا چاہتے ہو تو اپنے تئیں ایسا نہ بناؤ کہ اپنے خلاف ہونے سے گھبرا جاؤ اور دوسروں سے لڑنے لگو۔

رحمان کے پرستار رحمان کے پیارے وہ ہیں جو سخت بات سُننے پر سلامتی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں دوئم وہ رات عبادت میں گزار دیتے ہیں۔کبھی کھڑے ہو کر جنابِ الٰہی کو راضی کرتے ہیں۔کبھی سجدہ میں پڑ کر۔سوئم راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں مانگتے ہیں۔اپنے مولیٰ کے آگے گڑگڑاتے ہیں۔چہارم وہ ان لوگوں کی طرح نہیں جو روپیہ ہاتھ لگنے پر جھٹ ناجائز جگہ پر خرچ کر دیتے ہیں۔بلکہ سوچ سمجھ کر ضرورت حقّہ پر درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔پنجم۔وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں جانتے اور اپنے تئیں ہلاکت میں نہیں ڈالتے۔اور نہ قتل کرتے ہیں۔نہ زنا کرتے ہیں۔کیونکہ جو ایسا کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے۔رحمان کے پیارے تو ایسے افعالِ شنیعہ سے بچتے رہتے ہیں اور سنوارنے والے کاموں میں اپنا وقت خرچ کرتے ہیں۔

(حقائق الفرقان جلد3ص 255-256)

# ارشادات
## حضرت مصلح موعود نوراللہ مرقدہٗ

سورۃ الفرقان کی آیت 64 تا 78 کا حضرت مصلح موعود نور اللہ مرقدہٗ کا تفسیری بامحاورہ ترجمہ یہ ہے۔

اور رحمٰن کے سچے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ اُن سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (لڑتے نہیں بلکہ) کہتے ہیں۔ کہ ہم تو تمہارے لئے سلامتی کی دُعا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو اپنے ربّ کے لئے راتیں سجدوں میں اور کھڑے ہو کر گزار دیتے ہیں۔ اور وہ (رحمٰن کے بندے) کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب ٹلا دے۔ اُس کا عذاب ایک بہت بڑی تباہی ہے۔ وہ (دوزخ) عارضی ٹھکانے کے طور پر بھی بُری ہے۔ اور مستقل ٹھکانے کے طور پر بھی (بُری ہے) اور وہ (اللہ کے بندے) ایسے ہوتے ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی سے کام نہیں لیتے اور نہ بخل کرتے ہیں اور اُن کا (خرچ) اِن دونوں حالتوں کے درمیان درمیان ہوتا ہے۔

ترجمہ: اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اور نہ کسی جان کو جسے اللہ نے حفاظت بخشی ہو قتل کرتے ہیں سوائے (شرعی) حق کے۔ اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسے کام کرے گا وہ اپنے گناہ کی جزا کو دیکھ لے گا۔ قیامت کے دن اُس کے لئے عذاب زیادہ کیا جائے گا اور وہ اُس میں ذِلّت کے ساتھ رہتا چلا جائے گا۔ وسوائے اس کے جس نے توبہ کر لی اور ایمان لایا اور ایمان کے مطابق عمل کئے۔ پس یہ لوگ ایسے ہوں گے کہ اللہ اُن کی بدیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو توبہ کرے اور اُس کے مطابق عمل کرے تو وہ شخص حقیقی طور پر اللہ کی طرف جھکتا ہے۔

اور وہ لوگ بھی اللہ کے بندے ہیں جو جھوٹی گواہیاں نہیں دیتے اور جب لغو باتوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ طور پر (بغیر ان میں شامل ہونے کے) گزر جاتے ہیں۔

اور وہ لوگ بھی کہ اُن کے ربّ کی آیات جب اُنہیں یاد دلائی جائیں تو ان سے بہروں اور اندھوں کا معاملہ نہیں کرتے۔

اور وہ لوگ بھی (رحمٰن کے بندے ہیں) جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اُن کے نیکی پر قائم رہنے کی وجہ سے (بہشت میں) بالا خانے دیئے جائیں گے اور ان کو اُس میں دُعائیں دی جائیں گی اور سلامتی کے پیغام پہنچائے جائیں گے۔ وہ اُن میں رہتے چلے جائیں گے۔ وہ جنت عارضی قرار گاہ کے طور پر بھی بڑی اچھی ہے اور مستقل قرار گاہ کے طور پر بھی (بڑی اچھی ہے)۔

اے رسول! تو ان سے کہہ دے کہ میرا ربّ تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے اگر تمہاری طرف سے دعا (اور استغفار) نہ ہو پس جبکہ تم نے (پیغام الٰہی کو) جھٹلا دیا تو (اب) اس کا عذاب (تم سے) چمٹا دیا جائے گا۔

(تفسیر صغیر سورۃ الفرقان: 64-78)

حضرت مصلح موعود نے تفسیر کبیر میں عبادالرحمٰن کی صفات اور خوبیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

اور رحمان کے (سچے) بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں جب جاہل لوگ ان سے مخاطت ہوتے ہیں تو وہ (لڑتے نہیں بلکہ) کہتے ہیں ہم تو تمہارے لئے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو اپنے رب کے لئے راتیں

سجدوں میں کھڑے ہو کر گزار دیتے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عِبَادُ الرَّحْمٰن کی تعریف بیان فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کیا کیا صفات پائی جاتی ہیں۔ یوں تو بہت لوگ ہیں جو بڑے شوق سے اپنے لڑکوں کا نام عبدالرحمٰن رکھتے ہیں اور بہت ہیں کہ جب اُن سے پوچھا جائے کہ کون ہو تو بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ صرف نام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ یا حقیقت اور اصلیت کے لحاظ سے بھی اُس کے بندے ہیں۔ آخر اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کے لحاظ سے تو تمام کافر اور منافق بھی خدا تعالیٰ کے بندے ہی ہیں۔ مگر پھر اُنہی بندوں کو خدا تعالیٰ نے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف:180) قرار دے کر چوپائیوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ انہی بندوں میں سے بعض کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ بندر اور سؤر بن گئے۔ (المائدہ:61) پھر انہی بندوں میں سے بعض کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ شَرُّ الْبَرِيَّة یعنی تمام مخلوق سے بدتر ہیں۔ (البینۃ : 7) اِس سے معلوم ہوا کہ صرف نام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانا کسی کے لئے باعث فخر نہیں ہوسکتا اگر صرف بندہ کہلانے سے کوئی انسان اللہ تعالیٰ مقرب بن سکتا تو خدا تعالیٰ نفسِ مطمئنہ رکھنے والے کو کیوں فرماتا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ یعنی آ اور میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ آ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ اِس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عباد میں داخل ہونا ایک بہت بلند مقام ہے جو نفس مطمئنہ رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ جہاں تک اُن کی پیدائش کا سوال ہے وہ پہلے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے بندے تھے اور خدا تعالیٰ ہی اُن کا رازق اور مالک تھا۔ پھر فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ جو فرمایا تو معلوم ہوا کہ خدا کا بندہ ہونا دو رنگ میں ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو تمام انسان خدا تعالیٰ ہی کے بندے ہیں۔ لیکن ایک لحاظ سے بعض اُس کے بندے ہوتے ہیں اور

بعض نہیں ہوتے۔ جولوگ اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں وہ تو اُس کے بندے کہلاتے ہیں اور جونہیں کرتے وہ خدا کے بندے نہیں کہلاتے بلکہ شیطان کے یا اپنے نفس کے بندے ہوتے ہیں۔ اِن آیات میں خدا تعالیٰ نے کچھ صفات بیان فرمائی ہیں اور بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاک نفس بندے کن صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر اس جگہ بجائے عِبَادُاللّٰہِ کہنے کے اللہ تعالیٰ نے عِبَادُالرَّحْمٰن کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں کیونکہ کفار کی طرف سے بار بار یہ سوال ہوتا تھا کہ رحمٰن کون ہے؟ سو اللہ تعالیٰ نے پہلے تو انہیں اپنی صفتِ رحمانیت کے ثبوت میں زمین و آسمان اور سورج اور چاند اور ستاروں وغیرہ کی طرف توجہ دلائی اور پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا وجود اُن کے سامنے پیش کیا جو صفتِ رحمانیت کے ایک کامل مظہر تھے۔ اب اللہ تعالیٰ انہیں بتاتا ہے کہ اگر یہ شواہد بھی تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں اور تمہیں خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا جلوہ نظر نہیں آتا تو تم خدا تعالیٰ کے اُن بندوں کو دیکھ لو جو اس کی رحمانیت کے چلتے پھرتے مجسمہ ہیں یعنی جس طرح سورج زمین کو اپنی شعاعوں سے منوّر کرتا اور ہر قسم کی تاریکیوں کو دُور کرتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں وہ آپؐ کے فیضِ صحبت کی برکت سے دنیا کو ہر قسم کی علمی اور عقلی روشنی بہم پہنچارہے ہیں اور انہیں اخلاق اور مذہب اور روحانیت کے میدان میں ہلاکت اور بربادی کے گڑھوں سے بچاتے ہوئے ترقی اور کامیابی کی راہیں دکھارہے ہیں اور جس طرح چاند سورج سے نُور اخذ کرتا اور زمین پر اپنی فرحت بخش روشنی پھیلا دیتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خدا تعالیٰ سے وحی والہام کا نور پاکر دنیا کو اپنی اُن برکات سے متمتع کررہے ہیں جن کا منبع انسانی عقل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا تازہ الہام ہے۔ اور جس طرح رات لوگوں کے لئے آرام اور سکون کا موجب ہوتی ہے اسی طرح یہ لوگ غریبوں کے ہمدرد مسکینوں کے ملجاء اور بیواؤں اور یتامیٰ کے ماوٰی ہیں اور دنیا سے ہر

قسم کے جھگڑوں اور فسادات کو مٹا کر ایک عالمگیر امن کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور جس طرح آسمان سے اس مادی دُنیا پر بارشیں نازل ہوتی اور پیاسی زمینیں سیراب ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ لوگ علم و عرفان کی ایک بارش ہیں جس سے دنیا میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو رہا ہے اور جس طرح بارش سے پھل اور پھول اور میوے اور طرح طرح کی غذائیں پیدا ہوتی ہیں۔اسی طرح اُن کے ذریعہ نئے نئے علوم دنیا میں ایجاد ہو رہے ہیں۔اور جس طرح زمین ہر ایک کے لئے فرش کا کام دیتی ہے اسی طرح ان کا دامن فیض بھی دنیا کی ہر قوم کے لئے وسیع ہے اور ہر مشرقی اور مغربی اور عربی اور عجمی کے لئے اُن کی محبت بھری گود کھلی ہے۔غرض یہ لوگ خدائے رحمٰن کی صفت رحمانیت کا ایک زندہ ثبوت ہیں۔یہ پانی کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف بہتے اور ہواؤں کی طرح اُس کی طرف اُڑتے اور مشکلات اور حوادث میں زمین کی طرح ثابت قدم رہتے اور آگ کی طرح ہر قسم کی شیطنت کو جلاتے اور پہاڑوں کی طرح دُنیا کی حفاظت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔پس اُن کو دیکھ کر بھی خدائے رحمٰن کی رحمانیت انسان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن عبادالرحمٰن کی علامات بیان کرتے ہوئے سب سے پہلی علامت یہ بیان فرماتا ہے کہ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وہ زمین پر بڑے سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔اِس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ اپنی دنیوی زندگی بڑے اعتدال کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔یعنی نہ تو بے جا غضب اور تیزی سے کام لے کر لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور نہ سستی اور جمود کا شکار ہو کر اپنے مفوضہ فرائض کی ادائیگی سے غافل ہو جاتے ہیں بلکہ جس طرح آسمان کا وجود زمینی قوتوں کے نشو و نما کے لئے ضروری ہوتا ہے،اسی طرح اُن کا وجود لوگوں کی ترقی اور اُن کی فلاح و بہبود کا موجب بنتا ہے اُن کی تباہی اور بربادی کا موجب نہیں بنتا۔وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا اور جب جاہل لوگ چاہتے ہیں کہ

انہیں اپنی حرکات سے جوش دلائیں اور کوئی جھگڑا اور فساد کھڑا کریں تو وہ طیش میں آ کر ناجائز اور اوچھے ہتھیاروں پر نہیں اُتر آتے بلکہ ایسی حالت میں بھی اُن کی سلامتی ہی چاہتے ہیں یعنی ایسے ذرائع استعمال میں لاتے ہیں جن سے اُن کی اصلاح ہو جائے۔ اور دنیا میں امن اور سلامتی کا دَور دَورہ ہو۔ مگر ان معنوں کے علاوہ اِس میں ایک اور مضمون بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس کی طرف عام طور پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو جب غلبہ واقتدار حاصل ہوگا تو اُس وقت اُن میں کیا کیا صفات پائی جائیں گی۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر خدا تعالیٰ نے اس جگہ یَمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ نہیں فرمایا بلکہ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ فرمایا ہے۔ اگر صرف چلنے کا ذکر ہوتا تو یَمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ کافی تھا مگر اس جگہ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ کہہ کر عَلٰی کو استعلاء کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور اِس طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ انہیں دنیا پر غلبہ حاصل ہوگا اور وہ پورے اقتدار کے ساتھ ایک غالب اور فاتح قوم کے افراد کی طرح چلیں گے گویا اُن کا چلنا عام لوگوں کی طرح نہیں ہوگا بلکہ اقتدار اور غلبہ اُن کے ساتھ ہوگا۔ اور وہ ایسے مقام پر کھڑے ہوں گے کہ لوگوں کو اپنی طاقت سے کچل سکیں۔ یہ ایسا ہی فقرہ ہے جیسے حضرت سلیمانؑ کے متعلق ایک نملہ نے کہا کہ یٰۤاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ ج لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُہٗ لا وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (النمل: 19) یعنی اے نملہ قوم سے تعلق رکھنے والو۔ اپنے اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُس کے طوفانی لشکر تمہارے حالات سے بے خبر ہونے کی وجہ سے تمہیں اپنے پیروں کے نیچے مَسل دیں۔ اگر خالی چلنے کا یہاں ذکر ہوتا تو یَمْشُوْنَ فِی الْاَرْضِ کہنا کافی تھا۔ لیکن عَلٰی کا صلہ لا کر ایک دوسرا مفہوم پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسی طاقت رکھیں گے کہ دنیا کو اپنے پاؤں کے نیچے روند سکیں۔ مگر جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام

کے متعلق ذکر آتا ہے کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ چلتے تھے تا ایسا نہ ہو کہ کوئی قوم اُن کے ذریعہ کچلی جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اِن آیات میں مسلمانوں کے متعلق بیان فرماتا ہے کہ جب وہ دنیا پر غالب آئیں گے تو اِس امر کی خاص احتیاط رکھیں گے کہ کوئی قوم اُن کے پاؤں کے نیچے روندی نہ جائے۔ گویا اُن کے اندر یہ طاقت تو ہوگی کہ وہ دنیا کو روند ڈالیں مگر چونکہ وہ نیک اور پارسا ہوں گے اس لئے یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا کا مصداق ہوں گے۔ یعنی وہ اِس طرز پر چلیں گے کہ ہر وقت یہ امر اُن کے مدنظر رہے گا کہ کسی فرد یا قوم کو اُن کے ہاتھوں کوئی ناجائز تکلیف نہ پہنچے۔

اِس کے بعد وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ حاکم انسان دوسرے کو دُکھ دے سکتا ہے۔ اور بالعموم حکّام کی عادت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ جب اُن کے سامنے کوئی گستاخانہ کلام کرے تو وہ کہتے ہیں ہم تمہاری اچھی طرح خبر لیں گے اور تمہیں بتائیں گے کہ تمہاری اس گستاخی کی کیا سزا ہے۔ مگر مسلمانوں کی یہ حالت ہوگی کہ حکومت اور طاقت اور غلبہ اور رعب کے باوجود جب اُن سے کوئی خطابِ جہالت کرے گا تو وہ مسکراتے ہوئے کہہ دیں گے کہ ہم کچھ بُرا نہیں مناتے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پاس ایک دفعہ ایک یہودی آیا اور اُس نے آپؐ سے کسی قرض کا نہایت سختی سے مطالبہ کیا۔ صحابہؓ یہ حالت دیکھ کر غصّہ سے بیتاب ہو گئے اور انہوں نے اپنی تلواریں سونت لیں مگر رسول کریم ﷺ نے اُن سے فرمایا۔ جانے دو جس کا حق ہوتا ہے وہ دوسرے پر سختی کر ہی بیٹھتا ہے۔ اِسی طرح ایک اَور شخص نے ایک دفعہ رسول کریم ﷺ سے کہہ دیا کہ آپ نے جو اموال کی تقسیم کی ہے اُس میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ حضرت عمرؓ تلوار لے کر کھڑے ہو گئے تا کہ اس کا سر اُڑا دیں مگر رسول کریم ﷺ نے فرمایا عمرؓ جانے دو اور اسے کچھ نہ

کہو۔غرض وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا میں اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مومنوں کو جب غلبہ حاصل ہوگا تو ایسی حالت میں بھی وہ کسی کے خطابِ جہالت پر بُرا نہیں منائیں گے بلکہ اُن کی سلامتی اور تحفظ حقوق کو مدّ نظر رکھیں گے اور درحقیقت غلبہ کے وقت ہی انسان کے اعلیٰ اخلاق کا پتہ چلتا ہے ورنہ کمزوری کی حالت میں کسی کا مار کھالینا تو ستر بی بی از بے چادری والی بات ہوتی ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مار نہ کھائے تو کیا کرے اُس کے اندر مقابلہ کی طاقت تو ہے ہی نہیں۔لیکن جب کوئی شخص طاقت رکھتے ہوئے عفو سے کام لیتا ہے اور سزا دینے کی طاقت رکھتے ہوئے کچھ نہیں کہتا تو اُس وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ فی الواقعہ وہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مالک ہے۔

پھر فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۔ وہ لوگ اپنی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔اس میں جہاں عبادالرحمٰن کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ مصائب اور مشکلات کے اوقات میں جو رات کی تاریکیوں سے مشابہت رکھتے ہیں دُعاؤں اور گریہ وزاری سے کام لیتے اور خدا تعالیٰ کے آستانہ پر جھکے رہتے ہیں۔وہاں اِس میں تہجد کی ادائیگی بھی عبادالرحمٰن کا شعار قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اُن کی راتیں خراٹے بھرتے ہوئے نہیں گزرتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی محبت اور عبادت میں گزرتی ہیں۔وہ جسمانی تاریکی کو دیکھ کر ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن پر روحانی تاریکی بھی نہ آجائے اور وہ دعاؤں اور استغفار اور انابت سے خدا تعالیٰ کی رحمت کو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے نماز تہجد کی اہمیت اِن الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (المزمل:7) یعنی رات کا اُٹھنا انسانی نفس کو مسلنے میں

سب سے زیادہ کامیاب نسخہ ہے اور رات کو خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گرے رہنے والوں کی روحانیت ایسی کامل ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ سچ کے عادی ہو جاتے ہیں۔رسول کریم ﷺ کو نماز تہجد کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ آپؐ بعض دفعہ رات کو اُٹھ کر چکر لگاتے اور دیکھتے کہ کون کون تہجد پڑھ رہا ہے۔

ایک دفعہ مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ذکر آگیا کہ وہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔آپؐ نے فرمایا۔ہاں بڑا اچھا ہے بشرطیکہ تہجد بھی پڑھے۔معلوم ہوتا ہے۔اُن دنوں حضرت عبداللہ بن عمرؓ تہجد پڑھنے میں سُستی کرتے ہوں گے رسول کریم ﷺ نے اِس ذریعہ سے انہیں توجہ دلائی کہ وہ اپنی اس سُستی کو دُور کریں۔چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اُسی دن سے تہجد کی نماز میں با قاعدگی اختیار کر لی۔

ایک دفعہ رات کے وقت آپؐ اپنے داماد حضرت علیؓ اور اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے گھر گئے اور باتوں باتوں میں دریافت فرمایا کہ کیا تم تہجد بھی پڑھا کرتے ہو۔حضرت علیؓ نے کہا۔یارسول اللہ! پڑھنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن جب خدا تعالیٰ کی منشاء کے ماتحت کسی وقت آنکھ نہیں کھلتی تو نماز رہ جاتی ہے۔آپ اُسی وقت اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑے اور بار بار فرماتے وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (بخاری کتاب الکسوف باب التہجد فی الّیل) یعنی انسان اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے مختلف قسم کی تاویلیں کر کر کے اپنے قصور پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ بجائے اِس کے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے انہوں نے یہ کیوں کہا کہ جب خدا کا منشاء ہوتا ہے کہ ہم نہ جاگیں تو ہم سوئے رہتے ہیں اور اس طرح اپنی غلطی کو اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کیا۔آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رات کو میاں کی آنکھ کھلے اور وہ تہجد کے لئے اُٹھے تو اپنی بیوی کو بھی تہجد کے

لئے جگائے۔اور اگر وہ نہ اُٹھے تو اُس کے مُنہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے۔اور اگر بیوی کی آنکھ کھل جائے اور اُس کا میاں جگانے کے باوجود نہ اُٹھے تو اُس کے مُنہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے۔آپؐ تہجد کی اہمیت پر اس قدر زور دیا کرتے تھے کہ آپؐ نے فرمایا۔اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں اپنے بندوں کے قریب آجاتا ہے اور اُن کی دعاؤں کو دن کی نسبت بہت زیادہ قبول فرماتا ہے۔آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ انسان نوافل کے ذریعہ مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اُس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سُنتا ہے اُس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کے پاؤں ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ رات کا اُٹھنا انسان کو اللہ تعالیٰ کے کس قدر قریب کر دیتا ہے۔مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں تہجد پڑھنے کی عادت بہت کم ہوگئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عباد الرحمٰن کی یہ ایک خاص خوبی بیان کی ہے کہ وہ اپنی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام میں گزار دیتے ہیں۔مگر چونکہ یہ آیات مسلمانوں کے دورِ حکومت کی امتیازی خصوصیات کی بھی حامل ہیں اس لئے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو جب دنیا پر غلبہ حاصل ہوگا تو وہ عیش و عشرت میں منہمک نہیں ہوں گے بلکہ اُن کی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام کرتے ہوئے گزریں گی۔چنانچہ جب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں مسلمانوں کی اس امتیازی خصوصیت کا بھی نہایت واضح طور پر علم حاصل ہوتا ہے۔تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب روم کے ساتھ مسلمانوں کی لڑائی ہوئی تو رومی جرنیل نے اپنا ایک وفد مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا اور اُس نے کہا کہ تم مسلمانوں کے لشکر کو جا کر دیکھو اور پھر واپس آکر بتاؤ کہ اُن کی کیا کیفیت ہے وہ وفد اسلامی لشکر کا جائزہ لے کر واپس گیا تو اُس نے کہا ہم مسلمانوں کو دیکھ آئے

ہیں۔وہ ہمارے مقابلہ میں بہت تھوڑے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی جن ہیں کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہ دن کولڑتے ہیں اور رات کوتہجد پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ہمارے سپاہی جو دن بھر کے تھکے ماندے ہوتے ہیں وہ تو رات کو شرابیں پیتے اور ناچ گانے میں مشغول ہوجاتے ہیں اور جب اِن کاموں سے فارغ ہوتے ہیں تو آرام سے سوجاتے ہیں۔مگر وہ لوگ کوئی عجیب مخلوق ہیں کہ دن کولڑتے ہیں اور راتوں کواُٹھ اُٹھ کرخدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اُس کا ذکر کرتے ہیں۔ایسے لوگوں سے لڑنا بے فائدہ ہے۔چنانچہ دیکھ لو۔اس ذکرالٰہی کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ بھی آسمان سے اُن کی مدد کے لئے اُترا اور اُس نے انہیں بڑی بڑی طاقتور حکومتوں پر غالب کر دیا۔عرب کی ساری آبادی ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔مگر انہوں نے روم جیسے ملک سے ٹکر لے لی جس کی بیس کروڑ آبادی تھی۔پھر انہوں نے کسریٰ کے ملک پر حملہ کر دیا اور اس کی آبادی بھی بیس تیس کروڑ تھی۔گویا پچاس کروڑ کی آبادی رکھنے والے مما لک پر ایک لاکھ اسی ہزار کی آبادی رکھنے والے ملک کا ایک حصہ حملہ آور ہوا۔اور پھر یہ ملک اتنے طاقتور تھے کہ ہندوستان بھی اُن کے ماتحت تھا چین بھی اُن کے ماتحت تھا۔اسی طرح ٹرکی۔آرمینیا۔عراق اور عرب کے اوپر کے مما لک یعنی فلسطین اور مصر وغیرہ بھی اُن کے ماتحت تھے۔مگر باوجود اتنی کثرت کے مٹھی بھر مسلمان نکلے تو انہوں نے اِن لوگوں کا صفایا کر دیا اور بارہ سال کے عرصہ میں اُن کی فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے جاٹکرائیں۔یہ فتوحات جو مسلمانوں کو حاصل ہوئیں صرف ذکرالٰہی اور يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا کا نتیجہ تھیں۔لیکن جب مسلمان بگڑ گئے اور انہوں نے ذکرالٰہی میں اپنی راتیں بسر کرنے کی بجائے رنگ رلیوں اور ناچ گانوں میں راتیں بسر کرنی شروع کر دیں۔جب انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسحاق موسوی بڑا اچھا گانے والا ہے۔فلاں کنچنی خوب ناچتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تباہی کے

لئے ہلاکو خاں کو بغداد پر مسلط کر دیا اور اُس نے ایک دن میں اٹھارہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کر دیا اور شاہی خاندان کی کوئی عورت ایسی نہ چھوڑی جس کے ساتھ بدکاری نہ کی گئی ہو۔ اُس وقت مسلمان ایک بزرگ کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ دُعا کریں بغداد تباہی سے بچ جائے۔ انہوں نے کہا۔ میں کیا دُعا کروں۔ میں تو جب بھی ہاتھ اُٹھاتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فرشتے مجھے آوازیں دیتے سُنائی دیتے ہیں کہ اَیُّھَا الْکُفَّارُ اُقْتُلُوا الْفُجَّارَ یعنی اے کافرو! اِن فاجر و فاسق مسلمانوں کو خوب مارو، چنانچہ بغداد تباہ ہو گیا۔ اور عباسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ حالانکہ ایک زمانہ میں اُن کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رومی حکومت کے لشکر کو جو ساٹھ ہزار کی تعداد میں تھا مسلمانوں کے صرف ساٹھ آدمیوں نے شکست دے دی تھی اور اُن کے ساٹھ میں سے بھی صرف بارہ تیرہ شہید ہوئے اور بیس کے قریب خطرناک زخمی ہوئے باقی سب خیریت کے ساتھ واپس آ گئے۔ یہ تائید مسلمانوں کو صرف اس لئے حاصل ہوئی کہ وہ طاقت اور غلبہ کو اپنی عیاشی کا ذریعہ نہیں بناتے تھے بلکہ ہر قسم کی طاقت اور ہر قسم کا غلبہ حاصل کرنے کے باوجود اُن کی زبانیں ذکرِ الٰہی سے تر رہتی تھیں اور اُن کی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور قیام اور سجود میں گزر جاتی تھیں۔ دنیا میں بڑی بڑی فاتح اقوام گزری ہیں مگر ہمیں کسی قوم کی تاریخ میں یہ مثال نظر نہیں آئے گی کہ وہ اتنے خدا ترس ہوں کہ اُن کی تلوار کسی عورت کسی بچے کسی بوڑھے اور کسی دینی شغف رکھنے والے انسان پر نہ اُٹھتی ہو۔ اُن کی تلوار کسی ایک انسان کا بھی ناجائز طور پر خون نہ بہاتی ہو اور راتوں کو وہ خدا تعالیٰ کے حضور روتے اور گڑگڑاتے ہوں۔ یہ عظیم الشان خوبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں ہی پائی جاتی تھی جن کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور بلند کردار کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے کفار کو بتایا ہے کہ دیکھو یہ لوگ تمہارے ہی ملک اور تمہارے ہی شہر کے رہنے والے تھے اور تمہارے ہی ساتھ انہوں نے اپنی عمروں کا بیشتر حصہ بسر کیا مگر تم بھی جانتے ہو اور

باقی سب لوگ بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ نہ اُن میں یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا والی بات پائی جاتی تھی اور اُن میں یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا والی کیفیت پائی جاتی تھی بلکہ اس کے برعکس ظلم وستم اُن کا شیوہ تھا۔ اور شراب خوری اور عیاشی میں انہماک اُن کا رات دن کا شغل تھا مگر جب انہوں نے خدائے رحمٰن کے کلام کو قبول کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلے تو اُن کی دُنیا بھی بدل گئی اور اُن کی اخلاقی اور روحانی حالت میں بھی ایک تغیر عظیم واقع ہو گیا۔ اگر یہ خدائے رحمٰن کے کلام کو قبول کرنے کی برکت نہیں تو بتاؤ اُن میں یہ خوبیاں کہاں سے پیدا ہوئیں اور کس چیز نے انہیں اِن اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مالک بنا دیا۔

۞ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ (الفرقان:66-67)

پھر عباد الرحمٰن کی ایک اور علامت یہ بتائی کہ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! عذابِ جہنم کو ہم سے دُور رکھ۔ کیونکہ اُس کا عذاب ایک بہت بڑی تباہی ہے اور جہنم بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ خواہ وہ عارضی وقت کے لئے ہو یا مستقل وقت کے لئے۔

اس جگہ جہنم سے گو اُخروی جہنم بھی مراد ہے جس سے ہر سچا مومن اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے مگر دنیوی نقطہ نگاہ سے ہر وہ امر جو انسان کے لئے دُکھ اور تکلیف کا موجب ہو اور جس سے اس کی جان و مال یا عزت اور آبرو کو خطرہ ہو اور جو اُسے قوم اور ملک کی نظروں میں گرانے اور ذلیل کرنے والا ہو وہ بھی اس کے لئے جہنم کا ہی رنگ رکھتا ہے۔ دراصل جہنم جھن اور جھم سے مرکب ہے۔ جھن کے معنے کسی چیز کے

قریب ہونے کے ہوتے ہیں اور جہنم کے معنے مُنہ کے بگڑ جانے کے ہیں۔ پس جہنم کے لفظ کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہوسکتا ہے جس کی طرف انسان پہلے تو بڑے شوق اور حرص کے ساتھ بڑھے مگر جب وہ اس کے قریب پہنچے تو اُس کا مُنہ بگڑ جائے اور وہ گھبرانے لگ جائے اِس نام میں درحقیقت جہنمی افعال کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان پہلے تو عیاشیوں اور بدکاریوں کو بڑا اچھا فعل سمجھتا اور اُن کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب وہ اُن بدیوں میں ملوث ہو جاتا ہے اور اُن کا بُرا انجام آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو اس کا منہ بگڑ جاتا ہے اور وہ رونے اور چیخیں مارنے لگ جاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں نے تو بڑی غلطی کی۔ اِن معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس آیت میں عبادالرحمٰن کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی! ہمیں ہر ایسے کام سے بچائیو جو ہمیں دنیا و آخرت میں ذلیل کرنے والا ہو۔ تو ہمیں افلاس اور تنگدستی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں جہالت اور کم علمی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں بداخلاقی اور عیاشی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں دنیاداری اور ہوس پرستی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کی خرابی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں کفر اور شیطنت کے جہنم سے بچا۔ ہمیں لامذہبیت اور اباحت کے جہنم سے بچا۔ ہمیں منافقت اور بے ایمانی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں خودسری اور جھوٹ اور ظلم اور تعدّی کے جہنم سے بچا۔ ہمیں اپنی محبت اور رضا سے دوری کے جہنم سے بچا کیونکہ خواہ یہ بُرائیاں ہم میں عارضی طور پر پیدا ہوں یا مستقل طور پر بہر حال ان کا پیدا ہونا ہمارے لئے تباہی اور رسوائی کا باعث ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مستقل طور پر اِن خرابیوں کا پیدا ہونا تو الگ رہا ہم میں عارضی اور وقتی طور پر بھی یہ خرابیاں پیدا نہ ہوں اور ہمیشہ ہمارا قدم صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ گویا وہی دُعا جو سورۃ فاتحہ میں غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ کے الفاظ میں سکھائی گئی ہے اِس جگہ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ

جَھَنَّمَ کے الفاظ میں دُہرادی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی یہ علامت بتائی گئی ہے کہ باوجود اس کے کہ انہیں دنیا پر غلبہ حاصل ہوتا ہے پھر بھی قومی تنزل کا خوف ہر وقت اُن کو آستانہ ایزدی پر جُھکائے رکھتا ہے اور وہ رات دن دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی! ہم میں اور ہماری آئندہ نسلوں میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو تا کہ وہ جنت جو تو نے محض اپنے فضل سے ہمیں عطا فرمائی ہے وہ ہمیشہ قائم رہے اور کوئی ابلیس سانپ کی شکل اختیار کر کے ہماری ایڑی کو نہ کاٹ لے۔ اگر مسلمان اپنے غلبہ کے اوقات میں اس قرآنی دُعا کو ہمیشہ یاد رکھتے اور ہر کامیابی کے حصول پر قومی تنزل کے خطرات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے تو اللہ تعالیٰ اُن پر دائمی طور پر اپنا فضل نازل کرتا اور ہمیشہ اُن کا قدم ترقی کے میدان میں آگے ہی آگے بڑھتا رہتا۔

مگر ان معنوں کے علاوہ اس آیت میں اُخروی جہنّم کے عذاب سے بھی بچنے کی دُعا سکھائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جہنم عارضی رہائش کے لحاظ سے بھی بہت بُرا ٹھکانا ہے اور مستقل رہائش کے لحاظ سے بھی بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ اِن الفاظ میں قرآن کریم کی یہ تعلیم بیان کی گئی ہے کہ دوزخ غیر محدود نہیں ہوگی کیونکہ دوزخ کو مستقر قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنے عارضی قرارگاہ کے ہوتے ہیں اور چونکہ اس جگہ یہ کہا گیا ہے۔ کہ دوزخ خواہ عارضی ہو یا مستقل بڑی تکلیف دہ جگہ ہے اس لئے اِن الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دوزخ کا تھوڑا عذاب بھی سزا دینے کے لئے کافی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے لمبا کیا جائے یا اُسے مستقل بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو بعض اور مقامات پر بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات: 57) یعنی میں نے جنّ و انس کو صرف اس غرض کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے عبد بن جائیں۔ اور جب انسان کو پیدا ہی اس غرض کے لئے کیا گیا

ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عبد بنے تو اگر وہ دائمی طور پر دوزخ میں رکھا جائے تو وہ اس غرض کو پورا ہی نہیں کر سکتا اور پیدائش عالم کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ اِس مضمون کی مزید تشریح اس آیت سے ہوتی ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (الفجر: 30-31) یعنی اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ رکھنے والوں سے فرمائے گا کہ آؤ اور میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ۔ آؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی عبد کا مقام جنت ہے۔ اور جب ہر انسان عبد بننے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو لازماً ہر انسان کے متعلق ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ جنت میں جائے گا۔ پس دوزخ ایک عارضی قرار گاہ ہے مستقل مقام نہیں۔ پھر فرماتا ہے وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًاط وَاِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَابِهَاط وَکَفٰی بِنَاحَاسِبِیْنَ (الانبیاء: 48) یعنی قیامت کے دن ہم ایسے تول کے سامان پیدا کریں گے کہ جن کی وجہ سے کسی جان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کسی نے رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی نیکی یا بدی کی ہو گی تو ہم اس کو بھی لے آئیں گے۔ اور ہم حساب لینے میں کافی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بدیوں کی کثرت کی وجہ سے جہنم میں چلا جائے اور پھر ابدالاباد تک اُسی میں رہے تو اُسے اپنی نیکیوں کا بدلہ نہیں مل سکتا۔ پس ضروری ہے کہ اس کی سزا ایک دن ختم ہو تا کہ اس کی نیکیوں کی اُسے جزا دی جائے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو اِن الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (القارعہ: 9-10) یعنی جس کی نیکیاں کم ہوں گی اُس کی ماں ہاویہ ہو گی۔ یعنی جس طرح بچہ رحم مادر میں ایک معیّن عرصہ تک رہتا ہے اور پھر اُس کے پیٹ سے باہر آ جاتا ہے۔ اِسی طرح جب دوزخیوں کی سزا کی میعاد ختم ہو جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں باہر لے آئے گا اور اپنی جنّت میں داخل کر دے گا۔

اسی طرح فرماتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَھُمْ فِیْھَا زَفِیْرٌ وَّشَھِیْقٌ ○ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ط اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ○ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ط عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ (ھود:107-109) یعنی جولوگ بدبخت ثابت ہوں گے وہ آگ میں داخل کئے جائیں گے۔اُس میں کسی وقت تو اُن کے غم سے لمبے لمبے سانس نکل رہے ہوں گے اور کسی وقت رورو کر ہچکی بندھ جائے گی۔وہ اُس میں اُس وقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اور ارادہ کرے اور تیرا رب اپنے ارادہ کو پورا کرنے والا ہے۔اور جولوگ خوش نصیب ہوں گے وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے اور وہ اس وقت تک اس میں رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں۔سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔مگر یہ ایسی عطا ہوگی جو کبھی کاٹی نہیں جائے گی۔

اِس آیت میں جہنمیوں کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اُن کو جہنم سے نکال سکتے ہیں اور ہمارے ارادہ میں کون حائل ہوسکتا ہے لیکن مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ ہم اگر چاہیں تو اُن کو بھی جنت سے نکال سکتے ہیں مگر ہم نے یہی چاہا ہے کہ اُن کے انعام کو کبھی ختم نہ کیا جائے۔اِس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب ایک دن منقطع ہونے والا ہے کیونکہ دوزخیوں کو جہنم سے نکلنے کی امید دلائی گئی ہے۔لیکن جنتیوں کو کہا گیا ہے کہ انہیں غیر مقطوع یعنی نہ ختم ہونے والے انعام سے نوازا جائے گا۔

پھر فرماتا ہے عَذَابِیْ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ج وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ

كُــلَّ شَــيْءٍ (الاعـراف : 157) میں اپنا عذاب جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں مگر میری رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے اور جب اُس کی رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے تو ضروری ہے کہ دوزخ بھی ایک دن اُس کی رحمت کے سایہ تلے آجائے اور دوزخیوں کو اُس میں سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے۔

حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا يَــأْتِــىْ عَـلٰـى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ وَنَسِيْمُ الصَّبَا نُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا (تفسیر معالم التنزیل سورہ ہود ع 9) یعنی جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اُس میں کوئی شخص نہیں ہوگا اور ہوا اُس کے دروازے کھٹکھٹائے گی۔ یعنی وہ کھلے ہوں گے اور دوزخ کے اندر کوئی قید ہی نہیں رہے گا۔

غرض اسلامی تعلیم کے ماتحت جزائے نیک تو دائمی ہوگی مگر دوزخ کا عذاب دائمی نہیں۔ وہ بیشک ایک بھیانک اور تکلیف دہ چیز ہے مگر آخر خدا تعالیٰ کی محبت جوش میں آئے گی اور وہ گنہگاروں کو بھی اپنے سایہ رحمت میں لے آئے گی۔

اس جگہ ایک شبہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَـا هُـمْ بِـخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (البقرہ:168) یعنی دوزخی دوزخ کی آگ سے ہرگز نہیں نکل سکیں گے۔ اِس آیت سے یہ دھوکہ ہرگز نہیں کھانا چاہئے کہ اِس میں تو لکھا ہے کہ دوزخ میں سے کوئی نہیں نکلے گا۔ کیونکہ اِس میں اُن کے اپنے زور سے نکلنے کی نفی کی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ کے فضل کی نفی نہیں کی گئی۔ پس اِس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ دوزخی اپنے زور سے اُس میں سے نہیں نکل سکیں گے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ایک دن نکال دیئے جائیں گے۔

۞ وَالَّـذِيْـنَ اِذَآ اَنْـفَـقُـوْا لَـمْ يُسْـرِفُـوْا وَلَـمْ يُقْتُرُوْا وَكَـانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان:68)

رحمٰن کے بندوں کا ایک یہ بھی نشان ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو دو باتیں اُن کے مدنظر رہتی ہیں۔اول یہ کہ وہ اسراف سے کام نہیں لیتے اور دوسرے وہ بخل نہیں کرتے۔

اسراف کا مرض اس زمانہ میں اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آجکل مسلمان کی تعریف اور علامت ہی یہی سمجھی گئی ہے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہو وہ سب خرچ کر دے اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھے۔ گویا قرآن کریم تو کہتا ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جو اسراف نہ کرے اور آجکل کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سچا مسلمان وہ ہوتا ہے جو سب کچھ بیچ کر کھا جائے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول سُنایا کرتے تھے کہ ایک شخص کو اپنے باپ کی بہت سی دولت مل گئی۔اُس نے اپنے دوستوں اور آشناؤں کو بُلا کر پُوچھا کہ مجھے دولت خرچ کرنے کا کوئی طریق بتاؤ۔ کسی نے کچھ بتایا اور کسی نے کچھ لیکن اسے کوئی پسند نہ آیا۔ایک دن وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ بزاز کی دکان سے کپڑے پھاڑنے کی آواز آئی جو اُسے پسند آ گئی اور اُس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ میرے سامنے روزانہ کپڑے کے تھان لا لا کر پھاڑا کرو۔ چنانچہ روزانہ اُس نے کپڑوں کے تھان پھڑوانے شروع کر دئے اور صبح سے شام تک اُس کا یہی شغل رہتا کہ لوگ بیٹھے تھان پھاڑ رہے ہیں اور وہ چِر چِر کی آواز سُن کر خوش ہو رہا ہے۔اب خرچ کرنے کو تو اُس نے بھی اپنا روپیہ خرچ کیا مگر یہ کیسا نامعقول خرچ تھا۔اِس طرح تو اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ بھی ہو تو وہ سب کچھ خرچ کر کے کنگال اور نادار بن سکتا ہے۔قرآن کریم نے

وَتَأْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر: 20) میں کفار کو اُن کے اِس نقص کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تمہیں اپنے باپ دادا سے مال ملا۔ مگر بجائے اِس کے کہ تم اُسے ترقی دیتے تم نے اس دولت کو اپنے ذاتی عیش و آرام کے لئے تباہ کرنا شروع کر دیا

جس کی وجہ سے تمہاری عملی قوتیں بیکار ہوگئیں اور تم تنزل اور انحطاط کا شکار ہو گئے۔

حضرت خلیفہ اوّل فرمایا کرتے تھے کہ روپیہ کمانا آسان ہوتا ہے مگر اُسے خرچ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور حقیقتاً یہ بالکل درست ہے۔ دنیا میں بہت لوگ ہیں جو روپیہ کماتے ہیں لیکن چونکہ انہیں خرچ کرنا نہیں آتا اس لئے وہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور بہت ہیں جو کم کماتے ہیں مگر چونکہ انہیں روپیہ خرچ کرنا آتا ہے۔ اس لئے وہ تھوڑے روپیہ میں بھی آسانی سے اپنا گزارہ کر لیتے ہیں۔

بہر حال اسلام نے عباد الرحمٰن کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں زمین پر غلبہ عطا فرماتا ہے تو وہ خزائن الارض کی تقسیم میں کسی قسم کے اسراف یا بخل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی نہ تو قومی روپیہ کو اس طرح غلق میں بند کر کے رکھتے ہیں کہ قومی و ملکی ترقی میں روک واقعہ ہو جائے اور عوام کو شکایت کا موقعہ پیدا ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی عملی زندگی میں ایسا ہی نمونہ دکھایا۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہ بھی بنایا اور لاکھوں روپیہ کے اموال آپؐ کے قبضہ میں آئے۔ مگر آپؐ نے کبھی اُن کے خرچ کرنے میں اسراف سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کسی جگہ بخل سے کام لے کر حقدار کو اس کے حق سے محروم کیا۔ آپؐ قومی اموال کی تقسیم اور اُن کے خرچ کرنے میں اس قدر محتاط واقعہ ہوئے تھے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ بعض جنگی قیدی رسول کریم ﷺ کے پاس آئے تو حضرت فاطمہؓ کا اس کا علم ہوا۔ تو وہ رسول کریم ﷺ کے پاس تشریف لے گئیں۔ مگر انہوں نے آپؐ کو گھر پر نہ پایا۔ چونکہ وہ اُس وقت زیادہ انتظار نہیں کر سکتی تھیں اس لئے انہوں نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ رسول کریم ﷺ تشریف لائیں تو میری طرف سے آپؐ کو عرض کیا جائے کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں پر آبلے اُٹھ آئے ہیں۔ اگر جنگی قیدیوں میں سے کوئی قیدی مجھے بھی عطا فرما دیا جائے اور وہ آٹا پیس دیا کرے تو مجھے سہولت ہو جائے

گی۔رسول کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ تمام واقعہ آپؐ کی خدمت میں عرض کر دیا۔رات کو رسول کریم ﷺ اپنی بیٹی کے ہاں تشریف لے گئے۔اور فرمایا بیٹی کیا میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتاؤں جو اُس چیز سے جو آج تم نے مانگی ہے بہت بہتر اور بڑی برکت والی ہے۔انہوں نے کہا یا رسول اللہؐ! ضرور بتایئے۔آپؐ نے فرمایا۔جب تم سونے لگو تو 33 دفعہ سبحان اللہ۔33 دفعہ الحمد للہ اور 34 دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔

یہ واقعہ جو رسول کریم ﷺ کی زندگی کے اُس دور سے تعلق رکھتا ہے جبکہ آپؐ بادشاہ بن چکے تھے بتاتا ہے کہ گو آپؐ اپنی بیٹی کو جنگی قیدی عطا فرما سکتے تھے کیونکہ آپؐ نے بہر حال اُن کو صحابہؓ میں ہی تقسیم کرنا تھا اور حضرت علیؓ کا ویسا ہی حق تھا جیسے باقی صحابہؓ کا مگر آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ کوئی جنگی قیدی اپنے خاندان میں تقسیم کریں تا ایسا نہ ہو کہ آنے والے بادشاہ آپ کے اِس نمونہ سے غلط نتائج اخذ کر کے دوسروں کے اموال اپنے لئے جائز سمجھ لیں۔بیشک وہ اموال جن میں خدا تعالیٰ نے آپؐ کا اور آپؐ کے رشتہ داروں کا حق مقرر فرمایا تھا اُن میں سے آپؐ ضرورت پر خود بھی خرچ فرما لیتے تھے اور اپنے متعلقین کو بھی دے دیتے تھے۔مگر جب تک کوئی چیز آپؐ کے حصہ میں نہ آجائے اس وقت تک باوجود ایک با اقتدار بادشاہ ہونے کے ایک جو کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز آپؐ اپنے عزیز سے عزیز رشتہ دار کو بھی نہیں دیتے تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ قومی روپیہ ضائع ہو یا کسی ایسی جگہ خرچ ہو جو نا جائز ہو۔

ایک دفعہ صدقہ کی کچھ کھجوریں آئیں اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ جو اُس وقت چھوٹے بچے تھے اُن کھجوروں سے کھیلنے لگے۔کھیلتے کھیلتے اُن میں سے کسی نے ایک کھجور اپنے مُنہ میں ڈال لی۔اچانک رسول کریم ﷺ کی بھی نظر جا پڑی۔آپؐ

نے فوراً اُس کے منہ سے انگلی ڈال کر کھجور نکال لی اور فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ غرباء کا حق ہے۔ آلِ محمدؐ غرباء کا مال نہیں کھایا کرتی۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول کریم ﷺ قومی اموال کی کس سختی کے ساتھ محافظت فرمایا کرتے تھے۔ اور اُس کے خرچ میں کتنی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔

یہی کیفیت خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی جاری رہی اور انہوں نے بھی قیصر و کسریٰ سے زیادہ طاقت رکھنے کے باوجود سرکاری اموال کو کبھی بے جا خرچ نہیں کیا۔ بلکہ ایک ایک پیسہ اور ایک ایک پائی کی حفاظت کی اور اگر کسی جگہ انہوں نے روپیہ کا بے جا خرچ دیکھا تو بڑی سختی سے اُس کو روکا اور افسروں کو معزول کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنے زمانہ خلافت میں بیت المقدس تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ بعض صحابہؓ نے ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ریشمی کپڑوں سے مراد وہ کپڑے ہیں جن میں کسی قدر ریشم ہوتا ہے۔ ورنہ خالص ریشم کے کپڑے تو سوائے کسی بیماری کے مردوں کو پہننے ممنوع ہیں۔ آپ اُن لوگوں پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم اب ایسے آسائش پسند ہو گئے ہو کہ ریشمی کپڑے پہنتے ہو۔ اس پر اُن میں سے ایک شخص نے اپنی قمیض اٹھا کر دکھائی تو معلوم ہوا کہ اُس نے نیچے موٹی اون کا سخت کُرتہ پہنا ہوا تھا۔ اُس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ ہم نے ریشمی کپڑے اس لئے نہیں پہنے کہ ہم ان کو پسند کرتے ہیں بلکہ اِس لئے پہنے ہیں کہ اس ملک کے لوگ بچپن سے ایسے امراء دیکھنے کے عادی ہیں جو نہایت شان و شوکت سے رہتے تھے۔ پس ہم نے بھی اپنے لباسوں کو صرف ملکی سیاست کے طور پر بدلا ہے ورنہ ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ صحابہؓ کے اس عمل سے پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے غلبہ کے زمانہ میں بھی کبھی اسراف سے کام نہیں لیا اور اگر کسی مقام پر اُن سے کوئی لغزش بھی ہوئی تو خلفاء نے ان کو ڈانٹا اور انہیں نصیحت

کی کہ وہ اموال کے خرچ میں افراط وتفریط سے بچیں اور سادگی اختیار کریں۔

اِس زمانہ میں زیادہ تر شادی بیاہ کے موقع پر لوگ اپنی ناک رکھنے کے لئے زیورات وغیرہ پر طاقت سے زیادہ روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ جوانجام کار اُن کے لئے کسی خوشی کا موجب نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہیں دوسروں سے قرض لینا پڑتا ہے جس کی ادائیگی انہیں مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اگر کسی کے پاس وافر روپیہ موجود ہو تو اُس کے لئے شادی بیاہ پر مناسب حد تک خرچ کرنا منع نہیں لیکن جس کے پاس نقد روپیہ موجود نہیں وہ اگر ناک رکھنے کے لئے قرض لے کر روپیہ خرچ کرے گا تو اس کا یہ فعل اسراف میں شامل ہوگا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اسراف کی شکلیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص کی آمد دو چار ہزار روپیہ ماہوار ہے اور وہ پندرہ بیس روپے گز کا کپڑا پہنتا ہے یا پانچ سات سوٹ تیار کرالیتا ہے تو اُس کے مالی حالات کے مطابق اسے ہم اسراف نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اُس کی بیوی بچے بیمار ہو جائیں اور وہ ایسے ڈاکٹروں سے علاج کروائے جو قیمتی ادویات استعمال کروائیں اور ہزار میں پانچ سات سو روپیہ اس کا دواؤں پر ہی خرچ ہو جائے اور اس کے باوجود وہ اپنے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات میں کوئی کمی نہ کرے تو پھر اس کا یہی فعل اسراف بن جائے گا حالانکہ عام حالات میں یہ اسراف میں شامل نہیں تھا۔ اِسی طرح جب بھی کسی خرچ کے مقابلہ میں دوسری ضروریات بڑھ جائیں تو اُس وقت پہلے خرچ کو اُسی شکل میں قائم رکھنا جس شکل میں پہلے تھا اسراف میں شامل ہو جائے گا۔ مثلاً اِس زمانہ میں اسلام کی شاعت کے لئے ہمیں کروڑوں روپیہ کی ضرورت ہے۔ مختلف ممالک اور اکناف سے آوازیں آرہی ہیں کہ ہماری طرف سے لوگ بھیجے جائیں جو ہمیں اسلام کی تعلیم سکھائیں۔ ایسا لٹریچر بھیجا جائے جو ہمارے شبہات کا ازالہ کرے۔ اگر اِس وقت ہماری جماعت کا کوئی فرد اپنے کھانے اور پینے اور پہننے کے

اخراجات میں تخفیف نہیں کرتا اور زیادہ سے زیادہ روپیہ اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں دیتا تو گو عام حالات میں اُس کا اچھا کھانا پینا اور پہننا اسراف میں شامل نہ ہو مگر موجودہ زمانہ میں اس کا اپنے کھانے پینے اور پہننے پر زیادہ خرچ کرنا یقیناً اسراف میں شامل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جماعت میں تحریکِ جدید جاری کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک کھانا کھائے۔ جن لوگوں کے پاس کپڑوں کے چند جوڑے موجود ہیں وہ اُن کے خراب ہونے تک محض شوق پورا کرنے کے لئے نئے جوڑے نہ بنوایا کریں۔ جو لوگ نئے کپڑے زیادہ بنوایا کرتے ہوں وہ نصف یا تین چاتھائی یا ۴/۵ پر آجائیں۔ عورتیں اپنے اوپر یہ پابندی عائد کریں کہ وہ محض پسند پر کپڑا نہیں خریدیں گی بلکہ ضرورت پر کپڑا لیں گی۔ اور گوٹہ کناری اور فیتہ وغیرہ نہیں خریدیں گی نہ نئے نئے زیورات پر اپنا روپیہ برباد کریں گی۔ اسی طرح میں نے ڈاکٹروں سے کہا ہے کہ وہ اپنا سارا زور لگائیں کہ روپوؤں کا کام پیسوں میں ہو اور جب تک وہ یہ نہ سمجھیں کہ بغیر قیمتی دوا کے استعمال کے مریض کی جان کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اُس وقت تک قیمتی ادویات پر روپیہ خرچ نہ کروائیں۔ وہ اپنے دماغ پر زور دے کر ایسے نسخے لکھیں جو سستے داموں تیار ہو سکیں اور پیٹنٹ ادویہ استعمال کرا کے نئی نئی دواؤں کے تجربہ پر اپنے ملک کا روپیہ ضائع نہ کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹروں نے میری یہ بات نہیں مانی اور مجھے اپنی ساری خلافت کی زندگی میں تلخ ترین تجربہ احمدی ڈاکٹروں کا ہوا ہے۔ ولیمہ کے متعلق بھی میں نے ہدایت دی کہ اِس موقع پر صرف چند دوستوں کو بُلا لینا کافی ہوتا ہے۔ زیادہ لوگوں کو بُلا کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ لوگ اپنا اپنا کھانا لا کر ولیمہ والے گھر میں بیٹھ کر کھالیں اور ایک آدمی کا کھانا اُس گھر والے کی طرف سے بھی ہو جائے۔ یہ ہدایات میں نے اِس لئے دیں کہ اس زمانہ میں اسلام کو مالی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ اگر کھانے، پینے، پہننے اور آسائش و

زیبائش کے کاموں پر ہی سارا روپیہ خرچ کر دیا جائے گا تو اسلام کی ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہر وقت ایک قسم کی قربانی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ مختلف حالات میں مختلف قسم کی قربانیوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ ایک خاص جنگ کے وقت اپنا سارا اور حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال پیش نہ کرتے۔ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں بیسیوں جنگیں ہوئی ہیں مگر حضرت ابوبکرؓ نے ہر جنگ کے موقع پر اپنا سارا مال اور حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا مال نہیں دیا۔ صرف ایک جنگ کے موقع پر حضرت عمرؓ کو یہ خیال آیا کہ آج زیادہ قربانی کا موقعہ ہے۔ میں حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں اور اسی خیال کے آنے پر وہ اپنا آدھا مال لے کر آ گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اِس سے پہلے کبھی اپنا آدھا مال بھی نہیں دیا تھا۔ ورنہ حضرت عمرؓ کو یہ کس طرح خیال آ سکتا تھا کہ میں اپنا آدھا مال دے کر حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں گا لیکن حضرت ابوبکرؓ اس موقعہ کی نزاکت کو دیکھ کر اپنا سارا مال دینے کا فیصلہ کر چکے تھے چنانچہ جب وہ اپنا سارا مال لے کر گئے تو رسول کریم ﷺ جو اُن کے گھر کی حالت سے واقف تھے اسے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ ابوبکرؓ اپنے گھر میں کیا چھوڑا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ خدا اور اُس کے رسول کا نام۔

(ترمذی جلد دوم ابواب المناقب باب مناقب ابی بکرؓ)

حضرت عمرؓ نے یہ بات سُنی تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں اِن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو کبھی زیادہ قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی کم۔ لیکن بہرحال ایک مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اخراجات کو ایک حد کے اندر رکھے تا کہ جب بھی قربانی کی آواز آئے وہ لبیک کہتے ہوئے اُس کی طرف دوڑ پڑے اور اسراف کی عادت اس کی راہ میں حائل نہ ہو۔

وَلَمْ يَقْتُرُوْا عبادالرحمٰن کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ بخل سے بھی کام نہیں لیتے ......قاتر کے ایک معنے اُس شخص کے ہوتے ہیں جو مال کوجمع کرتا رہتا ہے اوراسی سے بُخل کے معنے نکالے گئے ہیں۔ کیونکہ انسان تبھی مال جمع کرسکتا ہے جبکہ وہ خرچ نہ کرے۔اوراُسی کوبخیل کہتے ہیں جو روپیہ کے ہوتے ہوئے اُسے اپنے جائز مصرف میں نہ لائے۔پس قاتر کے اصل معنے یہ ہیں کہ جو مال جمع کرے اوراُس لوگوں پرخرچ نہ کرے جن پرخرچ کرنا اُس کے لئے ضروری ہو۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں اورمحتاجوں وغیرہ پر روپیہ خرچ نہیں کرتا وہ بُرا ہے کیونکہ جس کے پاس مال نہ ہووہ بھی تو خرچ نہیں کرتا۔پھرکیا وہ خداتعالیٰ کے نیک بندوں میں سے نکل جائے گا؟ مثلاً ایک شخص خود بھوکا ہے اُس سے کوئی محتاج آکر مانگتا ہے کہ مجھے کھانے کو دولیکن وہ کچھ نہیں دیتا تو ایسا آدمی خدا تعالیٰ کے حضور بخیل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ہاں ایسا شخص جس کے پاس دوسرے کو دینے کے لئے موجود ہے مگر وہ پھر بھی نہیں دیتا۔وہ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک گنہگار ہوگا۔تو یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ خدائے رحمٰن کا وہ بندہ ہے جوخرچ نہیں کرتا۔ بلکہ لَمْ يَقْتُرُوْا فرمایا ہے اور قاتر اُس کو کہتے ہیں جو مال جمع رکھے اوراپنے رشتہ داروں، مسکینوں اورمحتاجوں وغیرہ پرخرچ نہ کرے۔پس ایک ہی لفظ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتادیا کہ جس کے پاس مال نہ ہواُس پرکوئی اعتراض نہیں۔اعتراض صرف اس پر ہے جس کے پاس مال ہواور وہ بجائے حاجتمندوں پرخرچ کرنے کے اُسے جمع کرتا رہے اور پھر اس لفظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتادیا کہ خالی مال جمع کرنا بُرا نہیں بلکہ مال کے ساتھ چمٹے رہنا اوراُسے اُن لوگوں پرخرچ نہ کرنا جن کی نگرانی یا خوردونوش کے اخراجات اُس کے ذمہ ہوں۔یہ بُرا ہے اوراس سے ہرمومن کواجتناب اختیار کرنا چاہئے۔

بخل ایک ایسا خطرناک عیب ہے جسے دنیا کی تمام قوموں کے ضابطہ اخلاق میں بُرا قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کو بخیل کہہ دیا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے گالی دی گئی ہے۔ لوگ جب کسی کی مذمت کرنا چاہیں تو کہتے ہیں۔ ''کنجوس مکھی چوس'' جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ شخص ایسا بخیل ہے کہ اگر مکھی بھی اُس کے کھانے میں گر پڑے تو یہ اُس کو بھی چوس لیتا ہے۔ لیکن کنجوسی سی بعض نہایت معمولی اور چھوٹے چھوٹے امور کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ بچپن میں ہی کوشش کریں تو وہ اپنی آئندہ نسل کو بخل کے مرض سے بچا سکتے ہیں۔ بخل کا مرض ایک تو اِس طرح پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی فقیر دروازہ پر آتا ہے اور وہ خیرات مانگتا ہے تو بجائے اِس کے کہ اُسے ملاطفت کے ساتھ کچھ دے کر رخصت کر دیا جائے بعض لوگ غصہ سے کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اِسے کچھ نہ دیا جائے۔ یہ خود کمائے اور کھائے۔ چھوٹے بچے اُن کی آواز سُنتے ہیں تو اُن میں بھی بُخل کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح جن بچوں کو بچپن میں اجابت روکنے کی عادت ہوتی ہے اُن میں بھی بڑے ہو کر بخل کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ سمجھدار ہو جاتے ہیں تو گو وہ اس عادت کو لغو سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں مگر بچپن کی اس عادت کا ان کے اخلاق پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر جائز مصارف میں بھی اپنا مال خرچ نہیں کرتے اور اُسے روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود بھی ہر قسم کی سہولتوں سے محروم رہتے ہیں اور اپنوں اور بے گانوں کی نگاہ میں بھی انہیں کوئی عزت حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ قرآن کریم نے بُخل کا ایک بہت بڑا نقصان یہی بیان کیا ہے کہ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (محمد:39) یعنی جو شخص بخل کرتا ہے اُس کا نقصان خود اُسی کو ہوتا ہے۔ کیونکہ بخل کی وجہ سے نہ تو وہ اچھا کھانا کھاتا ہے۔ نہ اچھا لباس پہنتا ہے۔ نہ رہائش کے لئے کوئی مکان بنانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ نہ بیمار ہونے

پردواؤں کے لئے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ نہ مصیبت میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے کام آتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی تکلیف میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے حلقہ میں بھی اُسے کسی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اِسی طرح جب وہ قومی کاموں کے لئے روپیہ صرف نہیں کرتا تو قوم بھی اُسے ذلیل سمجھنے لگ جاتی ہے۔ لیکن خدائے رحمٰن کے بندے اِن تمام عیوب سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو اپنے روپیہ کو معصیت کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ نہ غلط طور پر خرچ کرتے ہیں اور نہ خرچ میں جائز حدود سے تجاوز اختیار کرتے ہیں جو اسراف کی مختلف شکلیں ہیں اور نہ اپنے مالوں کو اس طرح روک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ دولت کی ہوس میں اپنے فرائض اور واجبات کو بھی ترک کردیں۔ بلکہ اُن کا رویہ ہمیشہ میانہ روی کا ہوتا ہے اور افراط وتفریط کا عیب اُن میں نہیں پایا جاتا۔

۞ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ج وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا o يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا o اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا o وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا o

(الفرقان :69-72)

رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ شرک نہیں کرتے۔ اور کسی ایسی جان کو قتل نہیں کرتے جس کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہوا ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ طریق پر قتل کرنا پڑے تو ایسا کر دیتے ہیں۔ جیسے جہاد میں یا قاتل کو اُس کے قتل کی سزا دینے کے لئے۔ یہ علامات بھی ہمیں رسول کریم ﷺ اور آپؐ کے

صحابہؓ کی زندگیوں میں نہایت نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے توحید کی اشاعت کے لئے وہ وہ قربانیاں پیش کیں کہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں ان کا ذکر پڑھ کر انسانی قلب لرز جاتا ہے۔وہ خدائے واحد و یگانہ پر ایمان لانے کی وجہ سے قتل کئے گئے۔اُن کے اموال چھین لئے گئے۔اُن کی عورتوں کی آبروریزی کی گئی۔انہیں اپنے وطن سے بے وطن کیا گیا۔انہیں تپتی ریت پر لٹایا گیا۔اُن کے سینوں پر بڑے بڑے بھاری پتھر رکھ کر ان پر جوتوں سمیت کودا گیا اور انہیں لات و منات اور عزّٰی کی پرستش پر مجبور کیا گیا مگر وہ لوگ خدا تعالیٰ کے عشق میں کچھ ایسے سرشار تھے کہ اُن کی زبانوں سے اگر کوئی فقرہ نکلا تو صرف یہی کہ خدا ایک ہے۔خود رسول کریم ﷺ کو کفار مکہ نے یہاں تک پیشکش کی کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں صرف اتنا مطالبہ آپؐ منظور کر لیں کہ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا نہ کہیں۔مگر اتنی بڑی پیشکش کے باوجود رسول کریم ﷺ نے اُن کے مطالبہ کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ برداشت نہ کیا کہ خدائے واحد کی توحید میں کوئی خلل واقع ہو۔بلکہ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لاکر کھڑا کر دیں تب بھی میں خدا تعالیٰ کی توحید کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔پھر آپؐ کی آنکھوں کے سامنے محض توحید کو تسلیم کرنے کے جرم میں آپؐ کے عزیز ترین صحابہؓ پر بڑے بڑے مظالم توڑے گئے خود آپؐ اور آپؐ کے خاندان کو اُن کے پیہم مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑا۔مگر آپؐ نے ان تمام تکالیف کے باوجود دُنیا کی ہر اُس قوم سے لڑائی کی جو توحید کی دشمن تھی۔آپؐ نے مشرکین مکہ کا بھی مقابلہ کیا جو سینکڑوں بتوں کے پجاری تھے۔آپؐ نے عیسائیوں کا بھی مقابلہ کیا جو مسیح ناصری کو ابن اللہ کہتے تھے۔آپؐ نے یہود کا بھی مقابلہ کیا جو عزیر کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔آپؐ نے مجوسیوں کا بھی مقابلہ کیا جو آگ کے پجاری تھے۔اور آخر عرب

میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں توحید کو غالب کر کے دکھا دیا اور بتوں کے پرستاروں کو خدائے واحد کے آستانہ پر لا ڈالا۔ پھر جب آپؐ کی وفات کا وقت آیا تو حدیثوں میں آتا ہے کہ آپؐ کرب واضطراب کے ساتھ کبھی ایک کروٹ بدلتے اور کبھی دوسری اور بار بار فرماتے خدا تعالیٰ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا اِس طرح آپؐ نے صحابہؓ کو نصیحت فرمائی کہ دیکھنا میری قبر کو کبھی سجدہ گاہ نہ بنانا۔ دیکھنا میرے بشر ہونے کے مقام کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ چنانچہ آپؐ کی اِسی تعلیم اور تعہد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا کے ہر شہر اور ہر گاؤں اور ہر قریہ میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکیوں میں پانچ مرتبہ یہ آواز بلند ہوتی سُنائی دیتی ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ غرض رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابہؓ نے توحید کا جھنڈا اتنی مضبوطی سے بلند کیا کہ وہ آج تک اپنی پوری شان کے ساتھ دنیا میں لہرا رہا اور کفار کے سینوں میں ناسور ڈال رہا ہے۔ پس عبادالرحمٰن کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ شرک کے کبھی قریب نہیں جاتے اور خدا تعالیٰ کی توحید کو زمین پر پھیلانے کے لئے ہر قسم کی جائز کوششیں عمل میں لاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ شرک خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے بالکل منافی ہے۔

اِسی طرح عبادالرحمٰن کی ایک اور علامت یہ بتائی کہ وہ کسی کو ناجائز طور پر قتل نہیں کرتے۔ یہ علامت بھی اپنی پوری شان کے ساتھ ہمیں صحابہؓ کے مقدس وجود میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس حکم پر اتنی سختی سے عمل کرتے تھے کہ وہ باوجود اس کے کہ وہ ایسی اقوام سے برسرِ پیکار رہے جو بزورِ شمشیر اُن سے اپنا مذہب بدلوانا چاہتی تھیں۔ پھر بھی اُن کی تلوار صرف اُن افراد پر اُٹھتی تھی جو عملاً جنگ میں شامل ہوں۔

کسی عورت، کسی بچے، کسی بوڑھے، کسی راہب اور کسی پنڈت یا پادری پر نہیں اٹھتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام صرف لڑنے والے افراد سے جنگ کرنا جائز قرار دیتا ہے۔ دوسرے افراد کو قتل کرنا خواہ وہ دشمن قوم سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں جائز قرار نہیں دیتا۔ آج دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں جو اپنے آپ کو عدل و انصاف کا علمبردار قرار دیتی ہیں اور جن کا وجود امنِ عالم کے قیام کی ضمانت سمجھا جاتا ہے اُن کی یہ کیفیت ہے کہ وہ دشمن اقوام کو ہمیشہ ایٹمی ہتھیاروں سے ہلاک کرنے کی دھمکی دیتی رہتی ہیں بلکہ عملاً گزشتہ جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں بے گناہ جاپانی مردوں اور عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اسے امنِ عالم کے قیام کے لئے ایک بڑا بھاری کارنامہ قرار دے کر اسے سراہا گیا لیکن رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں کہیں ایسا ظلم دکھائی نہیں دیتا کہ برسرِ پیکار ہونے کی حالت میں بھی انہوں نے بے گناہ مردوں اور عورتوں اور بچوں کو تہہ تیغ کیا ہو۔ مگر یہ لاکھوں افراد کے ناجائز خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والے تو عدل و انصاف کے مجسمہ کہلاتے ہیں اور وہ مسلمان جنہوں نے اپنے پاؤں تلے کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہیں مسلا تھا انہیں یہ لوگ ڈاکو اور لٹیرا قرار دیتے ہیں۔

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

پھر فرماتا ہے عبادالرحمٰن کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو کوئی ایسا کرے وہ اپنے وبال کو اِس دنیا میں طرح طرح کی بیماریوں یا بدنامیوں کے ذریعہ دیکھ لے گا۔ اور اگلے جہان میں جو اس کو عذاب ملے گا وہ بہت زیادہ ہوگا اور پھر وہاں بھی عذاب کے علاوہ بڑی بھاری رسوائی ہوگی۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے زنا کی حرمت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل: 33) یعنی تم زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ کیونکہ

وہ یقیناً ایک کھلی بے حیائی اور نہایت بُرا راستہ ہے یعنی اوّل تو اس سے دل میں ناپا کی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ جرم کا احساس اور چوری کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے اور دوسرے یہ اُس مقصود کے حصول کے لیے جس کے لئے عورت اور مرد کے تعلقات قائم کئے جاتے ہیں ایک غلط راستہ ہے۔ کیونکہ شہوت کی اصل غرض بقائے نسل کی غرض کو پورا کرنا ہے۔ اور ناجائز تعلقات سے اصل غرض برباد ہو جاتی ہے کیونکہ نسل محفوظ نہیں رہتی یا مشتبہ ہو جاتی ہے پس اس راستہ سے اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر کبھی حاصل ہو جائے تو سیدھے راستہ کو ترک کر کے ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا کون سی عقلمندی ہے ہاں جو توبہ کریں گے اور رسمی ایمان کی بجائے حقیقی ایمان اپنے اندر پیدا کر لیں گے اور ایمان کے مناسب حال عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کی بدنامیوں کو نیک نامیوں سے، اُن کی ذلت کو عزت سے اور اُن کے دکھوں کو انعام سے بدل دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور جو شخص توبہ کرے اور اس کے مناسب حال عمل کرے تو اس کی یہ علامت نہیں کہ وہ صرف مُنہ سے توبہ کرے بلکہ اس کی علامت یہ ہے کہ اس شخص کا دل خدا تعالیٰ کی طرف جھکتا چلا جائے۔

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی مغفرت کے لئے توبہ پر زور دیا ہے۔ اور ایمان اور عمل صالح کا حصول اِس کے بغیر ناممکن قرار دیا ہے۔ مگر دنیا میں بہت لوگ ہیں جو توبہ کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف مُنہ سے یہ کہہ دینے سے کہ ''میری توبہ'' توبہ مکمل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے لئے سات امور کا ہونا ضروری ہے اور جب تک وہ سارے کے سارے موجود نہ ہوں اُس وقت تک توبہ کبھی بھی صحیح معنوں میں توبہ نہیں کہلا سکتی چنانچہ توبہ کے لئے پہلی شرط تو یہ ہے کہ انسان اپنے گزشتہ گناہوں کو یاد کر کے اور اُن کو اپنے سامنے لا کر اس قدر نادم ہو کہ گویا

پسینہ پسینہ ہو جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ پچھلے فرائض جس قدر رہ چکے ہیں اُن میں سے جن کو ادا کیا جا سکے اُن کو ادا کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً اگر صاحب استطاعت ہونے کے باوجود اُس نے حج نہیں کیا تھا تو اب حج کر لے یا اگر زکوٰۃ نہیں دی تھی تو ساری عمر کو جانے دے اُسی سال کی زکوٰۃ دے دے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ پچھلے گناہوں میں سے جن کا ازالہ ممکن ہو اُن کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً اگر کسی کی بھینس چُرا کر اُس نے اپنے گھر رکھی ہوئی ہو تو اُسے واپس کر دے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی دکھ پہنچایا ہو اُس کے دُکھ کا ازالہ کرنے کے علاوہ اُس سے معافی طلب کرے۔ یہ ایک باریک روحانی مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندوں کے گناہوں کی معافی کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ اُن کے متعلق بندوں سے ہی معافی طلب کی جائے اور اگر وہ معاف کر دیں تو پھر خدا تعالیٰ اُن کا مؤاخذہ نہیں کرتا۔ شبلیؒ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں وہ خلافت عباسیہ کے دور میں کسی علاقہ کے گورنر تھے۔ ایک دفعہ وہ کسی کام کے سلسلہ میں بادشاہ سے مشورہ کرنے کے لئے بغداد آئے۔ انہی دنوں ایک بہت بڑا جرنیل ایران کی مہم میں کامیابی حاصل کر کے واپس آیا اور بادشاہ نے اُس کے اعزاز میں دربار خاص منعقد کیا اور فیصلہ کیا کہ بھرے دربار میں اُسے خلعتِ فاخرہ دی جائے اور اُس کی عزت افزائی کی جائے۔ اتفاق سے اس روز اُسے نزلہ کی شکایت تھی۔ جب اُسے خلعت دیا گیا اور دربار میں چاروں طرف سے اُس پر پھول برسائے جانے لگے تو اُسے چھینک آ گئی۔ اور ناک سے پانی بہہ پڑا۔ اُس نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر رومال موجود نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر اُس نے گھبراہٹ میں اُسی خلعت سے اپنی ناک پونچھ لی۔ بادشاہ نے اُسے دیکھ لیا اور اُس نے سخت غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس شخص نے ہمارے خلعت کی ناقدری کی ہے اُس کا خلعت اُتار لو اور اسے دربار سے نکال دو۔ چنانچہ اُس کا خلعت اُتار لیا گیا اور اُسے ذلت کے

ساتھ دربار سے نکال دیا گیا۔ شبلیؒ جو یہ تمام نظارہ دیکھ رہے تھے یکدم اُن کی چیخ نکلی اور انہوں نے زار وقطار رونا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ رونے کا کون سا مقام ہے ناراض تو میں جرنیل پر ہوا ہوں تم خواہ نخواہ کیوں روتے ہو۔ وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ حضور میرا استعفیٰ منظور فرمائیں۔ بادشاہ نے پھر کہا۔ یہ استعفیٰ کا کون سا موقع ہے۔ انہوں نے کہا بادشاہ سلامت! یہ شخص آج سے دو سال پہلے ایک خطرناک مہم پر روانہ کیا گیا تھا۔ یہ رات اور دن دشمن کے مقابلہ میں رہا۔ ہر روز موت اس کے سر پر منڈلاتی تھی اور ہر رات اس کی بیوی بیوگی کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے سوتی تھی۔ یہ گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن رہا۔ جنگلوں میں دھکے کھاتا رہا۔ مصائب اور آلام برداشت کرتا رہا اور آخر فتح یاب ہو کر واپس آیا۔ آپ نے اس کی آمد کی خوشی میں یہ دربار منعقد کیا اور اُسے چند گز کپڑا خلعت کے طور پر عطا فرمایا۔ مگر صرف اس لئے کہ اُس نے اس خلعت سے اپنی ناک پونچھ لی آپ اتنے غضب ناک ہوئے کہ آپ نے اُسے دربار سے باہر نکال دیا۔ اور اُس کا خلعت چھین لیا۔ میں اس نظارہ کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ جب چند گز کپڑے کی آپ ہتک برداشت نہیں کر سکے تو میرا خدا جس نے مجھے کروڑوں کروڑ نعمتیں عطا فرمائی ہوئی ہیں اور جس کی نعمتوں کی میں روزانہ ہتک کرتا ہوں وہ قیامت کے دن مجھ سے کیا سلوک کرے گا۔ میں اب اس ملازمت سے باز آیا۔ میرا استعفیٰ قبول کیجئے۔ میں اب اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہی بسر کروں گا۔ چنانچہ وہ استعفیٰ دے کر چلے گئے اور پھر اپنے گناہوں کی معافی کے لئے مختلف بزرگوں کے پاس گئے مگر وہ اتنے ظالم مشہور تھے کہ کسی نے اُن کی بیعت لینے کی جرأت نہ کی۔ آخر وہ حضرت جنیدؒ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے فرمایا تمہاری توبہ قبول ہو سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ پہلے تم اُس شہر میں واپس جاؤ جہاں تم گورنر رہے تھے اور ایک ایک دروازہ پر پہنچ کر لوگوں سے اپنے

گناہوں کی معافی مانگواور جب سب لوگوں سے معافی لے چکوتو پھر میرے پاس آؤ۔ چنانچہ وہ اس علاقہ میں گئے اور انہوں نے گھر گھر پھر کرلوگوں سے معافیاں لینی شروع کیں۔ پہلے تو لوگ سمجھے کہ یہ رسمی طور پر معافی مانگ رہے ہیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ شبلیؒ معافی بھی مانگتے ہیں اوراپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بھی بہاتے ہیں تو انہوں نے سمجھ لیا کہ آج اس شخص کے دل پر بھی خدائے رحمٰن کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ چنانچہ پھر تو یہ کیفیت ہوئی کہ جب وہ معافی مانگتے تو لوگ کہتے آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ تو ہمارے قابل احترام بزرگ ہیں۔ غرض اس طرح انہوں نے گھر گھر پھر کر معافی حاصل کی اور پھر وہ حضرت جنیدؒ کے پاس آئے۔ حضرت جنیدؒ نے جب دیکھا کہ انہوں نے سچے طور پر توبہ کر لی ہے تو انہوں نے اُس کی بیعت قبول کی اور پھر اُن کی تربیت میں انہوں نے اتنی بڑی ترقی کی کہ آج شبلیؒ بھی اولیاءامت میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ پس توبہ کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو کوئی دُکھ پہنچایا ہو اور اُن کی رضا حاصل کرنا ممکن ہو اُن سے معافی طلب کی جائے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ بڑا ستار ہے وہ انسان کی بڑی بڑی برائیوں پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ اپنی ستاری آپ بھی کرے اور وہ گناہ جن کو خدا تعالیٰ نے چھپا رکھا ہو اُن کو خود ظاہر نہ کرے مثلاً کسی کی چوری کی ہو تو اُسے یہ نہیں چاہیئے کہ خود جا کر اُسے بتلائے کہ میں نے تمہاری چوری کی تھی۔ ایسا کرنا بجائے خود گناہ ہوگا۔ ہاں بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو اور لوگوں کو بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر وہ کسی کو گالی دیتا ہے یا کسی کو پیٹنے لگ جاتا ہے تو اُس کا اوروں کو بھی علم ہوتا ہے۔ ایسے گناہوں کا ازالہ کرنا چاہیئے اور جن لوگوں کو دُکھ پہنچایا گیا ہو اُن سے معافی طلب کرنی چاہیئے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کو اُس نے نقصان پہنچایا ہو اُن سے مقدور بھر

احسان کرے اور اگر کچھ نہیں کر سکتا تو اُن کے لئے دعا ہی کرے۔ اولیاء کرام نے بھی لکھا ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کا مال ناجائز طور پر لیا ہو اور اُس کے ادا کرنے کی طاقت نہ ہو۔ تو وہ خدا تعالیٰ سے دُعا کرے کہ الٰہی مجھے تو اس کا مال دینے کی طاقت نہیں تو اپنے پاس سے ہی اسے دے دے اور اس کمی کو پورا فرما دے۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عہد کرے اور فیصلہ کرے کہ اب میں کوئی گناہ نہیں کروں گا۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو نیکی کی طرف رغبت دلانا شروع کر دے۔ اور اپنے دل کو پاکیزہ بنانے کی کوشش کرے۔ تا کہ آئندہ ہر قسم کے نیک کاموں میں وہ دلی شوق سے حصہ لے سکے۔

یہ سات باتیں توبہ کے لئے ضروری ہیں۔ جب تک یہ تمام شرائط نہ پائی جائیں کوئی توبہ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

بعض لوگ توبہ کے مسئلہ کے متعلق اپنی نادانی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ توبہ کا دروازہ کھولنے سے بدی کا دروازہ بھی ساتھ ہی کھل جاتا ہے۔ اور بجائے اخلاق میں ترقی کرنے کے انسان بداخلاقی کے ارتکاب پر اور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں جب چاہوں گا۔ توبہ کرلوں گا اور خدا سے صلح کرلوں گا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط اور توبہ کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے "جب چاہوں گا توبہ کرلوں گا" کا خیال کبھی ایک عقلمند انسان کو دل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُسے کیا معلوم ہے کہ میں کب مروں گا۔ اگر چانک موت آجائے تو توبہ کس وقت کرے گا۔

علاوہ ازیں توبہ کی حقیقت کو یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ توبہ کوئی آسان امر نہیں اور نہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے توبہ کرے۔ کیونکہ توبہ اس عظیم الشان تغیر کا نام ہے جو انسان کے قلب کے اندر پیدا ہو کر اس کو بالکل گداز کر دیتا

اور اُس کی ماہیت کو ہی بدل ڈالتا ہے۔توبہ کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اپنے پچھلے گناہوں پر شدید ندامت کا اظہار کرنے اور آئندہ کے لئے پورے طور پر خدا تعالیٰ سے صلح کر لینے اور اپنی اصلاح کا پختہ عہد کر لینے کے ہیں۔اب یہ حالت یکدم کِس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔یہ حالت تو ایک لمبی کوشش اور محنت کے نتیجہ میں پیدا ہو گی۔ہاں شاذ و نادر کے طور پر یکدم بھی پیدا ہو سکتی ہے۔مگر جب بھی ایسا ہو گا کسی عظیم الشان تغیر کی وجہ سے ہو گا جو آتش فشاں مادہ کی طرح اُس کی ہستی کو ہی بالکل بدل دے۔اور ایسے تغیرات بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہیں۔پس توبہ کی وجہ سے کوئی شخص گناہ پر دلیر نہیں ہو سکتا۔بلکہ توبہ اصلاح کا حقیقی علاج اور مایوسی کو دور کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے جو انسان کو کوشش اور ہمت پر اکساتا ہے اور یہ دھوکہ کہ توبہ گناہ پر اکساتی ہے محض عربی زبان کی ناواقفیت اور اس خیال کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے کہ توبہ اس امر کا نام ہے کہ انسان کہہ دے کہ یا اللہ میرے گناہ معاف کر حالانکہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کا نام توبہ نہیں بلکہ استغفار ہے۔توبہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کو نہیں کہتے۔بلکہ گناہوں کی معافی سچی توبہ کا صحیح نتیجہ ہوتا ہے۔اور اس دروازہ کو کھول کر اسلام نے انسانی رُوح کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ اُس کے لئے لامتناہی ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے کیونکہ جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ اُس کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہے اور وہ بھی پاکیزگی حاصل کر سکتا اور خدا تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہتا ہے اور آخر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اُس کی رُوح ہر قسم کی سفلی آلائشوں سے پاک ہو کر عالم بالا کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے۔

۞ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ (الفرقان:73)

رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ زُور کے ساتھ گواہی نہیں

دیتے۔ زور کے ایک معنے ...... جھوٹ کے بھی ہیں پس اِس لحاظ سے لَایَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ کے معنے یہ ہیں کہ لَایَشْھَدُوْنَ بِالزُّوْرِ یا لَایَشْھَدُوْنَ شَھَادَۃَ الزُّوْرِ یعنی عبادالرحمٰن کی ایک یہ علامت ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید کے بعد سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا مشکل کام جو اس دنیا میں انسان کے سامنے پیش آتا ہے وہ سچائی ہی ہے۔ ہزاروں انسان ایسے دیکھے جاتے ہیں جو رحم کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ انصاف کرنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں گواہی دینی پڑے اور وہ یہ دیکھیں کہ اُس کے نتیجہ میں اُن کی اپنی ذات کو یا اُن کے کسی رشتہ دار اور دوست کو نقصان پہنچے گا تو وہ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور تبدیلی کر دیں گے۔ اور یہ مرض اس قدر پھیل گیا ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ بڑی دلیری کے ساتھ قسمیں کھا کھا کر جھوٹ بولتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات پر ناراض بھی ہوتے ہیں کہ اُن کے جھوٹ کو سچ کیوں نہیں مانا جاتا۔ عدالتوں میں پہلے یہ رواج تھا کہ گواہ کے ہاتھ میں قرآن کریم دے کر اُس سے قسم لیتے تھے اور اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ قرآن کریم میں جو وعید نازل ہوئے ہیں انہیں مدنظر رکھتے ہوئے میں قسم کھاتا ہوں۔ اور اگر میری قسم جھوٹی ہو تو مذکورہ وعید اور سزائیں مجھے ملیں۔ لیکن ان گواہوں میں سے کئی ایسے ہوتے تھے جو قسم کھا کر بھی جھوٹ بولتے تھے۔ مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم جو ہمارے بڑے بھائی تھے اور ای۔ اے۔ سی تھے۔ وہ اپنا تجربہ سُنایا کرتے تھے کہ جتنے جوش سے کوئی شخص قرآن کریم ہاتھ میں لے کر میرے سامنے گواہی دیتا تھا۔ میرے تجربہ میں اُتنا ہی وہ جھوٹا ہوتا تھا۔ وہ ایک لطیفہ سُنایا کرتے تھے کہ ایک شخص جو میرا اچھا واقف تھا اُس کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا۔ وہ کہنے لگا مجھے کوئی اور تاریخ دی جائے۔ کیونکہ جو گواہ میں نے پیش کرنے تھے وہ فلاں وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ میں نے ہنس کر کہا میں تو تمہیں بڑا عقلمند اور ہوشیار آدمی

سمجھا کرتا تھا۔ لیکن اب میری طبیعت پر یہ اثر ہوا ہے کہ تم بڑے بیوقوف ہو۔ وہ کہنے لگا۔ کیوں میں نے کہا۔ گواہوں کے لئے جگہ اور وقت کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تمہارے پاس کچھ ہے تو روپیہ اٹھنی دے کر بعض آدمی گواہی کے لئے لے آؤ۔ چنانچہ وہ باہر چلا گیا اور عملی طور پر تھوڑی دیر کے بعد ہی کچھ گواہ لے آیا گواہی لیتے وقت میں ہنستا بھی جاؤں اور اُن سے مذاق بھی کرتا جاؤں۔ وہ لوگ قرآن کریم سر پر رکھ کر اور قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے۔ کہ واقعہ یوں ہوا ہے حالانکہ تھوڑی دیر ہوئی۔ میں نے خود مدعی کو اس غرض کے لئے باہر بھیجا تھا کہ وہ کچھ دے دلا کر چند گواہ لے آئے جب وہ گواہی دے چکے تو میں نے اُنہیں پکڑا اور اُن سے کہا کہ تم بڑے کذاب ہو۔ تمہیں واقعہ کا کچھ بھی علم نہیں لیکن محض چند ٹکوں کی وجہ سے تم اتنا جھوٹ بول رہے ہو کہ قرآن کریم کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جس قوم کے افراد کی یہ حالت ہو اُس کا یہ شور مچانا کہ ہم جیتتے کیوں نہیں بالکل غلط بات ہے۔ دنیا میں وہی قومیں جیتا کرتی ہیں جن میں صداقت اور راست بازی ہوتی ہے۔ میں ساری دنیا کو دیکھتا ہوں کہ اُنہوں نے مشق کے ساتھ اپنے اندر سچائی کی اتنی عادت پیدا کر لی ہے کہ جہاں حکومت کی خاطر وہ ہر قسم کا جھوٹ بول لیتے ہیں وہاں جب ذاتیات کا سوال آتا ہے تو وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ کی ترقی سائنس کی وجہ سے ہوئی ہے حالانکہ اُن کی ترقی نہ سائنس کی وجہ سے ہوئی ہے اور نہ گولہ بارود کی وجہ سے ہوئی ہے بلکہ اُن کی ترقی محض اخلاق کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انگریزی عدالتوں میں چلے جاؤ اور وہاں اُن کے واقعات دیکھو۔ جج پوچھتا ہے۔ تم نے یہ جرم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ہاں کیا ہے۔ پھر پوچھتا ہے تم فلاں جگہ پر تھے۔ وہ کہتا ہے جی ہاں تھا۔ ہماری عدالت میں چلے جاؤ۔ چور کو پولیس والے عین سیندھ کے اوپر سے پکڑ کر لاتے ہیں اور جج پوچھتا ہے۔ تم وہاں تھے تو وہ کہتا ہے۔ میں تو اس محلّہ میں تھا ہی نہیں۔ تم کہاں تھے۔ وہ کہتا

ہے میں تو فلاں شہر میں تھا۔ پھر وہ پوچھتا ہے۔ ارے پولیس نے تم کو وہاں سے نہیں پکڑا۔ وہ کہتا ہے جھوٹ ہے۔ ان کو مجھ سے فلاں پرانی عداوت تھی اس کی وجہ سے یہ مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں۔ غرض شروع سے لے کر آخر تک جھوٹ ہی جھوٹ چلتا ہے اور وہاں گو مجرم اپنے بچاؤ کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ٹرِک (Trick) بھی کرتا ہے۔ لیکن غیر ضروری ٹرِک (Trick) نہیں کرتا اور یہاں غیر ضروری جھوٹ بولا جاتا ہے۔ مثلاً چوری کے ساتھ اس امر کا کوئی تعلق نہیں کہ اُس نے اُس وقت کالا کوٹ پہنا ہوا تھا یا لال لیکن اگر وہ کہیں گے کہ کالا کوٹ پہنا ہوا تھا تو یہ کہے گا نہیں میں نے تو لال پہنا ہوا تھا یا مثلاً وہ کہہ دیں گے کہ تمہارے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اب اس کا چوری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن یہ کہے گا۔ نہیں میرے ہاتھ میں چھڑی نہیں تھی۔ میرے ہاتھ میں قرآن تھا۔ غرض یہ غیر ضروری جھوٹ جس کا مقدمہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی یہ بولتا ہے اور ہر بات میں اُن کی تردید کرتا چلا جائے گا اور کہے گا یہ نہیں تھا وہ تھا۔ لیکن یورپ میں چلے جاؤ سو میں سے ننانوے باتیں ملزم مان لے گا۔ کوئی ایک اپنی جان بچانے کے لئے ٹرِک (Trick) بھی کر جائے گا۔ لیکن باقی سب باتوں کے متعلق کہے گا کہ ٹھیک ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا کچھ نہ کچھ باعث آجکل کی اخلاقی حالت بھی ہے جن لوگوں کے سامنے آجکل مقدمات پیش ہوتے ہیں وہ سچ کی قیمت نہیں سمجھتے وہ خیال کرتے ہیں کہ اس نے جتنا سچ بولا ہے مجبوراً بولا ہے ورنہ اور سچ ابھی اس کے پیچھے ہے۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے کو تھپڑ مار دیا۔ وہ کہتا ہے میں نے تھپڑ اس لئے مارا تھا کہ مجھے اشتعال آ گیا تھا۔ لیکن اب بجائے اِس کے کہ جج اس کی قدر کرے اور کہے کہ اس نے سچ بولا ہے وہ کہتا ہے کہ اِس نے ضرور پانچ تھپڑ مارے ہوں گے۔ صرف ایک تھپڑ کا اس نے اقرار کیا ہے۔ غرض جھوٹ دنیا میں اتنا سرایت کر گیا ہے۔ کہ کیا جج اور کیا وکیل اور کیا دوسرے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی شخص سو فیصدی

بھی سچ بول سکتا ہے۔ چونکہ اُن کا اپنا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ اُن کے دوست اور رشتہ دار جھوٹ بولتے ہیں اس لئے اگران کے سامنے کوئی سچ بولے تو اس کی بھی قدر نہیں کی جاتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ لوگ ضرور بولتے ہیں اس لئے اس نے بھی کچھ نہ کچھ جھوٹ ضرور بولا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سچ بولنے والا گھبرا جاتا ہے اور گھبرا کر وہ خود بھی جھوٹ بولنے لگ جاتا ہے۔ لیکن مومن کو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ اُس کے گرد وپیش کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ بلکہ اُسے یہ دیکھنا چاہئے کہ خدا کیا کہتا ہے۔ آخر ایمان کے کچھ نہ کچھ معنے تو ہونے چاہئیں۔ جب ایک شخص ایمان کی وجہ سے ساری دنیا سے لڑائی جھگڑا کرتا ہے فساد مول لیتا ہے تو اس کے کچھ معنے تو ہونے چاہئیں۔ اور ایمان کے کم سے کم معنے یہ ہیں کہ ایک انسان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے خدا دوسری چیزوں سے مقدم ہے۔ اب جن چیزوں کو وہ موخر قرار دیتا ہے اگر اُن کو مقدم کرنے لگ جائے تو اس کا ایمان کہاں باقی رہا۔ ایک طرف خدا کہتا ہے کہ سچ بولو۔ اور دوسری طرف اس کے ساتھی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولو، چاہے وہ مُنہ سے کہیں یا عمل سے دنیا میں دونوں طریق ہوتے ہیں۔ کبھی انسان دوسرے کو کہتا ہے کہ جھوٹ بولو اور کبھی دوسرا جھوٹ بولتا ہے۔ تو اُسے منع نہیں کرتا۔ اور اس طرح جھوٹ کی تائید کرنے والا بن جاتا ہے۔ بہرحال خدا کا منشاء یہ ہے کہ ہم سچ بولیں۔ اب اگر ہم جھوٹ بولیں اور سچائی کو چھپائیں تو ہماری نگاہ میں خدا کی کوئی قدر نہ رہی۔ یا یوں کہو کہ ہم خدا کی بادشاہت کو قائم کرنے کی بجائے شیطان کی بادشاہت کو دنیا میں قائم کرنے والے بن جائیں گے۔ خدا کی بادشاہت تو اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے جب سچی گواہی دیتے وقت انسان نہ اپنے باپ سے ڈرے نہ اپنے بیٹے سے ڈرے۔ نہ ماں سے ڈرے۔ نہ بھائی سے ڈرے۔ نہ دوست سے ڈرے اور نہ کسی اور رشتہ دار سے ڈرے۔ ایک باپ اگر جھوٹ کی جرأت کرتا ہے تو اسی لئے کہ وہ سمجھتا ہے میرا بیٹا میری تائید کرے گا

یا میری بیوی میری تائید کرے گی ۔لیکن اگر عدالت میں معاملہ پیش ہو اور بیٹا کہے کہ یہ ہیں تو میرے باپ لیکن انہوں نے یہ بات کی ہے ۔ بیوی کہے کہ یہ ہیں تو میرے خاوند لیکن انہوں نے یہ بات کی ہے ۔تو دوسرے ہی دن وہ جھوٹ چھوڑ دے گا ۔وہ اگر جھوٹ بولتا ہے تو اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے اس کے افعال پر پردہ پڑا رہے گا ۔ بھائی اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ دوسرا بھائی اُس کی ہاں میں ہاں ملا دے گا ۔ بیٹا اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میرا باپ میری تائید کرے گا ۔خاوند اس لئے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میری بیوی میرے عیب کو چھپائے گی میری تائید کرے گی بیوی اگر جھوٹ بولتی ہے تو اس لئے کہ وہ سمجھتی ہے میرا خاوند میرا ساتھ دے گا ۔لیکن اگر وہ سچے مسلمان ہوں تو باپ کے خلاف بیٹا گواہی دینے کے لئے کھڑا ہو جائے گا ۔اور خاوند کے خلاف بیوی گواہی دینے کے لئے کھڑی ہو جائے گی اور وہ بالکل گھبرا جائے گا ۔اور کہے گا ایسی حالت میں میرا جھوٹ بولنا بے فائدہ ہے اور اس رُوح کا اپنے اندر قائم کرنا کوئی بڑی بات نہیں ۔اگر ہر بچہ ، ہر بوڑھا ، ہر جوان ، ہر مرد اور ہر عورت یہ عہد کرے کہ میں نے سچ بولنا ہے چاہے اس کے نتیجہ میں میں کسی مقدمہ میں پھنس جاؤں یا پھانسی پر چڑھ جاؤں تو تھوڑے دنوں میں ہی تم اپنے اندر ایک عظیم الشان تغیر محسوس کرنے لگو گے ۔ یہ مت خیال کرو کہ سچ بولنے پر پھانسی ملتی ہے ۔ جو شخص سچ بولنے والا ہو وہ ایسے کام ہی نہیں کرتا جن کے نتیجہ میں اُسے پھانسی ملے ۔لیکن جھوٹ بولنے والا سمجھتا ہے کہ اگر مَیں نے جھوٹ بولا تو شائد بچ جاؤں اس لئے وہ دلیری سے ایسے افعال میں مبتلاء ہو جاتا ہے جن کا نتیجہ بعض دفعہ نہایت خطرناک ہوتا ہے اور یا پھر سچ بولنے والا اُس وقت پھانسی چڑھتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ اب میرا مذہبی فرض ہے کہ میں اپنی جان پیش کر دوں ۔ پھر وہ دلیری کے ساتھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے بے شک پھانسی دے دو ۔

غرض سچائی ایک بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ انبیاء نے اس پر خاص زور دیا ہے اور انسانی اخلاق کا یہ ایک بنیادی حصہ ہے۔ مگر آجکل سیاسی اور قومی مفاد کی خاطر جھوٹ کو جھوٹ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ اُسے ایک نہایت ضروری چیز قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جھوٹ فطرت کے خلاف ہے۔ جھوٹ اس چیز کا نام ہے کہ کان نے جو کچھ سُنا ہو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ میں نے نہیں سُنا۔ آنکھ سے جو دیکھا ہو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ میں نے نہیں دیکھا ہاتھ نے ایک چیز اٹھائی ہو لیکن انسان یہ کہہ دے کہ میرے ہاتھ نے فلاں چیز نہیں اُٹھائی۔ ایک شخص کے پاؤں ایک طرف چلیں۔ لیکن وہ کہہ دے کہ میرے پاؤں اس طرف نہیں چلے۔ گویا انسان غیر کی نہیں اپنی تردید کرتا ہے۔ اور اس سے زیادہ فطرت کے خلاف اور کیا چیز ہوگی۔ شبہ اس چیز میں ہوسکتا ہے جس میں قیاس کا دخل ہو۔ حواسِ خمسہ کے افعال پر شبہ نہیں کیا جاسکتا اور حواس خمسہ کے افعال کے خلاف بات کہنے کو جھوٹ کہتے ہیں۔ جو شخص حواس خمسہ کی تردید کرتا ہے وہ گویا اپنی زبان۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ ناک اور کان کی تردید کرتا ہے اور پھر وہ اس میں سب سے زیادہ لذت محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے خلاف آپ گواہی دے رہا ہے۔ ایک انسان کے ہاتھ ایک چیز کو پکڑتے ہیں اور وہ کہتا ہے میں نے فلاں چیز نہیں پکڑی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو کہتا ہے تم نے فلاں چیز نہیں پکڑی۔ ایک چیز اس کی زبان چکھتی ہے لیکن وہ کہتا ہے میں نے فلاں چیز نہیں چکھی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں چیز نہیں چکھی یا اس کے کان ایک بات سُنتے ہیں اور وہ اس کا انکار کردیتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کانوں سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں بات نہیں سُنی۔ اب یہ کتنی مضحکہ خیز اور عجیب بات ہے۔ مگر لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور موقعہ آنے پر جھوٹ بول دیتے ہیں۔ اور اگر ایک جھوٹ بولے تو دوسرا اس کی تائید کرنے لگ جاتا ہے۔ قاضی کے

سامنے معاملہ جائے گا تو بیٹا کہے گا کہ میرا باپ تو وہاں تھا ہی نہیں وہ تو فلاں جگہ تھا۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح عورتوں میں بھی جھوٹ کا مرض زیادہ پایا جاتا ہے۔ بلکہ اُن میں جھوٹ کی عادت مردوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے اِسی لئے رسول کریم ﷺ بیعت لیتے وقت عورتوں سے یہ عہد لیا کرتے تھے کہ ہم جھوٹے اتہام نہیں باندھیں گی (الممتحنہ:13) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب عورتوں میں اتہام لگانے کی عام عادت تھی۔ پھر اُن کے جھوٹ بولنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بچوں کو بھی اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہماری ماں جھوٹ بولتی ہے تو ہم کیوں نہ بولیں۔ اور پھر وہ ایسے ایسے جھوٹ بولتے ہیں کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں دو دوست آپس میں اکھٹے ہوئے تو اُن میں سے ایک نے کہا کہ اپنے اپنے خاندان کی کوئی بات سُناوٴ۔ اِس پر ایک کہنے لگا۔ کہ اب تو وہ بات نہیں رہی۔ ہم تو بڑے رئیس ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ہمارے نانا کا اتنا بڑا طویلہ تھا کہ جب قحط پڑا کرتا تو سارے شہر کے جانور اُس کے ایک کونے میں سما جاتے تھے۔ دوسرا کہنے لگا ہمارے نانا جان کے پاس ایک ایسا بانس تھا کہ جب کبھی بارش نہ ہوتی تو وہ بانس سے بادلوں کو چھید کر بارش برسا لیتے۔ دوسرے کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا تمہارے نانا جان یہ بانس رکھا کہاں کرتے تھے وہ کہنے لگا تمہارے نانا جان کے طویلہ میں۔ اور کہاں؟ اب دیکھو۔ یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے جو اُن دونوں نے بولا۔ اسی طرح میں نے ایک دفعہ قصہ پڑھا کہ ایک انگریز کی لڑکی سکول میں داخل ہوئی۔ اُدھر سے ایک حلوائی کی لڑکی بھی داخل ہو گئی۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ تو حلوائی کی لڑکی کہنے لگی کہ میرے ابا ڈپٹی ہیں۔ دوسری کہنے لگی کہ میرے ابا بڑے بینکر ہیں۔ ساہوکارہ کام ہے اور بیسیوں ہمارے مکان ہیں۔ ایک دفعہ اُس نے اپنی سہیلی کی دعوت کر دی۔ اب بینکر کی لڑکی کے ہاں نوکر تو تھے نہیں۔ اُن سے اپنے بھائی بہنوں کو نوکر بنایا پیسٹری رکھی بازار سے چائے

کے برتن منگوائے اور جب ڈپٹی کی لڑکی آئی تو دونوں طرف سے باتیں ہونے لگیں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ہمسائی آئی۔ جب اُس کی نظر دوسری لڑکی پر پڑی تو کہنے لگی۔ یہ تو ہمارے انگریز بھائی کی لڑکی ہے حلوائی کی لڑکی کہنے لگی۔ یہ تو بینکر کی لڑکی ہے۔ وہ کہنے لگی۔ بالکل غلط ہے۔ یہ تو ہمارے محلّہ کے فلاں انگریز کی لڑکی ہے اب یہ پاکھنڈ صرف اس لئے بنایا گیا کہ وہ اس کو امیر سمجھے اور یہ اُس کو۔ مگر یاد رکھو سچ کے یہ معنے بھی نہیں کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ تم لوگوں میں بیان کرتے پھرو۔ قرآن کریم نے بعض باتوں کے بیان کرنے سے انسان کو روکا ہے۔ پس اگر کوئی شخص اُن امور کو بیان کرتا ہے تو وہ سچ نہیں بولتا بلکہ فتنہ وفساد پھیلاتا ہے۔ سچ کے معنے صرف یہ ہیں کہ اگر تم کوئی بات کہو تو ضرور سچ کہو۔ یہ بات نہیں کہ تم وہ بات ضرور کہو۔ مثلاً اگر کوئی چور تمہارے پاس راز لینے کے لئے آتا ہے تو تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ میں نہیں بتاتا۔ جاؤ نکل جاؤ۔ یہ جھوٹ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ ضرور جھوٹ ہوگا کہ تم اُسے اصل جگہ چھپا کر دوسری جگہ بتادو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کا عیب دیکھتا ہو اور اُسے ہر جگہ بیان کرتا پھرتا ہے تو یہ بھی سچ نہیں بلکہ اپنے بغض وکینہ کا اظہار اور غیبت ہے۔ رسول کریم ﷺ سے ایک دفعہ صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہؐ! کیا کسی کے متعلق سچی بات کا بیان کرنا بھی غیبت ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ یہی تو غیبت ہے۔ ورنہ اگر وہ سچی بات نہ ہو تو اس کا بیان کرنا غیبت نہیں بلکہ جھوٹ ہے۔ پس سچ بولنے کے یہ معنے نہیں کہ دوسروں کی کمزوریوں کو ہر جگہ بیان کرتے پھرو بلکہ سچ بولنے کے یہ معنے ہیں کہ جب قاضی کے سامنے شہادت کا موقع آئے تو بغیر اس بات کا خیال کئے کہ سچا واقعہ بیان کرنے سے تمہارے دوست یا بھائی یا باپ یا بیوی پر کوئی الزام آئے گا۔ تم ہر سوال کا جواب سچ سچ دے دو یہی وجہ ہے کہ شریعت نے حکم دیا ہے کہ گواہی صرف قاضی لے کیونکہ بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں شریعت کہتی ہے کہ

گواہی نہ لو۔اَب اگر گواہی لینے والا قاضی نہ ہو۔تو ہوسکتا ہے وہ کوئی ایسی بات پوچھ لے جس کے پوچھنے کی شریعت نے اُسے اجازت نہیں دی اور اِس طرح فتنہ پھیل جائے۔پس سچ کے یہ معنے نہیں کہ جو کچھ تم دیکھواُسے ضرور بیان کرواور نہ سچ کے یہ معنے ہیں کہ تم جو کچھ دیکھواُسے ہرایک کے سامنے بیان کرو۔اگر غیر قاضی تم سے سوال کرتا ہے تو تم کہہ دو میں نہیں بتاتا۔اِسی طرح اگر تم کسی شخص کوکوئی جرم کرتے دیکھتے ہو تو تمہارا اُس پر پردہ ڈال دینا سچ کے خلاف نہیں تمہارا سچ کے خلاف فعل اس وقت متصور ہوگا۔جب قاضی یا قائم مقام قاضی یا جسے شریعت نے اپنے دائرہ میں گواہی لینے کا حق دیا ہے۔تم سے دریافت کرے اورتم سچ نہ بولو۔لیکن اگر وہ تمہیں گواہی کے لئے نہ بُلائے تو خواہ وہ بات درست ہی ہواُس کا چھپانا سچ کے خلاف نہیں۔بلکہ اِس طرح تم صلح پسند بنتے ہو۔اور فتنہ وفساد سے اپنے آپ کواوراپنی قوم کومحفوظ رکھتے ہو۔

(۲) زُور کے دوسرے معنی جیسے کہ اوپر بتایا جاچکا ہے عقل کے ہیں۔اس لحاظ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا۔کہ رحمٰن کے بندے عقل سے گواہی نہیں دیتے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے عقلی سے گواہی دیتے ہیں۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ واقعات کے مطابق گواہی دیتے ہیں قیاسی گواہی نہیں دیتے۔

(۳) زُور کے تیسرے معنے طاقت کے ہیں۔اِس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ رحمٰن کے بندے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں غریب آدمی کو ذلیل کرنے کے لئے گواہی نہیں دیتے۔

(۴) زُور کے چوتھے معنے شرک کے ہیں۔اِس لحاظ سے وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کے یہ معنے ہوں گے کہ رحمٰن کے بندے شرک کی مجالس میں نہیں جاتے۔

(۵) زُور کے پانچویں معنے مَجْلِسُ الْغِنَاءِ یعنی گانے بجانے کی مجلس کے

ہیں۔اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ رحمٰن کے بندے گانے بجانے کی مجلس میں نہیں جاتے تا کہ اُس کے زہریلے اثرات سے وہ محفوظ رہیں اور خدا تعالیٰ سے غافل ہو کر ہوا وہوس کے پیچھے نہ چل پڑیں۔ اِسی بناء پر مَیں نے اپنی جماعت کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ سینما نہ دیکھا کرے۔کیونکہ اس میں بھی گانا بجانا ہوتا ہے جو انسانی قلب کو خدا تعالیٰ کی طرف سے غافل کر دیتا ہے پہلے یہ چیز تھیٹر میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن جب سے ٹاکی نکل آئی ہے سینما میں بھی یہ چیزیں آگئی ہیں بلکہ تھیٹر سے زیادہ وسیع پیمانہ پر آئی ہیں۔کیونکہ تھیٹر کا صرف ایک شو ہوتا تھا۔جس میں بڑے بڑے ماہرِ فن گویّوں کو بلانا بہت بڑے اخراجات کا متقاضی ہوتا تھا جس کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور پھر ایک شو صرف ایک جگہ ہی دکھایا جا سکتا تھا۔مگر اب ایک شو سے ہزاروں فلمیں تیار کر کے سارے ملک میں پھیلا دی جاتی ہیں۔اور بڑے بڑے ماہرفن گویّوں اور موسیقاروں کو بلایا جاتا ہے۔اس لئے تھیٹر سے سینما کا ضرر بہت زیادہ ہوتا ہے۔رسول کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ گانا بجانا اور باجے وغیرہ یہ سب شیطان کے ہتھیار ہیں۔جن سے وہ لوگوں کو بہکاتا ہے۔مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی اس واضح ہدایت کو بھلا دیا اور وہ اپنی طاقت کے زمانہ میں رنگ رلیوں میں مشغول ہو گئے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر انہیں اپنی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔خلافت عباسیہ تباہ ہوئی تو محض گانے بجانے کی وجہ سے۔ہلاکو خان اپنے لاؤلشکر کے ساتھ منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا بغداد کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور معتصم باللہ ناچ گانے میں مشغول تھا اور بار بار کہتا تھا کہ تم گانے والیوں کو بلاؤ۔بغداد پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔جو حملہ کرے گا وہ خود تباہ ہو جائے گا۔لیکن ہلاکو خان نے پہنچتے ہی سب سے پہلے بادشاہ کو قتل کروایا پھر اُس کے ولی عہد کو قتل کیا اور پھر بغداد پر حملہ کر کے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اٹھارہ لاکھ آدمی قتل کر دئے۔اِسی طرح مغلیہ حکومت

کی تباہی بھی گانے بجانے کا بہت شوقین تھا۔ ''محمد شاہ رنگیلے'' کو رنگیلا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گانے بجانے کا بہت شوقین تھا۔ بہادر شاہ جو ہندوستان کا آخری مغل بادشاہ تھا وہ بھی اسی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوا۔ انگریزوں کی فوجیں کلکتہ سے بڑھ رہی تھیں۔ الٰہ آباد سے بڑھ رہی تھیں۔ کانپور سے بڑھ رہی تھیں۔ میرٹھ سے بڑھ رہی تھیں۔ سہارنپور سے بڑھ رہی تھیں اور بادشاہ کے دربار میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ آخر انگریزوں نے اُس کے بارہ بیٹوں کے سر کاٹ کر اور خوان میں لگا کر اُس کی طرف بھیجے اور کہا کہ یہ آپ کا تحفہ ہے۔ اندلس کی حکومت بھی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوئی۔ مصر کی حکومت بھی گانے بجانے کی وجہ سے تباہ ہوئی۔ مصر پر صلاح الدین ایوبی نے حملہ کیا تو فاطمی بادشاہ اُس وقت گانے بجانے میں ہی مشغول تھا۔ مگر اتنی بڑی تباہی دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کو اب بھی یہی شوق ہے کہ سینما دیکھیں اور گانا بجانا سُنیں اور وہ اپنی تاریخ سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن کریم نے وَالَّذِیْنَ لَایَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ میں بتادیا ہے کہ اگر مسلمان عبادالرحمٰن بننا چاہتے ہیں تو اُن کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ گانے بجانے کی مجالس کو ترک کریں۔ اور خدائے واحد سے لَو لگائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو کامیاب ہو جائیں گے اور اگر نہیں کریں گے تو اس کے تباہ کن نتائج سے وہ محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَاِذَامَرُّوْابِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ عبادالرحمٰن کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ جب وہ لغو باتوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو دنیوی لذات سے متاثر ہو کر اُن میں شامل نہیں ہو جاتے جیسے مسیح کی اُمت ذکر الٰہی کو بھول کر ناچ گانے اور موسیقی میں مشغول ہوگئی بلکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے اُن میں شامل ہوئے بغیر بزرگانہ طور پر وہاں سے گزر جاتے ہیں اور دنیوی لذات پر رضا الٰہی کو مقدم رکھتے ہیں۔

میرے نزدیک موجودہ زمانہ میں جولغویات پائی جاتی ہیں اُن میں سب سے مقدم سینما ہے جوقومی اخلاق کے لئے ایک نہایت ہی مہلک اور تباہ کن چیز ہے اور تمدنی لحاظ سے بھی ملکی امن کے لئے خطرہ کا موجب ہے۔ میں نے کچھ عرصہ ہوا فرانس کے متعلق پڑھا کہ وہاں کئی گاؤں صرف اس لئے ویران ہو گئے کہ لوگ سینما کے شوق میں گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اور گورنمنٹ کو فکر پڑ گئی کہ اِس رو کو کس طرح روکا جائے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ سینما اپنی ذات میں بُرا نہیں مگر اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کا بُرے طور پر استعمال کر کے اس زمانہ میں اسے انتہائی طور پر نقصان رساں اور تباہ کن بنا دیا گیا ہے۔ ورنہ اگر کوئی شخص ہمالیہ پہاڑ کے نظاروں کی فلم تیار کرے اور وہاں کی برف اور درخت اور چشمے وغیرہ لوگوں کو دکھائے جائیں۔ اُس کی چٹانوں اور غاروں اور چوٹیوں کا نظارہ پیش کیا جائے اور اس میں کسی قسم کا باجا یا گانا نہ ہو۔ تو چونکہ یہ چیز علمی ترقی کا موجب ہوگی اس لئے یہ جائز ہو گی۔ اِسی طرح اگر کوئی فلم کلی طور پر تبلیغی ہو یا تعلیمی ہو اور اُس میں گانے بجانے یا تماشہ کا شائبہ تک نہ ہو تو اس کے دیکھنے کی بھی ہم اجازت دے دیں گے۔ اِسی طرح تربیتی یا جنگی اداروں کی طرف سے جو خالص علمی تصاویر آتی ہیں جن میں جنگلوں، دریاؤں کے نظارے یا کارخانوں کے نقشے یا لڑائی کے مختلف مناظر ہوتے ہیں وہ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے دیکھنے سے علمی ترقی ہوتی ہے یا بعض صنعتی یا زرعی تصویریں ہوتی ہیں جن میں کسانوں کو کھیتی باڑی کے طریق سکھائے جاتے ہیں۔ فصلوں کو تباہ کرنے والی بیماریوں کے علاج بتائے جاتے ہیں۔ زراعت کے نئے نئے آلات سے روشناس کیا جاتا ہے عمدہ بیج اور اُن کی پیداوار دکھائی جاتی ہے۔ ایسی چیزیں لغو میں شامل نہیں کیونکہ اُن کے دیکھنے سے علمی لحاظ سے انسان کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے اور اس کا تجربہ ترقی کرتا ہے اور وہ بھی اپنی تجارت یا

صنعت یا زراعت کو زمانہ کی دوڑ کے ساتھ ساتھ بڑھانے اور ترقی دینے کے وسائل اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن جھوٹی فلم خواہ جغرافیائی ہو خواہ تاریخی ناجائز ہے۔ مثلاً نپولین کی جنگوں کی کوئی شخص فلم بنائے تو یہ جھوٹی ہوگی اور باوجود نام نہاد تاریخی فلم ہونے کے ناجائز ہوگی۔ جغرافیائی اور تاریخی فلم سے مراد محض سچی فلم ہے جھوٹی فلم مراد نہیں۔ بہر حال سینما کی وہ فلمیں جو آجکل تمام بڑے بڑے شہروں میں دکھائی جاتی ہیں اور جن میں ناچ بھی ہوتا ہے اور گانا بجانا بھی ہوتا ہے یہ ایک بدترین لعنت ہے جس نے سینکڑوں شریف گھرانوں کے لوگوں کو گویا اور سینکڑوں شریف خاندانوں کی عورتوں کو ناچنے والی بنا دیا ہے۔ میں چونکہ ادبی رسائل وغیرہ دیکھتا رہتا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ سینما کے شوقین اور اس سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے مضامین میں عموماً ایک تمسخر ہوتا ہے اور اُن کے اخلاق اور اُن کا مذاق ایسا گندہ ہوتا ہے کہ حیرت آتی ہے۔ سینما والوں کی غرض تو محض روپیہ کمانا ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کو اخلاق سکھانا۔ اور وہ روپیہ کمانے کے لئے ایسے لغو اور بے ہودہ افسانے اور گانے پیش کرتے ہیں کہ جو اخلاق کو سخت خراب کرنے والے ہوتے ہیں اور شرفاء جب ان کو دیکھنے جاتے ہیں تو ان کا اپنا مذاق بھی بگڑتا ہے اور ان کے بچوں اور عورتوں کا بھی مذاق بگڑ جاتا ہے جن کو وہ سینما دکھانے کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں یا جن کو واپس آکر وہاں کے قصے سُناتے ہیں۔ غرض سینما ملک کے اخلاق پر ایسا تباہ کن اثر ڈال رہے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں اگر میری طرف سے ممانعت نہ ہوتی تب بھی ہر سچے اور مخلص مومن کی رُوح اس سے اجتناب کرتی۔ بعض احمدی پوچھتے ہیں کہ انگریزی فلموں میں تو کوئی لغویات نہیں ہوتی۔ اُن کو دیکھنے کی اجازت دی جائے۔ حالانکہ کوئی انگریزی فلم ایسی نہیں ہوتی جس میں گانا بجانا نہ ہو اور گانا بجانا اسلام میں سخت منع ہے اور قرآن کریم کی اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کا بندہ ہی نہیں بن سکتا جب تک وہ گانے

بجانے کی مجلسوں سے الگ نہ ہو۔

دوسری چیز جو لغویات میں امتیازی مقام رکھتی ہے قمار بازی ہے۔ آجکل قمار بازی یورپ اور امریکہ کے لوگوں کا نہ صرف مشغلہ ہے بلکہ اُن کے تمدن کا ایک جزو لانیفک ہو گیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جُوئے کا کسی نہ کسی صورت میں دخل ہے۔ معمولی طریق کا جؤا تو مجالسِ طعام کے بعد اُن کا ایک معمول ہے۔ لیکن اس کے علاوہ لاٹریوں کی وہ کثرت ہے کہ یوں کہنا چاہئے کہ تجارت کا کام بھی ایک چوتھائی حصہ جوئے کی نذر ہو رہا ہے۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سب لوگ جؤا کھیلتے ہیں اور کبھی کبھی نہیں قریباً روزانہ اور جوئے کی کلبیں شائد سب کلبوں سے زیادہ امیر ہیں۔ اٹلی کی کلب مانٹی کارلو میں جو امراء کے جوئے کا مقام ہے بعض اوقات ایک ایک دن میں کروڑوں روپیہ بعض لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر بعض دوسرے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ غرض اس قدر جوئے کی کثرت ہے کہ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ تمدن جدید میں سے جوئے کو نکال کر اس قدر عظیم الشان خلاء پیدا ہو جاتا ہے کہ اُسے کسی اور چیز سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ جؤا ایسی خطرناک چیز ہے کہ اس کا عادی انسان بعض دفعہ آدھ گھنٹہ کے جؤا کی خاطر اپنی ساری جائیداد برباد کر دیتا ہے۔ اور اگر جیتتا ہے تو اور ہزاروں گھروں کی بربادی کا موجب بن کر۔ پھر جوئے باز میں روپیہ کو لٹانے کی عادت لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی جوئے باز ایسا ہوگا جو اپنے روپیہ کو سنبھال کر رکھتا ہو۔ بالعموم سارے جوئے باز بے پرواہی سے اپنا مال لُٹا دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ روپیہ کمانے کے لئے انہیں زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑے گی۔ گویا ایک طرف تو وہ دوسرے لوگوں کو برباد کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے مال سے بھی صحیح رنگ میں فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ کیونکہ روپیہ کمانے کے لئے انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ پھر جؤا عقل اور فکر کو بھی کمزور کر دیتا ہے اور جوئے باز ہار جیت

کے خیال سے ایسی چیزوں کے تباہ کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے جنہیں کوئی دوسرا عقل مند تباہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ پُرانے زمانہ کی ہندو تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت کرشنؑ کے پھوپھی زاد بھائی یدھشٹر نے اپنی بیوی تک جوئے میں ہار دی تھی۔ پس یہ ایک لغو چیز ہے جس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

تیسری چیز جو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے لغو میں شامل ہے وہ ناچ ہے۔ انگریزوں میں کسی زمانہ میں ناچنا بہت بُرا سمجھا جاتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے اختیار کرنا شروع کر دیا۔ پہلے عورت اور مرد صرف ہاتھ پکڑ کر ناچتے تھے۔ پھر سینہ کی طرف سینہ کر کے ناچنے لگے پھر یہ سلسلہ اور بڑھا اور درمیانی فاصلہ تین انگشت تک آ گیا۔ اب بہت جگہ پر یہ بھی اڑ گیا ہے۔ قرآن کریم نے وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ (النور:32) میں عورتوں کے لئے اپنے پیروں کو اس طرح زمین پر مار کر چلنے سے بھی منع فرمایا ہے جس سے اُن کی زینت کا اظہار ہو۔ اور ناچ میں تو زینت کے اخفاء کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس ناچ بھی مال اور اخلاق کو تباہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیا میں ایسے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کنچنیوں کے ایک ایک ناچ پر اپنی ساری جائیدادیں دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ڈوموں کے لطیفوں پر اپنے قیمتی اموال لٹا دیتے ہیں۔ پس گانے کی طرح ہر قسم کا ناچ بھی ایک لعنت ہے۔ جس سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑتے اور قوم کے اموال تباہ ہوتے ہیں۔

چوتھی چیز جو لغویات میں شامل ہے اور جس کا ترک کرنا نہایت ضروری ہے وہ حقہ ہے۔ لوگ پہلے تو اس کو اِس لئے شروع کرتے ہیں کہ اس سے قبض کھل جاتی ہے مگر پھر اُن کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ پاخانہ میں بیٹھ کر تین تین دفعہ چلمیں بھرواتے ہیں تب انہیں اجابت ہوتی ہے۔ پھر حقہ پینے والوں کو ہمیشہ گلے اور سینہ کی خرابی اور

کھانسی کا عارضہ لاحق رہتا ہے۔ کیونکہ جو چیز جسم کو سُن کر دیتی ہے وہ آخر میں اعصاب کو ڈھیلا اور کمزور کر دیتی ہے اور کئی امراض کا موجب بن جاتی ہے مگر اس زمانہ میں حقہ اور سگریٹ کا اس قدر رواج ہے کہ اکثر نوجوان بلکہ بچے بھی اس میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ ایک نشہ آور چیز ہے اس لئے رفتہ رفتہ وہ اِس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر ضرورت محسوس ہونے پر انہیں حقہ یا سگریٹ یا نسوار وغیرہ نہ ملے تو وہ پاگلوں کی طرح دوڑے پھرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ہم ایک دفعہ پہاڑ پر جا رہے تھے تو میرے ساتھیوں میں ایک احمدی پٹھان بھی تھے جنہیں نسوار کھانے کی عادت تھی مگر بدقسمتی سے وہ اپنی ڈبیا گھر میں بھُول آئے تھے۔ راستہ میں کشمیری مزدور آ رہا تھا جس نے اپنے کندھے پر لکڑیاں اُٹھائی ہوئی تھیں وہ اُسے دیکھتے ہی نہایت لجاجت کے ساتھ کہنے لگے۔ اے بھائی کشمیری۔ اے بھائی کشمیری جی۔ اے بھائی جی آپ کے پاس نسوار ہے۔ مجھے یہ بات سُن کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنی گردن نیچی نہیں کرتا تھا آج نشہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے کِس قدر لجاجت پر اُتر آیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں جو دوست باہر سے آپ کی ملاقات کے لئے آتے تھے اُن میں سے بعض لوگ حقہ کے بھی عادی ہوتے تھے۔ اُن دنوں قادیان میں اور تو کسی جگہ حقہ نہیں ہوتا تھا صرف ہمارے ایک تایا کے پاس ہوا کرتا تھا جو سخت دہریہ اور دین سے بے تعلق تھے۔ مگر حقہ کی عادت کی وجہ سے وہ اُن کے پاس بھی چلے جاتے اور انہیں مجبوراً اُن کی باتیں سُننی پڑتیں۔ ہمارے یہ تایا دین سے ایسے بے تعلق تھے کہ ایک دفعہ حضرت خلیفۃ اوّل نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے کبھی نماز بھی پڑھی ہے۔ وہ کہنے لگے میں تو بچپن سے ہی بڑا اسلیم الطبع واقعہ ہوا ہوں۔ میں چھوٹی عمر میں ہی جب دیکھتا کہ لوگوں نے سر نیچے اور سرین اوپر کئے ہوئے ہیں۔ تو میں ہنستا کہ یہ کیسے بے

وقوف لوگ ہیں۔ اور اب تو میں بہت سمجھدار ہوں۔ میں نے نماز کیا پڑھنی ہے۔ ایک دوست نے سُنایا کہ ایک دفعہ ایک احمدی وہاں حقّہ پینے کے لئے چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ کو گالیاں دیتے ہوئے واپس آ گیا۔ کسی دوست نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ کہنے لگا کہ میں اپنے آپ کو اِس لئے بُرا بھلا کہہ رہا ہوں کہ محض حقہ کی عادت کی وجہ سے مجھے اس کے پاس جانا پڑا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کے خلاف باتیں سُننی پڑیں۔ اگر مجھے یہ بُری عادت نہ ہوتی تو میں اس کے پاس کیوں جاتا اور اپنے آقا کے خلاف اس کے مُنہ سے کیوں باتیں سُنتا۔

غرض حقہ بھی لغویات میں شامل ہے جس کو چھوڑنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اگر کوئی شخص خود نہ چھوڑ سکے تو اُسے کم از کم یہ کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ اُس کی اگلی نسل اس بدی سے محفوظ رہے اور اُس کی عمر کے خاتمہ کے ساتھ اِس لغو فعل کا بھی اُس کے خاندان میں خاتمہ ہو جائے۔

پھر لغویات میں بے کار بیٹھ کر گپیں ہانکنا اور دوسروں سے بے تعلق باتیں پوچھتے رہنا بھی شامل ہے۔ ہمارے ملک میں یہ ایک عام نقص ہے کہ مرد بھی عورتیں بھی دوسروں سے ایسی باتیں پوچھتے ہیں جن کا اُن کی ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً عورت بلا وجہ دوسری سے پوچھتی رہتی ہے کہ یہ کپڑا کتنے کا لیا۔ یہ زیور کہاں سے بنوایا اور جب تک اُس کی ساری ہسٹری معلوم نہ کر لے اُسے چین ہی نہیں آتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام سُنایا کرتے تھے کہ ایک عورت نے انگوٹھی بنوائی۔ لیکن کسی اور عورت نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ اُس نے تنگ آ کر اپنے گھر کو آگ لگا دی لوگوں نے پوچھا کہ کچھ بچا بھی ہے۔ تو اُس نے انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سوائے اس انگوٹھی کے اور کچھ نہیں بچا۔ ایک عورت نے کہا۔ بہن تم نے یہ انگوٹھی کب بنوائی تھی یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ وہ کہنے لگی اگر یہی بات تم پہلے

پوچھ لیتیں تو میرا گھر کیوں جلتا۔ اِسی طرح مرد السلام علیکم کہنے کے بعد ہی پوچھنے لگ جاتے ہیں کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ کیا کام ہے؟ آمدنی کیا ہے؟ کتنے بچے ہیں؟ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ؟ حالانکہ اُس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انگریزوں میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے بلا وجہ پوچھیں کہ کہاں ملازم ہو؟ تعلیم کتنی ہے؟ تنخواہ کیا ملتی ہے؟ وہ کبھی کرید کرید کر دوسرے کے غیر متعلق حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مگر ہمارے ہاں اس کو بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کو بڑی بڑی باتوں کا خیال ہوتا ہے انہیں چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اگر لوگوں کو دین کا فکر ہو اور انہیں معلوم ہو کہ اسلام آج کن مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اور اُس کی اشاعت کے لئے کتنی بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے تو انہیں لغو کاموں اور لغو باتوں کا خیال بھی پیدا نہ ہو۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جائے۔ تو وہ بیٹھ کر گپیں مارنے نہیں لگ جاتا بلکہ دیوانہ وار دوڑتا اور آگ کو بُجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان غور کریں اور اُن کی روحانی آنکھ کھلی ہو تو انہیں معلوم ہو کہ آج کفر اور ایمان کی ایک بڑی بھاری جنگ لڑی جا رہی ہے۔ شیطان اپنے تمام ہتھیاروں سمیت میدان میں اُترا ہوا ہے۔ اور رحمٰن خدا کا لشکر بھی کفر کی سرکوبی کے لئے کھڑا ہے اور دونوں لشکروں میں وہ آخری جنگ جاری ہے جس میں ابلیس کا سر ہمیشہ کے لئے کچلا جائے گا۔ اگر ایسے نازک وقت میں بھی انہوں نے لغویات کو ترک نہ کیا اور اپنے فرائض کو سمجھنے کی کوشش نہ کی تو اُن سے زیادہ بدقسمت اور کون ہوگا۔

۞ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ○ (الفرقان:74)

رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ جب اُن کے سامنے اُن کے

رب کی آیات کا ذکر کیا جائے تو وہ اُن کی طرف بہرے اور اندھے ہو کر توجہ نہیں کرتے بلکہ کان اور آنکھیں کھول کر آیاتِ الٰہیہ کو سُنتے اور روحانی بصیرت کے ساتھ اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اس آیت کے متعلق علامہ ابوحیان صاحب بحرمحیط لکھتے ہیں کہ لَمْ یَخِرُّوْا میں جونفی استعمال کی گئی ہے اُس کا تعلق صُمًّاوَّ عُمْیَانًا کے ساتھ ہے یَخِرُّوْا کے ساتھ نہیں ہے۔اور یہ طریق کلام عربی زبان میں عام مستعمل ہے مثلاً کہتے ہیں لَمْ یَخْرُجْ زَیْدٌ اِلَی الْحَرْبِ جَزْعًا یعنی زید جنگ کے لئے جزع فزع کرتے اور بزدلی کا اظہار کرتے ہوئے نہیں نکلا۔اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اِنَّمَا خَرَجَ جَرِیًّا وہ بڑی دلیری اور بہادری کے ساتھ نکلا ہے اسی طرح اِس آیت کے یہ معنے نہیں کہ عبادالرحمٰن کو جب اللہ تعالیٰ کی آیٰت یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ اُس کے حضور عاجزی اور مسکنت کے ساتھ نہیں گرتے بلکہ صرف بہرے اور اندھے ہونے کی حالت میں گرنے کی نفی کی گئی ہے اور مراد یہ ہے کہ......

جب انہیں خدا تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جائیں تو وہ اُن کے سُننے کے شوق میں اُن کی طرف جھکے چلے جاتے ہیں اور ان نشانات کی طرف جن کے ذریعہ انہیں نصیحت کی جاتی ہے کان کھول کر اور اپنی آنکھوں کو کھلا رکھ کر توجہ کرتے ہیں بخلاف کافروں اور منافقوں کے طریق کے جو بہرے کان اور اندھی آنکھیں رکھتے ہیں۔یعنی نہ تو وہ کسی نصیحت کی کسی بات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور نہ کوئی نشان اُن کی بند آنکھوں کو کھولنے کا موجب بنتا ہے۔یہ عبادالرحمٰن کی وہی خوبی ہے جو قرآن کریم کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔کہ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (السجدہ: 16) یعنی ہماری آیتوں پر وہی لوگ سچا ایمان رکھتے ہیں کہ جب انہیں آیات الٰہیہ کے متعلق توجہ دلائی جائے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر جاتے ہیں۔اور اپنے رب کی تعریف

اور تسبیح کرتے ہیں اور تکبر سے کام نہیں لیتے۔ اس کے مقابلہ میں کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ o وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ (الصّٰفّٰت: 14-15) کہ جب انہیں کوئی نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت حاصل نہیں کرتے اور جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو اُس کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ گویا وہ کانوں سے بھی بہرے ہوتے ہیں اور آنکھوں سے بھی اندھے ہوتے ہیں۔ نہ نصیحت کی بات سُن کر وہ کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کا نشان دیکھ کر کوئی عبرت حاصل کرتے ہیں۔ غرض سچے مومنوں کی آنکھیں بھی کھلی ہوتی ہیں اور اُن کے کان بھی کھلے ہوتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی باتوں کو پوری توجہ سے سُنتے ہیں اور پھر اُن سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُسی وقت عمل پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر ان معنوں کے علاوہ قرآن کریم کی اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ عبادالرحمٰن کے سامنے جب اُن کے رب کی آیات بیان کی جاتی ہیں تو وہ انہیں اندھا دھند نہیں مانتے بلکہ سوچ سمجھ کر اور دلائل کے ساتھ مانتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک اور مقام پر اسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ قف عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف :19) یعنی اے ہمارے رسول! اپنے منکروں سے کہہ دو کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف علی وجہ البصیرت بُلاتا ہوں اور مَیں اور میرے متبع کسی بے دلیل بات کو نہیں مانتے بلکہ سوچ سمجھ کر اور دلائل قطعیہ کی بنا پر جو شک وشبہ سے بالا ہوتے ہیں ایمان لاتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے بے دلیل ماننے والوں کو بار بار ملزم قرار دیا ہے۔ جیسے سورہ نجم میں فرماتا ہے۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (النجم:24) یعنی یہ تو صرف چند نام ہیں جو تم لوگوں نے اور تمہارے باپ دادوں نے خود ہی رکھ لئے ہیں خدا تعالیٰ نے اس کی کوئی دلیل بیان نہیں کی۔ یہ لوگ

صرف اپنے اوہام کی یا اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم دشمنان اسلام پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ وہ ان بے دلیل باتوں کو جن کے لئے نہ آسمانی شہادت ہوتی ہے نہ عقلی مانتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔اور وہمی باتوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ایمان دلائل اور براہین پر مبنی ہونا چاہئے نہ کہ وہم اور گمان پر۔چنانچہ سورہ احقاف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَھُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَآ اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (الاحقاف:5) یعنی مجھے بتاؤ تو سہی کہ خدا کے سوا جن وجودوں کو تم پکارتے ہو کیا اُن میں کوئی حقیقت بھی ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتاؤ کہ انہوں نے زمین میں سے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟ یا یہ ثابت کرو کہ آسمانی بادشاہت میں ان کا کوئی حصہ ہے۔اگر تم سچے ہو تو اس کے لئے یا تو قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب سے دلیل پیش کرو یا اپنے باپ دادا کی بتائی ہوئی کسی علمی بات کو ہی پیش کرو۔یعنی تمہارے شرکیہ مسائل نہ تو کسی آسمانی کتاب سے ثابت ہیں نہ کسی علمی دلیل سے ثابت ہو سکتے ہیں۔پھر ان پر ایمان لانا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ اسی طرح فرماتا ہے۔اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْھِمْ سُلْطَانًا فَھُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوْا بِہٖ یُشْرِکُوْنَ (الروم:36) یعنی کیا اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دینے کی کوئی دلیل بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہیا کی ہو۔اور وہ شرک کی صداقت پر گواہ ہو۔اگر ایسا نہیں تو پھر بے دلیل بات کو یہ لوگ کس طرح مان رہے ہیں۔اسی طرح فرماتا ہے۔قُلْ ھَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○ قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ (الانعام149-150) یعنی کفار سے کہہ دو

کہ کیا تمہارے پاس اپنے دعاوی کی کوئی دلیل بھی ہے جسے تم ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ تمہارے پاس ہرگز کوئی دلیل نہیں بلکہ تم صرف وہم کی پیروی کرتے ہو اور ڈھکو نسلے مار رہے ہو۔ پھر فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول! ان سے بھی کہو کہ اللہ تو وہ باتیں اپنے بندوں سے منواتا ہے جن کے دلائل مکمل طور پر موجود ہوتے ہیں۔ پس جو بات بلا ثبوت ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (الانعام:105) یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلے کھلے دلائل آچکے ہیں۔ اب جو شخص ان دلائل کو دیکھے گا وہ فائدہ اٹھالے گا۔ اور جو نہیں دیکھے گا وہ نقصان اٹھائے گا۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیا ہے جس کی بصیرت پر بنیاد ہو اور جسے کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہو۔ اگر کوئی شخص بغیر تحقیق کے کسی بات کو مان لیتا ہے اور حقیقی شعور اسے حاصل نہیں ہوتا۔ تو قرآنی اصطلاح میں وہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود بھی اندھا اور بہرہ ہوتا ہے کیونکہ نہ تو اُسے دین پر ثبات حاصل ہوتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کے قرب کی برکات سے اُسے کوئی حصہ ملتا ہے۔

اسی طرح لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ جب انہیں خدا تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جائیں تو وہ اس کلام کے ذریعہ اس طرح ٹھوکریں نہیں کھاتے جس طرح منافق اور کافر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ منافقوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب غزوہ احزاب کے موقع پر عرب کے تمام قبائل مدینہ پر لشکر لے کر آ گئے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا (الاحزاب:13) یعنی خدا اور اس کے رسول نے ہم سے کامیابی کا ایک جھوٹا

وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب مومنوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو وہ اپنے ایمان اور یقین میں اور بھی بڑھ گئے اور انہوں نے کہا کہ ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (الاحزاب:23) یعنی یہ تو وہ لشکر ہیں جن کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اُس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔ گویا خدا تعالیٰ کی ایک عظیم الشان پیشگوئی کے پورا ہونے پر منافق تو ٹھوکر کھا گئے اور مومن اپنے ایمان اور اطاعت میں بھی بڑھ گئے۔ اسی طرح جب بھی کوئی نشان خدا تعالیٰ اپنے دین کی تائید کے لئے ظاہر کرتا ہے تو منافق جو اپنے دلوں میں بغض وحسد کی آگ لئے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو اُن نشانات سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ہنسی اور تمسخر میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اُن نشانات کی قدر و قیمت کو کم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں لیکن مومنوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہ وہ خدائی نشانات کے ظہور پر اپنے دل کے کانوں کو اس طرح کھول دیتے ہیں کہ الٰہی نور اُن میں پہلے سے بھی زیادہ زور سے داخل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اپنی روحانی بینائی میں ایسی تیزی پیدا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی معرفت اور اُس کی محبت کے میدان میں وہ پہلے سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ منافقوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اور مقام پر وضاحتاً فرمایا ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ (محمد: 24) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اُس نے اُن کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کے نشانات بارش کی طرح برس رہے ہیں اور قرآن کریم کے ذریعہ دُنیا کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ بدی کی جگہ نیکی نے اور فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و طہارت نے اور ظلم و ستم کی جگہ عدالت و انصاف نے اور بے مروّتی کی جگہ وفا اور اخلاص نے لے لی ہے پھر بھی یہ منافق اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اِن کی روحانی

آنکھیں بند ہیں اوران کے روحانی کان بھی بند ہیں۔اگران کے کان کھلے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی آیات پر تدبر کر کے یہ لوگ ہدایت پا سکتے تھے۔اوراگران کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے معجزات اورنشانات دیکھ کراپنی شرارتوں سے توبہ کر سکتے تھے۔مگران لوگوں نے ہدایت کے ان دونوں راستوں کو بند کرر کھا ہے۔اس لئے مسلمانوں میں شامل ہونے کے باوجود اِن لوگوں پر خدا تعالیٰ کی لعنت برس رہی ہے بڑے سے بڑا نشان بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتو وہ اس طرح پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں کہ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی اوراپنی منافقت میں اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔مگر مومنوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔اُن کی آنکھیں خدا تعالیٰ کے حضوراُس کے نشانات دیکھ کر جھک جاتی ہیں اوراُن کے کان خدا تعالیٰ کی باتیں سُننے کے لئے ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔اسلام کی طرف سے جب بھی کوئی آواز اٹھتی ہے وہ اُسے بہرے کانوں کے ساتھ نہیں سُنتے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی بیتابی سے خدائی ہدایت کے منتظر تھے۔اور جب ان کی آنکھیں کسی نشان کو دیکھتی ہیں تو وہ اس سے منہ نہیں پھیرتے بلکہ اس نشان کواپنے دل میں جگہ دیتے اوراللہ تعالیٰ کاشکراداکرتے ہیں جس نے انہیں اپنے نشانات کے ذریعہ اپنی ہستی کا ثبوت دیا۔غرض سچا مومن خدا تعالیٰ کی آیات کے ظہور پراور بھی خدا تعالیٰ کے قریب ہوجاتا ہے۔مگر کافراورمنافق اپنے کفر اورنفاق میں ترقی کرجاتااوراس کاپچھلا حال پہلے سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔

مگر یہ بھی یادرکھنا چاہئے کہ اس جگہ آیات الٰہیہ سے صرف قرآنی آیات یا اللہ تعالیٰ کے نشانات ہی مرادنہیں بلکہ وہ تمام ربّانی علماءاور مصلحین امت جن کا کام خداتعالیٰ کی بھولی بھٹکی مخلوق کوراہ راست پرلانااورانہیں صراطِ مستقیم پرقائم کرنا ہے اُن کا وجود بھی آیات الٰہیہ میں ہی شامل ہے۔جیسے قرآن کریم نے حضرت مسیحؑ ناصری اوراُن کی والدہ حضرت مریم صدیقہؑ کے متعلق فرمایا۔ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗٓ

اٰیَۃً(المومنون:51) کہ ہم نے مسیح ناصری اور اُن کی والدہ کو دنیا کے لئے ایک آیت بنا دیا تھا اور یَخِرُّوْا کے معنے ...... صرف جھکنے اور گرنے کے نہیں بلکہ حملہ کرنے کے بھی ہیں پس وَالَّذِیْنَ اِذَاذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّاوَّ عُمْیَانًا میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی عبادالرحمٰن کو جب اللہ تعالیٰ کے کسی مامور یا مصلح یا مجدد کے ذریعہ اُن کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اندھے اور بہرے ہو کر اُن پر حملہ نہیں کر دیتے جیسے بدقسمتی سے بعض مسلمان بادشاہوں نے اولیاء اُمت سے ناروا سلوک کیا اور اُن پر بڑے بڑے مظالم توڑے بلکہ وہ فوراً اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اپنی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ فوج اور طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ ہمیں نصیحت کرنے والا ایک معمولی فرد ہے۔ بلکہ وہ اس نقطۂ نگاہ سے اُس کی آواز پر کان دھرتے ہیں کہ یہ ہمارے خدا کا ایلچی ہے اور اگر ہم نے اس کی آواز پر کان نہ دھرا تو ہماری دنیا بھی تباہ ہو گی اور ہماری عاقبت بھی برباد ہو گی۔ گویا دنیا کے بادشاہ ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کے پاک بندے اُس کے در کے بھکاری اور اُس کی آواز پر لبیک کہنے والے ہوتے ہیں۔ اور کبر اور رعونت کا کوئی شائبہ تک اُن کے دلوں میں نہیں پایا جاتا۔

۞ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَامِنْ اَزْوَاجِنَاوَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّا جْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ○ اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَاصَبَرُوْاوَیُلَقَّوْنَ فِیْھَا تَحِیَّۃً وَّ سَلَامًا ○ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّاوَّ مُقَامًا ○ (الفرقان:75-77)

رحمٰن کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا

فرما۔اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دوراقتدار میں اِس دُعا کو بھی نظر انداز کر دیا اور وہ اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت سے غافل ہو گئے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے تمام حکومتیں اُن کے قبضہ سے نکل گئیں اور اغیار نے اُن کے ملکوں پر قبضہ کرلیا۔اگر مسلمان اپنے دورِ حکومت میں اُن بلند اخلاق کے حامل رہتے جن کا اِس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے اور وہ رات دن اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے رہتے کہ خدایا ہمیں ایسی اولاد عطا فرما جو ہماری آنکھوں کے لئے ٹھنڈک کا موجب ہو۔اور وہ اپنی آئندہ نسلوں کی نیک تربیت سے کبھی غافل نہ ہوتے تو وہ نالائق بادشاہ امت محمدیہ میں کیوں پیدا ہوتے جنہوں نے تخت وتاج کو اپنی عیاشیوں کی نذر کر دیا۔اور وہ حکومتیں جو اُن کے آباؤ واجداد نے بڑی بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی تھیں اُن کو اپنی بدکرداریوں سے ضائع کر دیا۔یہ تنزل مسلمانوں پر اس لئے آیا کہ وہ عبادالرحمٰن کے فرائض بھولتے چلے گئے اور جب انہوں نے خدا تعالیٰ کو بھلا دیا تو خدا بھی انہیں بھول گیا۔اور اُس نے اُنہیں تاج وتخت سے محروم کر دیا بیشک یہ جو کچھ ہوا نہایت افسوس ناک ہے لیکن اگر آئندہ کے لئے ہی مسلمان عبرت حاصل کریں اور اپنی آئندہ نسلوں کو تربیت کی طرف توجہ کریں اور خدا تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہیں کہ وہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کے بعد بھی ان کی نسلوں کو نیکی پر قائم رکھے اور ہمیشہ اُن کا وجود اُن کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنے تو اب بھی وہ اپنی کھوئی ہوئی متاع کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔پس انہیں اپنی ہمتوں کو بلند کرنا چاہئے اور مایوسی کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہئے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ مومن چھوٹی چھوٹی باتوں پر راضی نہیں ہوتا بلکہ وہ لیڈر اور امام بننے کی دعا کرتا ہے۔مگر کن کا امام متقیوں کا امام، غیر متقیوں کا نہیں۔ممکن ہے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہر شخص کس طرح لیڈر اور امام بن

سکتا ہے۔سوانہیں یادرکھنا چاہئے کہ اگر مرد کوشش کرے کہ میری بیوی دین سے واقف ہو۔نماز روزہ کی پابند ہو۔دینی کاموں میں حصہ لینے والی ہو۔بچوں کی نیک تربیت کرنے والی ہوتو مرد امام ہوگا۔اور بیوی ماموم۔اسی طرح اگر ماں اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کرے تو وہ امام ہوگی اور اولاد ماموم۔اور اولاد کے نیک کام بھی اُس کی طرف منسوب کئے جائیں گے۔عورت قبر میں سورہی ہوگی مگر جب اس کے بچے صبح کی نماز پڑھیں گے تو فرشتے لکھ رہے ہوں گے کہ اس بی بی نے صبح کی نماز پڑھی۔اسی طرح اگراُس نے اپنی اولاد کوتہجد کی عادت ڈالی ہوگی تو فرشتے لکھ رہے ہوں گے کہ اُس نے تہجد کی نماز پڑھی۔یہی حال مردوں کا ہے وہ بھی جتنے لوگوں کی ہدایت کا موجب بنیں گے اُن سب کے نیک اعمال کے ثواب میں بھی شریک ہوں گے۔اِس طرح وہ امام ہوں گے اور دوسرے لوگ ماموم۔

غرض اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاک بندے ہمیشہ اپنی آئندہ نسل کی دینی ودنیوی ترقیات کے لئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں تا کہ وہ نورِایمان جو اُن کے دلوں میں پایا جاتا ہے صرف اُن کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ قیامت تک چلتا چلا جائے اور کوئی زمانہ بھی ایسا نہ آئے جس میں اُن کی اولاد یا اُن کے متبع اور شاگرد دنیاداری کی طرف مائل ہوجائیں اور خدا اور رسولؐ کے احکام پر دنیا کو مقدم کر لیں۔قرآن کریم نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایک بڑی خوبی یہ بیان فرمائی ہے کہ كَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم:56) یعنی وہ اپنے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کونماز اور زکوۃ کی تاکید کیا کرتے تھے تا کہ خدائے واحد کی حکومت دنیا میں ہمیشہ قائم رہے۔اور ہمیشہ کے لئے نماز اور زکوٰۃ کا سلسلہ جاری رہے۔اور یہی ہر مومن کا کام ہے اور اس کا فرض ہے کہ جہاں وہ اپنی اولاد کی نیک تربیت سے کبھی غافل نہ ہو وہاں وہ اللہ تعالیٰ سے دُعائیں بھی کرتا رہے اور خود اُن کا معلم بنے اور انہیں

اس قابل بنائے کہ وہ ہمیشہ اسلام کا جھنڈا اونچا رکھیں۔اور محمد رسول اللہ ﷺ کا نام بلند کرتے رہیں۔

فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا جو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے اس قسم کے نیک کام کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اُن کی آئندہ نسل نیک ہو۔اور وہ رات دن اُن کے لئے دعائیں کرتے رہیں گے قیامت کے دن ہم اُن کو اُن کے صبر کرنے کی وجہ سے یعنی اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے نفس کو بدیوں سے روکا اور اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کی اور آئندہ نسل کو نیکی پر قائم کیا اونچے سے اونچے مقامات دیں گے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں سلامتی کے پیغام پہنچیں گے اور یہ پیغام صرف ایک دفعہ پہنچ کر ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ دائمی طور پر پہنچتے چلے جائیں گے۔گویا جس طرح دنیا میں انہوں نے اپنے بچوں کو جھوٹ سے اور فریب سے اور گالیوں سے اور چغلخوری سے اور خیانت سے اور ظلم سے اور فساد سے اور خونریزی سے اور چوری سے اور بہتان سے اور استہزاء سے اور سُستی سے اور ناواجب طرفداری سے اور لغویات میں حصہ لینے سے اور اسی طرح اور ہزاروں قسم کی بدیوں سے روکا اور سلامتی پھیلائی اِسی طرح جب وہ جنت میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔یہ وہ بندے ہیں جن سے میرے بندے دنیا میں امن میں رہے۔اس لئے جاؤ اور انہیں دارالسلام میں داخل کرو جہاں سلامتی ہی سلامتی ہے۔

پھر غُرْفَة کے ایک معنے ......ساتویں آسمان کے بھی ہیں۔اِس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ عباد الرحمٰن جنہوں نے دنیا میں انکسار اور عدل و انصاف کے ساتھ اپنی عمر بسر کی جو دن کے اوقات میں بھی احکام الٰہی کے تابع رہے اور رات کی تاریکیوں میں بھی سجدہ وقیام میں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے اور دعائیں کرتے رہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن کے درجات کو بلند کرتے ہوئے انہیں

ساتویں آسمان پر جگہ عنایت فرمائے گا یعنی وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ رکھے جائیں گے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ ساتویں آسمان پر ہی ہیں (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ 207-209) اس کی طرف رسول کریم ﷺ نے اس حدیث میں بھی اشارہ فرمایا کہ اِذَاتَوَاضَعَ الْعَبْدُ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ (کنز العمال جلد 2ص25) کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ساتویں آسمان میں جگہ دیتا ہے چونکہ ان لوگوں نے خدا کے لئے ھون اور تذلّل اختیار کیا ہوگا اس لئے خدا تعالیٰ بھی انہیں سب سے اونچا مقام رفعت عطا فرمائے گا اور انہیں منازل قرب میں سے سب سے اونچی منزل عطا کی جائے گی۔ مگر چونکہ ان آیات کا تعلق مسلمانوں کے اُس دور کے ساتھ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا پر حکومت اور غلبہ عطا فرمانا تھا اس لئے اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ خدائے رحمٰن کے وہ پاک بندے جو دنیا میں حکمرانی کرتے وقت اخلاق فاضلہ کا ایک مجسم نمونہ ہوں گے۔ جو اپنے نشہ حکومت میں کمزور اور ناطاقت ممالک پر حملہ نہیں کریں گے۔ اُن کے حقوق کو سلب نہیں کریں گے اور اپنی راتیں بجائے شرات اور ناچ گانے میں بسر کرنے کے عبادت اور ذکر الٰہی اور دعاؤں میں بسر کریں گے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے رہیں گے کہ وہ انہیں تنزل کا شکار ہونے سے محفوظ رکھے۔ انہیں بداعمالیوں کے جہنم سے بچائے۔ انہیں دین سے غفلت اور لاپرواہی اور خدا تعالیٰ سے دُوری اور اُس سے بے تعلقی کے جہنم سے بچائے اور جو اپنی حکومت کے دوران میں کسی قسم کے اسراف سے کام نہیں لیں گے اور قوم کا روپیہ اپنی عیاشیوں میں صرف نہیں کریں گے۔ نہ قومی روپیہ کے خرچ کرنے میں کسی قسم کے بخل سے کام لیں گے یعنی تو وہ روپیہ کا بے محل استعمال کریں گے اور نہ ایسا ہوگا کہ وہ روپیہ تو جمع کرتے رہیں اور قوم بھوک اور افلاس کا شکار

رہے اور وہ اس کی ترقی کے لئے سکول اور کالج اور کنوئیں اور شفا خانے اور کارخانے اور ڈاکخانے وغیرہ جاری نہ کریں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے دورِ حکومت میں اس بات کی سختی سے نگرانی رکھیں گے کہ توحید کا قیام ہو اور اسلام کی تبلیغ اور اُس کی اشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر جاری رہے اور وہ لوگ جو اپنی حکومت کے بل بوتے پر ناجائز خون نہیں بہائیں گے نہ زنا کاری کے قریب جائیں گے نہ بالا افسروں کی خوشامد اور اُن کی چاپلوسی کے لئے جھوٹی گواہیاں دیں گے۔ نہ سینما اور شراب اور جوّا اور حقہ اور دوسری منشیات اور لغویات کے قریب جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنی طاقت کے زمانہ میں خدا تعالیٰ کے نام آنے پر لرز جائیں گے۔ اور انہیں جب بھی خدا تعالیٰ کا نام لے کر کوئی نصیحت کی جائے گی تو وہ اُسے توجہ سے سُنیں گے اور اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور وہ لوگ جو ہمیشہ یہ دُعائیں کرتے رہیں گے کہ الٰہی تو نے ہمیں اپنے فضل سے حکومت تو عطا فرمادی ہے۔ اب ایسا فضل فرما کہ ہماری آئندہ نسل بھی حکومت کے اہل رہے اور وہ بھی تیرے نام کے بلند کرنے والی اور ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے پاکباز لوگوں کی اِن اعلیٰ درجہ کی نیکیوں اور دعاؤں کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ بلکہ انہیں اپنے فضل سے ایسا غلبہ عطا فرمائے گا کہ ساری دنیا اُن کے زیرِ نگیں ہو جائے گی اور دنیا کا کونہ کونہ خدا تعالیٰ اور اُس کے رسول کے نام سے گونج اُٹھے گا۔

۞ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝ (الفرقان:78)

عبادالرحمٰن کی علامات بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول! تُو اِن لوگوں کو میری طرف سے سُنا دے کہ اگر تم میرے ایسے بندے بنو جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے تب تو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں تم عزت کے مستحق سمجھے

جاؤ گے لیکن اگر تمہاری طرف سے دعا اور استغفار کا سلسلہ جاری نہ رہے اور تم خدا تعالیٰ کے حضور جھکنا اور عجز وانکسار اختیار کرنا اپنا شعار نہ بناؤ تو تمہارا رب تمہاری کیا پرواہ کرتا ہے۔

مَایَعْبَؤُابِکُمْ میں مَانافیہ بھی ہوسکتا ہے اور استفہامیہ بھی۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی رہے گا۔ مگر طرز کلام بدل جائے گی۔ اگر مَانافیہ ہوتو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اے ہمارے رسول! کہہ دے کہ اگر تم دُعا سے کام نہیں لو گے اور خشوع وخضوع اختیار نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرے گا اور اگر مَا استفہامیہ قرار دیا جائے تو اس آیت کے معنے یوں ہوں گے کہ اے ہمارے رسول! تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ اگر تم دعائیں نہیں کرو گے اور تضرع سے کام نہیں لو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے۔ یعنی اُس کو تمہاری ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ تو خود مستغنی ہے اور سب کی ضرورتیں پوری کررہا ہے یعنی صمد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر اپنی ہستی پر غور کرے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کی کوئی احتیاج نہیں بلکہ خود اُسے اللہ تعالیٰ کی ہر آن اور ہر لحہ احتیاج ہے۔ لیکن بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ہمارا نماز پڑھنا یا ہمارا صدقہ دینا یا ہمارا زکوٰۃ ادا کرنا یا ہمارا حج کرنا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر کوئی احسان ہے۔ اِسی وجہ سے جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو کہتے ہیں معلوم نہیں خدا نے ہمیں کیوں مصیبت میں ڈالا۔ ہم تو نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں اور زکوٰۃ بھی دیتے ہیں اور اسی طرح دوسرے مذہبی احکام پر بھی عمل کرتے ہیں۔ گویا وہ اپنے دل میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اُن سے بدسلوکی کی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ کسی شخص کا بیٹا مر گیا اور اُس کا ایک دوست تعزیت کے لئے اُس کے پاس گیا تو وہ چیخ مار کر رو پڑا۔ اور کہنے

لگا خدا نے مجھ پر بڑا بھاری ظلم کیا ہے گویا نعوذ باللہ اُس کا کوئی حق خدا تعالیٰ نے مار لیا تھا۔ جس کا اُسے شکوہ پیدا ہوا۔ مگر سوچنا چاہئے کہ وہ کونسا حق ہے جو بندہ نے خدا تعالیٰ پر قائم کیا ہے۔ مجھے ہمیشہ تعجب آتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج اور تقویٰ وطہارت پر فخر کیا کرتے ہیں وہ تو کسی تکلیف کے موقع پر چلا اُٹھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہم پر ظلم کیا۔ لیکن ہندوستان کا وہ مشہور شاعر جو دین سے بالکل ناواقف تھا ایک سچائی کی گھڑی میں باوجود شراب کا عادی ہونے کے کہہ اُٹھا کہ ؎

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غور کرنا چاہئے کہ جو چیز بھی انسان کے پاس سے جاتی ہے وہ آئی کہاں سے تھی؟ ذرا اپنی حیثیت کو تو دیکھو وہ کونسی چیز ہے جسے اپنی کہہ سکتے ہو۔ انسان کہتا ہے میری بیوی ہے۔ مگر وہ کہاں سے آئی؟ بچے جنہیں اپنا کہا جاتا ہے کہاں سے آئے ہیں۔ اسی طرح مکان زمین اور سب ضروری اشیاء جنہیں اپنی سمجھا جاتا ہے کہاں سے آتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کی حقیقت پر غور کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ چیزیں انسان کی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے موہبت اور عطیہ ہیں اور عطیہ دینے والے کا حق ہے کہ وہ جب چاہے واپس لے لے بلکہ عطیہ بھی اُسے کہتے ہیں جو کبھی واپس نہ لیا جائے۔ مگر دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ آخر اُس سے لیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں انسان کو حقیقی عطیہ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ تمام اشیاء عاریتاً استعمال کے لئے دی جاتی ہیں۔ اور اس طرح چیز دینے والے کا حق ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

انت الذی ولدتک اُمّک باکیاً
والنّاس حولک یضحکون سرورا

فاحرص علی عملٍ تکون اذا بکوا

فِی وقتِ موتك ضاحکًا مسرورا

یعنی تُو وہی تو ہے کہ جب تو پیدا ہوا تھا تو تُو رو رہا تھا کیونکہ ہر بچہ پیدا ہونے کے بعد روتا ہے اور تیرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ ہنس رہے تھے کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ پس اب تو ایسے اعمال کے لئے جدوجہد کر کہ جب تو مرنے لگے تو تو ہنس رہا ہو کہ میں اپنے خدا سے نیک بدلے لینے کے لئے جا رہا ہوں اور تیرے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ رو رہے ہوں کہ ایسا اچھا انسان ہم سے چھینا جا رہا ہے۔

تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَایَعْبَؤُابِکُمْ رَبِّی لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ تم اپنی ہستی کو کیا سمجھتے ہو؟ آخر انسان ہے کیا چیز کہ خدا تعالیٰ اُس کی پرواہ کرے۔ اگر خدا تعالیٰ انسان کو خود ہی بطور احسان اپنی طرف بلانے کا سامان نہ کرتا اور اُسے فرش سے اٹھا کر عرش تک نہ پہنچا دیتا تو اپنی ذات میں وہ کیا حقیقت رکھتا تھا کہ اُس کی طرف توجہ کی جاتی۔ یہ خدا تعالیٰ کا احسان ہی ہے جس نے انسان کو اٹھایا اور اُسے ترقی عطا فرمائی۔ چنانچہ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ کے ایک معنے یہی ہیں کہ لَوْلَا دَعَاؤُہٗ اِیَّاکُمْ اِلٰی طَاعَتِہٖ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے یہ لازم نہ کر لیا ہوتا۔ کہ میں اپنے بندوں کو پکاروں گا اور اُن کی ترقی کے سامان کروں گا تو تم ایک مشت خار سے زیادہ کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے یہ محض خدا تعالیٰ کا احسان ہی ہے کہ وہ دنیا کی گمراہی پر اپنا کوئی مامور اور مصلح کھڑا کرتا اور بھٹکتی ہوئی مخلوق کو پھر راہ راست کی طرف لے کر آتا ہے۔ وہ اُس کے ذریعہ گری ہوئی قوموں کو عزت دیتا اور گمنامی میں زندگی بسر کرنے والوں کو دنیا کا معلم اور بادشاہ بنا دیتا ہے۔ اگر اُس نے تمہارے لئے اپنا کلام نازل نہ کرنا ہوتا تو وہ تمہاری اس قدر خاطر و مدارت کیوں کرتا اور تمہارے لئے زمین و آسمان کیوں بناتا۔ پھر تو تمہاری طرف اُسے اس قدر توجہ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں

تھی۔ یہ محض اُس کا احسان ہے کہ وہ تمہیں اپنی طرف بلا کر تمہارے لئے عزت کے سامان پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کو ہی دیکھ لو۔ آپ تمام جہان سے منقطع ہو کر ایک گوشہ گمنامی میں پڑے تھے اور غار حرا میں عبادتیں کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے وہ تمام ذرائع جو دنیوی ترقی کے حصول کے ہیں ترک رکھے تھے مگر آپؐ کے پاس خدا تعالیٰ کا فرشتہ آیا اور اس نے کہا۔ اُٹھ خدا تجھے بلاتا ہے۔ اور پھر اُس گوشہ گمنامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دنیا کا بادشاہ بنا دیا اور ایسی ترقی عطا کی کہ مذہب اور سیاست اور تمدن اور معاشرت سب پر آپؐ کا رنگ چھا گیا۔ حتیٰ کہ آپؐ کے غلام یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کئے بغیر اور لیبارٹریز میں تجربات کرنے کے بغیر ہی ہر فن میں دنیا کے استاد بن گئے اور جس میدان میں بھی انہوں نے قدم رکھا تمام دنیا سے آگے بڑھ گئے۔ اگر یہ خدا کی موہبت نہیں تو اور کیا چیز ہے؟

ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے ایک دفعہ ایک اشرفی دی اور فرمایا کہ قربانی کے لئے بکری لے آؤ۔ میں نے سوچا کہ مدینہ میں تو اس رقم میں ایک ہی بکری ملے گی مگر کسی گاؤں سے دو مل جائیں گی اس لئے میں نے ایک گاؤں سے ایک اشرفی میں دو بکریاں خرید لیں۔ جب واپس آیا تو مدینہ میں کسی نے پوچھا کہ کیا بکری فروخت کرو گے میں نے کہاں ہاں! اور ایک بکری ایک اشرفی میں اُس کے پاس فروخت کر دی۔ پھر رسول کریم ﷺ کے پاس جا کر میں نے بکری بھی پیش کر دی اور اشرفی بھی۔ اور آپؐ کے دریافت فرمانے پر میں نے یہ تمام واقعہ عرض کر دیا۔ رسول کریم ﷺ خوش ہوئے اور آپؐ نے مجھے دُعا دی۔ آپؐ کی اس دعا کا یہ نتیجہ ہوا کہ باوجودیکہ عرب ایرانیوں اور رومیوں جیسے تاجر نہ تھے پھر بھی وہ صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی اُس دعا کے طفیل میری یہ کیفیت ہو گئی کہ اگر میں نے مٹی بھی خریدی تو وہ سونے کے بھاؤ بک گئی۔ لوگ زبردستی اپنا روپیہ میرے پاس

تجارت کے لئے چھوڑ جاتے تھے اور میں لینے سے انکار کرتا رہتا تھا۔

یہ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ کی صداقت ہی کا ایک کرشمہ تھا ورنہ اس میں اپنے کسی ہنر یا محنت کا دخل نہ تھا۔ یہ خدا تعالیٰ کی اپنی آواز تھی جس کے ذریعہ رسول کریم ﷺ آگے بڑھے اور آپؐ کے ساتھ ہی آپؐ کے وابستگان دامن بھی بڑھتے چلے گئے۔ جیسے اگر کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو اُس کا کوٹ یا پاجامہ اور دوسرے کپڑے بھی ساتھ ہی سوار ہو جاتے ہیں۔ پھر صحابہؓ نے یہاں تک ترقی کی کہ قیصر و کسریٰ کے خزائن مسلمانوں کے قبضہ میں آئے اور وہ بڑے بڑے ملکوں کے بادشاہ بن گئے۔ یہ بھی لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ کی صداقت کا ہی ظہور تھا کیونکہ رسول کریم ﷺ کی بعثت خدا تعالیٰ کے فضل کے نتیجہ میں ہوئی اور پھر جب آپؐ بڑھے تو آپؐ کی وابستگانِ دامن بھی ساتھ ہی ترقی کر گئے۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ:119) کی تاکید فرمائی ہے کیونکہ جب صادقین کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پھاٹک کھلتا ہے تو ساتھ ہی اُن کی معیت اختیار کرنے والے بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

پھر لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ لولا تضرعکم الیہ یعنی اگر تم اس کو نہ پکارو اور اُس کے حضور گریہ و بکا نہ کرو اور عجز اور انکسار کے ساتھ اُس کے آگے جھک کر یہ نہ کہو کہ الٰہی ہمارا تو کوئی حق نہیں اگر تو ہم پر احسان کر دے تو تیری ذرہ نوازی ہے تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی جان اور اُس کا خلاصہ اور اس کی رُوح اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف دُعا ہی ہے۔ مگر دُعا اس امر کا نام نہیں کہ انسان صرف مونہہ سے ایک بات کہہ دے اور سمجھ لے کہ دُعا ہوگئی۔ دُعا اللہ تعالیٰ کے حضور پگھل جانے کا نام ہے۔ دُعا ایک موت اختیار کرنے کا نام ہے۔ دُعا تذلل اور انکسار کا مجسم نمونہ بن جانے کا

نام ہے۔ جو شخص صرف رسمی طور پر مونہہ سے چند الفاظ دہراتا چلا جاتا ہے اور تذلل اور انکسار کی حالت اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ جس کا دل اور دماغ اور جس کے جسم کا ہر ذرہ دُعا کے وقت محبت کی بجلیوں سے تھرتھرا نہیں رہا ہوتا وہ دُعا سے تمسخر کرتا ہے۔ وہ اپنا وقت ضائع کر کے خدا تعالیٰ کا غضب مول لیتا ہے۔ پس ایسی دُعا مت کرو جو تمہارے گلے سے نکل رہی ہو اور تمہارے اندر اس کے مقابل پر کوئی کیفیت پیدا نہ ہو۔ وہ دُعا نہیں بلکہ الٰہی قہر کو بھڑکانے کا ایک شیطانی آلہ ہے۔ جب تم دُعا کرو تو تمہارا ہر ذرہ خدا تعالیٰ کے جلال کا شاہد ہو تمارے دماغ کا ہر گوشہ اس کی قدرتوں کو منعکس کر رہا ہو۔ اور تمہارے دل کی ہر کیفیت اس کی عنایتوں کا لطف اٹھا رہی ہو۔ تب اور صرف تب تم دُعا کرنے والے سمجھے جا سکتے ہو۔ یہ کیفیت پیدا ہونی بظاہر مشکل نظر آتی ہے مگر جس شخص کے ایمان کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہو۔ اس کے لئے اِس سے زیادہ آسان اور کوئی شے نہیں بلکہ اُس کی طبیعت کا یہ کیفیت ایک خاصہ بن جاتا ہے۔ اور وہ ہر وقت اس سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ ایسے انسان کو یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ الگ جا کر اور مصلّٰی پر بیٹھ کر دُعائیں کرے بلکہ وہ خلوت وجلوت میں دُعا کر رہا ہوتا ہے۔ اور جب اُس کی زبان پر اور اور کلام جاری ہوتے ہیں اور اس کی آنکھوں کے آگے اور اور نظارے پھر رہے ہوتے ہیں اُس کی روح اپنے مالک وخالق کے عتبہ رحمت پر گری ہوئی اپنے لئے اور ساری دنیا کے لئے طلبگار رحمت ہو رہی ہوتی ہے۔ مگر فرماتا ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا چونکہ تم پہلے ہی خدا تعالیٰ کے پیغام کو رد کر چکے ہو اس لئے اب اس تکذیب کا وبال تمہارے سر پر پڑے گا اور اس کا عذاب تمہارے ساتھ چپک جائے گا۔ یعنی وہ لمبا ہوتا چلا جائے گا اور تم خود بھی اس دنیا میں ذلیل ہو گے اور تمہاری آئندہ نسلیں بھی ہر قسم کی برکتوں سے محروم رہیں گی۔ یہ کتنا خطرناک وعید اور انذار ہے۔ کاش دنیا کے لوگ اِس بات کو سمجھیں۔ کاش

وہ اپنی عاقبت برباد نہ کریں۔کاش وہ اپنی اصلاح کریں۔کاش وہ خدا کی باتوں کی طرف توجہ کریں تا کہ واحد و یگانہ خدا اُن کی پرواہ کرنے لگے اور وہ اُن کے دلوں کو پاک کر کے پھر اپنی محبت کی گود میں بٹھا لے۔

(تفسیر کبیر جلد 6 صفحہ 558-602)

## انسان کی پیدائش کی غرض۔خدا کا عبد بننا

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نور اللہ مرقدہٗ سورۃ الذاریات کی درج ذیل آیات کی تشریح میں انسان کی پیدائش کی غرض عبد بننا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○(الذاریات:56-57)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک خاص بات اور ایک بہت بڑے فرض کی طرف متوجہ کیا ہے۔رسول کریم ﷺ کو خدا تعالیٰ فرماتا ہے تُو نصیحت کر مسلمانوں کو اور انہیں کھول کر بتا دے۔کیونکہ نصیحت مؤمنوں کو فائدہ دیتی ہے۔وہ کیا نصیحت اور کیا وعظ ہے؟ یہ کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔کہ میں نے جن و انس کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ دنیا میں آئیں اور کھا پی کر چلے جائیں۔اور نہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ میں ان کا محتاج ہوں اور اگر انسان نہ ہوتا تو میری خدائی نہ ثابت ہوسکتی۔میں قادر اور مالک نہ رہتا یا میں کمزور تھا اور مدد کے لئے انسان کو پیدا کیا ہے۔یا میری شان وشوکت میں کچھ کمی تھی اس کو پورا کرنے کے لئے انسان کو بنایا ہے یا اپنے علم کی ترقی کے لئے بنایا ہے۔مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ان کے پیدا کرنے سے میرا یہ منشاء نہیں ہے کہ وہ مجھے رزق دیں گے اور کھانا کھلائیں گے میری اگر کوئی غرض ہے۔تو یہ ہے کہ

لِیَعْبُدُوْن ۔ بندے خدا کے عابد ہو جائیں۔ میرا فضل چاہتا تھا کہ میں اس کو پوری شان سے ظاہر کروں۔ پس میں نے اپنے فضل کے اظہار کے لئے انسان کو منتخب کیا اور اپنے احسان کے لئے اسے چن لیا۔ میں نے چاہا کہ انسان میرے عبد بنیں۔ پس وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْن میں نے نہیں پیدا کیا جن اور انس کو مگر اس لئے کہ میری عبادت کریں۔ میں نے ان سے کچھ لینا نہیں۔ ان سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کرنا۔ میری شان میں ان سے کوئی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ میری حکومت میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا۔ میری غرض ان کے پیدا کرنے سے صرف یہی ہے کہ میرے عبد اور فرمانبردار بن جائیں۔

اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عبد کے معنی عام غلامی کے نہیں بلکہ خدا کا عبد بننا بہت بڑا انعام ہے۔ خدا تعالیٰ کی غلامی کوئی ذلت کی بات نہیں بلکہ ایک نعمت ہے اور اس کی چھوٹی مثال یہ ہے کہ جب کسی کو بادشاہ کی ڈیوڑھی کا دربان مقرر کیا جاتا ہے تو وہ اپنے لئے اسے بڑی عزت سمجھتا ہے۔ اس کے لئے تاریں چل جاتی ہیں اور بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ شخص ماتم شروع کر دیتا ہے بلکہ دعوتیں اور پارٹیاں دی جاتی ہیں اور اسے بڑی عزت سمجھا جاتا ہے۔

تو فرمایا میں نے اس لئے انسان کو پیدا کیا ہے کہ وہ میرا عبد بن جائے۔ میری عبادت میں لگ جائے۔ گویا انسان کو انعامات کا وارث بنانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ پس انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات اس پر ظاہر ہوں۔

غرض خدا تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی یہ غرض بیان کی ہے کہ اس کا عبد بنے۔ اور جس غرض کے لئے کوئی آتا ہے دانا وہی ہوتا ہے جو اس غرض کو پورا کرتا ہے۔ مثلاً ایک تاجر جو لاہور تجارت کا مال خریدنے کے لئے جاتا ہے وہ اگر ایک دو

گھنٹے چڑیا گھر دیکھ کر اور ایک دو گھنٹے عجائب گھر دیکھ کر واپس آجائے تو لوگ اسے یہی کہیں گے کہ بے وقوف ہے۔ کیونکہ جو غرض کسی کی ہوتی ہے اسے اگر وہ پورا نہ کرے تو وہ جاہل اور نادان ثابت ہوتا ہے۔

پس جب تک انسان اس غرض کو پورا نہیں کرتا جس کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا عبد نہیں بن جاتا دانا نہیں کہلا سکتا۔ انسان کے لئے دانائی یہی ہے کہ پورے طور پر خدا تعالیٰ کا عبد بن جائے۔ اور جب تک عبد نہ بنے خدا تعالیٰ کے انعام کا وارث نہیں بن سکتا۔ کیونکہ جب تک کوئی کام نہ کرے اس وقت تک انعام کیسے پاسکتا ہے؟ مثلاً حکومت کسی کو لڑنے کے لئے بھیجے مگر وہ سیر تماشہ دیکھ کر واپس آجائے تو اس کو کوئی انعام نہیں دیا جاتا۔ انعام وہی پاتا ہے جو فرمانبردار بن کر اور ہدایات پر کاربند ہو کر کارہائے نمایاں دکھاتا ہے۔ پس جب کہ انسان کی پیدائش کی غرض ہی یہ ہے کہ خدا کا عبد بنے اور اسی وقت انعام حاصل کر سکتا ہے جب اس غرض کو پورا کرے۔ تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس غرض کو ہر وقت یاد رکھے اور اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

دنیا قول بَلٰی کو بھول گئی ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے جو روح دنیا میں آتی ہے اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ (الاعراف:173) کیا میں تیرا رب نہیں ہوں؟ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ کیا تو میرا عبد نہیں ہے۔ روح جواب دیتی ہے بَلٰی ہاں۔ یعنی فطرت یہ گواہی دیتی ہے۔ مگر بہت لوگ ہوتے ہیں جو اعمال سے اپنے اس اقرار کو جھٹلاتے ہیں لیکن مؤمن وہی ہے جس کی زبان اور عمل ایک جیسے ہوں۔

خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے تم لوگوں کی زبان، کان، آنکھیں کھول دی ہیں اور تمہاری روحانی حسّیں بہت تیز کر دی ہیں۔ تمہارا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی پیدائش کی اس غرض کو بھول جاؤ جس کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ دوسرے لوگ اگر غفلت کرتے

ہیں تو کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔ مگر آپ لوگوں کو حضرت مسیح موعودؑ کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ تمہارے پیدا کرنے کی کیا غرض ہے اور تمہاری روحانی آنکھیں کھول دی گئی ہیں۔ پس آپ لوگوں کا فرض ہے کہ اس غرض کی طرف پورے طور سے توجہ کریں۔ اور یاد رکھو کہ تم خدا تعالیٰ کے انعامات اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک اس غرض کو پورا نہ کرو......

پس تم لوگ عبد بننے کی کوشش کرو کیونکہ وہ انعام جو خدا تعالیٰ نے مؤمنوں کے لئے رکھا ہے۔ وہ اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ انسان عبد بن جائے۔ اور طبعی طور پر بھی انسان اسی وقت اس انعام کا مستحق ہو سکتا ہے جو اس کے لئے خدا تعالیٰ نے مقرر کیا ہے جب کہ وہ عبد بن جائے۔ کیونکہ بندہ کا حق خدا تعالیٰ نے جنت مقرر کیا ہے۔ اور اس میں سب سے بڑا انعام خدا تعالیٰ کی رؤیت ہے۔ اور بھی انعامات ہیں لیکن سب سے بڑا انعام یہی ہے۔ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جنت مل نہیں سکتی جب تک انسان عبد نہ ہو۔ اور شریعت کے احکام کے علاوہ اس کی ایک طبعی وجہ بھی ہے۔ یہی نہیں کہ قرآن کریم میں آ گیا ہے کہ جو عبد نہیں بنے گا وہ جنت میں نہیں جا سکے گا بلکہ جنت میں جانے کے لئے طبعی طور پر بھی عبد بننا ضروری ہے......

اب جب کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مؤمن کے لئے جنت مقرر کی گئی ہے۔ اور جنت میں جانے کے لئے الوہیت کا مظہر ہونا ضروری ہے تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ پھر انسان اس میں کس طرح جا سکتا ہے؟ اس کا طریق وہی ہے جو ایک ایسے محل میں جانے کا ہے جس کا مالک کوئی بادشاہ ہو۔

دیکھو ایک بادشاہ کے محل میں خدمت گار تو بآسانی آتے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی رئیس اور راجہ بھی نہیں جا سکتا جب تک کہ اجازت نہ حاصل کر لے۔ مگر ایک نوکر کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اس کوٹھی والے کا بندہ اور خادم

ہے۔پس جنت میں انسان تب ہی داخل ہوسکتا ہے جب کہ عبداللہ بن جائے ورنہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔اور اس طرح انسان جنت میں داخل ہوگا تو اپنے حق اور اپنی خوبی سے نہیں بلکہ اپنے حقیقی آقا کا حقیقی غلام بن کر اس کے گھر جانے کا مستحق ہو جاوے گا ورنہ جب تک انسان اللہ کا عبد نہ ہو جائے جنت میں جا ہی نہیں سکتا اور اس میں داخل ہی نہیں ہوسکتا۔اسی کی طرف قرآن کریم میں نہایت لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (الفجر:30-31) یعنی جو لوگ اپنے اعمال سے خدا تعالیٰ کو راضی کریں گے وہی اس بات کے مستحق ہوں گے کہ ان کو کہا جاوے کہ اب وہ خدا کے بندے ہو گئے ہیں۔اور اس طرح خدا تعالیٰ کی جنت میں داخل ہونے کے مستحق ہو گئے ہیں......

(پس) اس میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا سوائے اس کے جو عبداللہ بن جائے اور یہی جنت میں داخل ہونے کا طبعی طریق ہے۔پس جنت کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کا بندہ بن جائے۔

عبودیت کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا عبد وہی ہوسکتا ہے جو دو فرض ادا کرے۔اول فرض یہ ہے کہ جو کام اس کے ذمہ لگائے گئے ہیں ان کو بجالائے۔یا جن کاموں کے کرنے سے اسے روکا گیا ہے اس سے بچے۔دوسرا فرض یہ ہے کہ اپنے آقا کے جو دوسرے عبد ہیں ان کو بھی ان کاموں کی طرف توجہ دلائے۔جب کوئی شخص ان دونوں فرضوں کو بجالاتا ہے تو پھر وہ عبد ہو جاتا ہے اور فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ کا مستحق ہو جاتا ہے۔یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہماری جماعت کو اس کی توفیق دی ہوئی ہے کہ وہ کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے عبد بنیں۔مگر باوجود اس کے میں کہتا ہوں جس کا انہوں نے عبد بننا ہے اس کی چونکہ بہت بڑی شان ہے اور اس کے جتنے اعلیٰ درجہ کے عبد بنتے جاؤ اس کی اور زیادہ شان

ظاہر ہوتی جاتی ہے اور عبودیت کے اور راستے کھلتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا انسان جو کہتا ہے کہ میری نمازیں، میری قربانیاں، میری زندگی اور میری موت سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے وہ بھی عبودیت میں آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ پس تم لوگوں کو بھی اپنی کوشش اور سعی میں ہر وقت لگے رہنا چاہئے۔ اور یادرکھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کا عبد بننا کوئی معمولی بات نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اور انسان عبودیت میں جتنی کوشش کرے اتنا ہی بڑھ سکتا ہے۔ پس آپ لوگ جو کوشش کرتے ہیں۔ اس میں اور بہت زیادہ زیادتی کی ضرورت ہے اور میں نصیحت کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کا عبد بننے کے لئے اپنی کوششوں کو اور زیادہ بڑھاؤ اور یادرکھو کہ انسان جب تک اپنے آپ کو فنا نہیں کر دیتا خدا تعالیٰ کا عبد نہیں بن سکتا۔ اور جب وہ عبد بن جاتا ہے تو پھر کوئی اسے فنا نہیں کر سکتا۔

میں اس موقع پر آپ لوگوں کو خدا کے ایک عبد کا واقعہ سُناتا ہوں جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ خدا کا عبد کس شان کا آدمی ہوتا ہے۔ لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لے جانے پر یہود نے آپؐ کی روزمرہ ترقی کو دیکھ کر آپؐ کے خلاف کسریٰ کو اکسایا۔ اور کہلا بھیجا کہ اس شخص کی بڑھتی ہوئی طاقت سے آپ کو نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس نے بلا تحقیق یمن کے گورنر کے نام خط لکھ بھیجا کہ میں نے سُنا ہے ایک ایسا ایسا شخص ہے تم اس حکم کے پہنچتے ہی اسے گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ حجاز کا علاقہ کسریٰ کی حکومت میں نہ تھا مگر یمن پر اس کی حکومت تھی۔ اور اس کے اقتدار کے مقابلہ میں حجاز کے لوگوں کو بھی چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔ اور گو وہ اس کے ماتحت نہ تھے مگر اس کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں تو حجاز کے لوگوں کو کسریٰ کا حکم بُرا ماننے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ وہ خود چاہتے تھے کہ اس شخص کو کوئی سزا دے۔ جب یمن کے گورنر کے نام یہ حکم پہنچا تو اس

نے اپنے دو معتبر آدمیوں کی معرفت آپؐ کے نام حکم بھیجا کہ آپؐ فوراً یمن پہنچ جاویں تا کہ آپؐ کو کسریٰ کے حضور حاضر کیا جاوے۔ یہ لوگ جب رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور آپؐ کو اطلاع دی تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ آپؐ جانے سے انکار نہ کریں۔ اس حکم میں انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے یہ بہت سخت اور تاکیدی حکم ہے اگر اس حکم کی اتباع کریں گے تو بازان گورنر یمن آپؐ کی سفارش کر دے گا اور اس سے آپؐ کو فائدہ پہنچ جاوے گا لیکن اگر آپؐ نے اس حکم کو قبول نہ کیا تو پھر آپؐ کسریٰ کو جانتے ہیں وہ آپؐ کو اور آپؐ کی قوم کو اور آپ کے ملک کو ہلاک و برباد کر دے گا۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں اس بات کا جواب کل دوں گا۔ رات کو آپؐ کو وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا کہ کسریٰ کو اس کے بیٹے نے مار دیا ہے۔ آپؐ نے دوسرے دن اس کو بلا کر کہہ دیا کہ جاؤ تمہارے خدا کو میرے خدا نے مار دیا ہے۔ یعنی کسریٰ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بیٹے ہی کے ہاتھوں مروا دیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ آپؐ کیا کہہ رہے ہیں۔ کچھ انجام سوچیں معلوم بھی ہے کہ یہ بات کتنی بڑی ہے۔ آپؐ نے فرمایا حق یہی ہے جو میں کہتا ہوں۔ جاؤ اور اپنے بادشاہ کو اطلاع دے دو۔ وہ لوگ واپس چلے گئے اور جا کر گورنر یمن کو اطلاع دی۔ گورنر یمن نے کہا۔ اچھا چند روز ہم لوگ انتظار کر کے دیکھتے ہیں کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ آخر کچھ مدت کے بعد اس کے نام ایک شاہی فرمان پہنچا۔ جب اس نے کھولا تو وہ نئے بادشاہ کی طرف سے تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ ہم نے اپنے باپ کو فارس کی خیر خواہی سے مجبور ہو کر مار دیا ہے کیونکہ وہ ظالم تھا اور بے گناہ اور بلا سبب شرفاء ملک کو قتل کر رہا تھا۔ اور اب ہم اس کی جگہ بادشاہ ہیں۔ تم اپنے علاقہ میں ہماری اطلاع کا سب سے اقرار لو اور ہمارے باپ نے جو ایک خط عرب کے ایک شخص کے متعلق لکھا تھا کہ اسے پکڑ کر بھیج دو اس حکم کو منسوخ سمجھو۔ اور جب تک اس کے متعلق کوئی اطلاع نہ آوے اس کے متعلق کوئی اور کارروائی نہ کرو۔ (زرقانی جلد 3 ص342 مطبوعہ مصر۔ فتح الباری لابن حجر عسقلانی جلد 8 ص127)

خدا تعالیٰ کے عبد کی یہ شان ہوتی ہے لیکن عبد بننا آسان نہیں۔ سخت محنتوں اور مشقتوں سے انسان عبد بن سکتا ہے۔ بغیر اپنے نفس کے مار دینے کے کوئی شخص عبد نہیں بن سکتا۔ پہلے اپنے آپ کو مٹا دے تب غلام بنے۔ کیونکہ غلام کے لئے شرط ہے کہ کوئی ''میں'' اس کی اپنی نہ ہو سب کچھ اس کے مالک کا ہو۔

پس جب تک انانیت بالکل نہ مٹ جائے اس وقت تک انسان عبد نہیں بن سکتا۔ اور جب تک عبد نہ بنے اس وقت تک اسے خدا تعالیٰ مل نہیں سکتا۔ لوگ انانیت کے معنی تکبر اور غرور وغیرہ کے کرتے ہیں جو ٹھیک ہیں مگر ساتھ ہی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ لفظ انا سے نکلا ہے اور جب تک انا ''میں'' نہ مٹ جائے خدا تعالیٰ کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی ...... کہ آپؐ نے اپنے نفس کو قتل کر دیا مگر ایسا قتل کیا کہ اس سے ہزاروں زندہ ہو گئے۔ تو جب تک انسان اپنے نفس کو قتل نہ کرے۔ اس وقت تک خدا تعالیٰ کا عبد نہیں کہلا سکتا۔ اور خدا تعالیٰ کے لئے جب تک ''میں'' نہ ٹوٹے کوئی انسان عبد نہیں ہو سکتا کیونکہ ''میں'' کہنے والا عبد نہیں سمجھا جا سکتا۔

پس تم لوگ اپنے اندر عبودیت پیدا کرو اور یہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں دو ذریعوں سے ہو سکتی ہے۔

اول ذریعہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں یہ ہے کہ انسان ان فرائض کو پورا کرے جو اسے کے ذمہ لگائے گئے ہیں اور اُن باتوں سے بچے جن سے منع کیا گیا ہے......

انسان کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ظاہری اعمال بھی رکھے ہیں اور باطنی بھی۔ ظاہری میں تو یہ رکھا ہے کہ لوگ مسجدوں میں اکٹھے ہو کر نمازیں پڑھیں۔ (ترمذی ابواب الصلوۃ باب ماجاء فیمن سمع النداء فلا یجیب) اور باطن میں یہ رکھا ہے کہ اپنے گھروں میں بھی نمازیں پڑھی جائیں۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ جو لوگ اپنے گھروں میں نمازیں نہیں پڑھتے ان کے

گھر نہیں بلکہ قبریں ہیں۔ (مسلم کتاب المساجد)

مخفی امور میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان اپنے عقائد درست رکھے۔جس طرح اسلام کے بتائے ہوئے عقائد کو ماننے کا حق ہے اسی طرح مانے۔ورنہ اس وقت تک کوئی انسان عبد نہیں کہلا سکتا جب تک اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے متعلق وہی خیالات نہ ہوں جو خدا تعالیٰ نے رکھنے کا حکم دیا ہے۔

تو عبد بننے کے لئے پہلا فرض یہ ہے کہ انسان مخفی فرائض کو ادا کرے یعنی اپنے عقائد کو درست کرے۔پھر یہ فرض ہے کہ ایسی عبادات جن کو مخفی طور پر بجالانے کا حکم ہے ان کو بجالائے۔مثلاً مخفی صدقہ دے۔مخفی طور پر نمازیں پڑھے۔پھر زبان کے لحاظ سے مخفی اعمال یہ ہیں کہ قرآن کریم پڑھے خدا تعالیٰ کی تسبیح کرے۔

پس عبد بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اعتقادات درست ہوں ........... انسان اپنے آقا کو جانے کہ وہ کیا ہے۔کیونکہ اگر وہ اپنے آقا کی صفات کو نہیں جانتا۔تو ممکن ہے کہ اسے غلطی لگ جائے اس کے لئے یہی طریق ہے کہ اسلام نے جو باتیں خدا تعالیٰ کے معلق بتائی ہیں ان کا اپنے دل پر نقش کرے۔یہ پہلا فرض ہے۔اور دوسرا فرض یہ ہے کہ زبان سے مخفی طور پر خدا تعالیٰ کی صفات بیان کرے۔اور تیسرا یہ کہ مخفی طور پر اعمال کرے۔

پھر اس کے ساتھ دوسری شق کو بھی نہ چھوڑے یعنی ظاہری اعمال کو بھی ترک نہ کرے۔ان ظاہری اعمال میں سے اہم ترین اعمال عبادات ہیں۔اور ان میں سے بھی اہم نماز ہے۔جب تک کوئی انسان اس فرض کو پورے طور پر ادا نہیں کرتا۔خدا تعالیٰ کا عبد نہیں ہوسکتا۔اور اگر کوئی باوجود اس فرض کے ادا نہ کرنے کے اپنے آپ کو عبدوں میں شمار کرتا رہے تو وہ ویسا ہی عبد ہے جیسا کہ وہ بھیگی ہوئی بلی پر ہاتھ لگا کر جواب دینے والا نوکر تھا۔پس یہ بہت بڑا فرض ہے۔مگر افسوس ہے کہ بہت لوگ اس

کی طرف توجہ نہیں کرتے۔حالانکہ عبد کا یہی کام نہیں کہ اپنے آقا کی پوشیدہ طور پر خدمت کرے۔اور پوشیدہ طور پر اس کے احکام کی تعمیل کرے۔بلکہ یہ بھی ہے کہ ظاہری طور پر اس کے احکام کو بجالائے کیونکہ جو ظاہری طور پر اپنے آقا کی خدمت نہیں کرتا اور اس کے احکام بجا نہیں لاتا اس میں عجب اور تکبر پایا جاتا ہے......پس اگر تم خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو۔مگر اپنے گھروں میں نمازیں پڑھتے ہو۔اور مسجد میں اللہ اکبر کر کے لوگوں کو نہیں بتاتے کہ ہم خدا تعالیٰ کے بندے اور عبد ہیں تو معلوم ہوا کہ تم میں عجب پایا جاتا ہے۔اور معلوم ہوا کہ تم خدا تعالیٰ کے شریک بنتے ہو۔اور اپنے آپ کو بھی کچھ سمجھتے ہو۔مگر یاد رکھو جب تک تم علی الاعلان یہ نہ کہو کہ ہم خدا کے غلام ہیں۔اس وقت تک تم خدا کے عبد نہیں بن سکتے۔اور اس کا یہی طریق ہے کہ مسجدوں میں آکر اپنی غلامی کا اقرار کرو۔اور اپنے سر کو خدا تعالیٰ کے حضور جھکاؤ۔یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی جماعت کو بارہا اس طرف توجہ دلائی ہے اور اب پھر دلاتا ہوں کہ تم لوگ جب تک اس طرف توجہ نہ کرو گے اس وقت تک تم خدا تعالیٰ کے عبد کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔مسجدوں کو چھوڑ کر گھروں میں تمہارا نماز پڑھنا تمہارے عجب کی علامت کو ظاہر کرتا ہے......

غرض نماز باجماعت بہت بڑا فرض ہے اور اتنا بڑا فرض ہے کہ اس کو پورا کئے بغیر کوئی انسان خدا تعالیٰ کا عبد نہیں بن سکتا۔پس میں آپ لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ یہ سب سے بڑا فرض ہے جس کو ادا کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔اپنا نقصان کر کے تکلیف اٹھا کر جہاں تک بھی ہو سکے مسجدوں میں آؤ اور باجماعت نماز ادا کیا کرو۔کیونکہ اس کے بغیر تم خدا تعالیٰ کے عبد نہیں ہو سکتے۔اس کے بعد اور بھی طریق ہیں مثلاً حج کرنا ظاہری طور پر صدقات دینا، رمضان کے روزے رکھنا، یہ ظاہری عبادات ہیں۔

اعمال ظاہری کا دوسرا رکن معاملات ہیں ۔معاملات کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے احکام دیئے ہیں ۔اور جب تک معاملات کو درست نہ کیا جائے اس وقت تک بھی انسان خدا تعالیٰ کا عبد نہیں بن سکتا...... پہلے تو خدا سے بندے کے تعلقات تھے اور یہ بندے کے بندے سے تعلق ہیں ۔گویا اعمال ظاہری کی بھی دو لاتیں ہیں جن کے ذریعہ انسان کھڑا ہو سکتا ہے ۔اور جو اِن سے محروم ہو وہ خدا تعالیٰ کا عبد ہونے کے مقام پر کھڑا نہیں رہ سکتا......

پس یہ مت خیال کرو کہ خدا تعالیٰ کے عبد کامل یونہی بن سکتے ہو ۔اس کے کئی درجے ہیں ۔ابتداء میں یوں سہارا دینے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دلانے کے لئے خدا تعالیٰ فضل کر دیتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ تھکے ہوئے گھوڑے کو راستہ میں گھاس دکھا دی جاتی ہے تا کہ وہ دوڑے ۔لیکن اصل وقت اس کے گھاس کھانے کا وہی ہوتا ہے جب کہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے ۔تو ابتداء میں خدا تعالیٰ انسان کی ہمت بندھانے اور اسے اپنے انعام کا نمونہ دکھانے کے لئے کچھ دکھا دیتا ہے ۔جو پورے طور پر اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ انسان عبد بن جاتا ہے ۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں عبد بننے کے لئے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرنے کے ساتھ یہ بھی دیکھتا رہے کہ دوسرے عبد بھی اپنا کام دیانتداری سے ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ سچی ہمدردی اور خیر خواہی یہی ہوتی ہے کہ انسان نہ خود نقصان کرے اور نہ نقصان ہونے دے ۔کبھی کوئی نوکر وفادار نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ اپنے آقا کے مال کے ضائع ہونے کا ہر حالت میں خیال نہیں رکھتا خواہ وہ اس کے سپرد ہو خواہ غیر کے ۔اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے ۔ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:111) کہ اے مسلمانو! تم اچھے لوگ ہو خیر امت ہو

کیوں؟ اس لئے کہ تم لوگوں کے فائدہ کے لئے نکالے گئے ہو۔ یعنی تمہارا یہی کام نہیں کہ اپنے آپ کو نیک اور خدا کے عبد بناؤ بلکہ یہ بھی ہے کہ اوروں کو بھی ایسا ہی بنانے کی کوشش کرو۔ عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے اس لئے خیر امت کہا ہے کہ وہ دوسروں میں تبلیغ دین کرتے ہیں۔ مگر بات یہ نہیں بلکہ خیر امت لِلنّاس کی وجہ سے کہا گیا ہے یعنی تم سے پہلے تو لوگوں کے لئے محدود حلقے تبلیغ کے ہوتے تھے مگر تم کو ساری دنیا کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ورنہ تبلیغ تو پہلے نبیوں کے متبع بھی کرتے تھے۔ ان کو خیر امت کیوں نہ کہا گیا۔ اسی لئے کہ ان کا کام زیادہ وسیع اور ان کی ذمہ داری اتنی بڑی نہ تھی۔

تو یہ دوسرا فرض ہے جو اسلام نے خدا تعالیٰ کا عبد بننے کے لئے قرار دیا ہے۔ بے شک ہماری جماعت اس فرض کی ادائیگی کے لئے کوشش کرتی ہے۔ لیکن جس قدر کوشش کی جاتی ہے اس سے ہزاروں اور لاکھوں درجے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(خطبات جلسہ سالانہ 27 دسمبر 1919 از انوار العلوم جلد 4 ص 439-459)

پھر ایک اور موقع پر فرمایا۔

بندے کا تو فرض ہے کہ خالص اپنے آقا کے لئے ہو جائے مگر جب ایک آدمی خدا کے علاوہ اوروں کی پرستش کرتا ہے ان سے بھی نفع وضرر کی ویسی ہی اُمید رکھتا ہے جیسے کہ خدا سے تو کیوں کر وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بندہ کہہ سکتا ہے اور اصل بندہ تو وہ ہے جو نفس مطمئنہ رکھتا ہے اور اس کا قلب خدا تعالیٰ کی الوہیت سے مطمئن ہے اور وہ کسی اور کو خدا تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہراتا۔ جو ایک خدا کو جو متصف ہے تمام نیک صفات سے اپنے لئے کافی سمجھتا ہے۔ اور جو عبودیت اور خالص بندگی سے آپ کو خدا تعالیٰ کا بندہ ہونے کے لائق بنا دیتا ہے......

مثال کے لئے دیکھو آنحضرت ﷺ بھی اسی خدا کے پیدا کئے ہوئے تھے اور ابوجہل بھی۔ مگر ابوجہل نے اپنی شرارت، فسق و فجور اور شرک سے اپنے آپ کو خدا کا بندہ ثابت نہ کیا بلکہ بتوں کا بندہ ثابت کیا اور انہیں کی طرف داری میں اپنی جان تک قربان کی۔ مگر آنحضرت ﷺ نے اپنے آپ کو خالص خدا کے لئے ہی کر دیا۔ شرک سے بکلی پرہیز کیا اور اپنی عبادات اور قربانیاں سب خدا کے لئے ہی مخصوص رکھیں اور اپنے آپ کو خدا کا بندہ ثابت کیا۔ پس خود مقابلہ کر کے دیکھ لو اس کا انجام کیا ہوا اور اس کا کیا؟ ابوجہل تو بدر کے میدان میں قتل کیا گیا اور ایک کنویں میں اس کی لاش پھینکی گئی اور اس کے مرتے وقت کی خواہش بھی پوری نہ ہوئی یعنی اس نے کہا تھا کہ میری گردن ذرا لمبی کر کے کاٹنا کیونکہ عرب کے معززین کی نشانی یہی ہوتی تھی مگر کاٹنے والے نے اس کی گردن سر کے پاس سے کاٹ کر ثابت کیا کہ شیطان کے دوست کبھی کامیاب نہیں ہوتے اور اسی وقت دوسری طرف آنحضرت ﷺ کو وہ فتح نصیب ہوئی کہ وہ خدا تعالیٰ کی جنت کے وارث نہ صرف عقبیٰ میں بلکہ اس دنیا میں بھی ثابت ہوئے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَادْخُلِیْ جَنَّتِی پس وہ انسان جو خدا تعالیٰ سے کامل تعلق کرنا چاہے وہ شرک کو چھوڑ دے۔ کیوں کہ خدا کو شرک پسند نہیں۔

(چشمہ توحید۔ انوار العلوم جلد اوّل ص8)

# ارشادات

# حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ

قُلْ مَایَعْبَؤُابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَاءُ کُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ نے فرمایا۔

جب خدا کا کوئی بندہ خدا کا ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا اُس کے ساتھ سلوک یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز جو خدا نے پیدا کی ہے۔اسی کی ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی اتنی رحمتیں اور اتنے فضل اور انعام اس بندے پر نازل ہوتے ہیں۔کہ جن کا حدو شمار نہیں

(خطبہ جمعہ 23ستمبر 1977ء۔خطبات ناصر جلد 7ص185)

تم نیک اعمال جتنے چاہو بجالاؤ، جب تک رحمیت کے ساتھ رحمانیت کا فیض شامل نہیں ہوگا تمہیں کوئی بدلہ نہیں مل سکتا۔اسی لئے جب یہ مضمون ختم کیا تو آخر میں بڑے پُرشوکت الفاظ میں یہ فرمایا قُلْ مَایَعْبَؤُابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَاءُ کُمْ فَقَدْ کَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا (الفرقان:78) یعنی یہ تو صحیح ہے کہ اعمال صالحہ بجالانا بھی ضروری ہے اور بد اعمال سے بچنا بھی انسان کے فائدہ کی چیز ہے لیکن یہ یاد رکھو تمہاری اور تمہاری نیکیوں کی تمہارے خدا کو کیا پروا ہے لَوْلَا دُعَاءُ کُمْ ہاں اگر تم اس کی پروا کرتے ہو تو اپنی دعاؤں سے اس کے فضل کو جذب کرو۔جب تم اپنی دعاؤں کے ساتھ اس کے فضل کو جذب کر لو گے تب تمہارے یہ اعمال تمہیں فائدہ پہنچا سکیں گے۔پھر دعا بھی بے معنی ہے جب دعا کے ساتھ قبولیت دعا حاصل نہ کی جائے۔دعا کی قبولیت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہی چاہئے اور اس کے لئے بھی دعا کرنی پڑتی ہے۔پس ہمیشہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ اے خدا! ہم کچھ کرتے ہیں یا نہیں کرتے ہم اعمال صالحہ کی قبولیت کے لئے جو دعائیں کرتے ہیں وہ بھی تجھ تک تبھی پہنچ سکتی ہیں کہ جب تو ہماری دعاؤں کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لے تو قبولیت دعا کے لئے پھر آگے دعا کی جاتی ہے۔پس اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ خدا کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں،

تمہارے اعمال کی کوئی پروانہیں، تمہاری قربانیوں کی کوئی پرواہ نہیں، جو تم صدقہ و خیرات اس کی راہ میں دیتے ہو اس کو ان کی کیا پروا ہے۔ اس کے خزانے کیا خالی ہیں کہ تمہارے مال کی اس کو پروا ہو؟ تم اس کے احکام بجالاتے ہو، انتہائی طور پر مجاہدہ کرتے ہو، کوشش کرتے ہو اس کی راہ میں، پھر بھی اسے تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ تمہیں ان تمام چیزوں کا فائدہ اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب تم دعا کے ذریعہ اس کے فضل کو جذب کرو۔ جب رحیمیت کے جلوہ کے ساتھ رحمانیت کا جلوہ بھی شامل ہو جائے تب تمہاری حقیر کوششیں بھی تمہیں ساتویں آسمان تک پہنچا سکتی ہیں۔ لیکن اگر تم یہ سمجھو کہ اس کے فضل کے بغیر تم پہلے آسمان پر بھی پہنچ سکتے ہو تو تم غلطی خوردہ ہو اس کے فضل کے بغیر تحت الثرای تک تو تم پہنچ سکتے ہو، شیطان کی گود میں تو تم جا سکتے ہو لیکن رحمٰن، خدا کی گود میں اس کے فضل اور رحم کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ تم اس حقیقت کو جھٹلاتے ہو تم میں سے بعض بظاہر بڑے متقی اور پرہیز گار ہیں لیکن وہ اپنے اعمال پر اپنی دعاؤں پر اور اپنی شب بیداری پر اور دنیا کے لوگوں کی خدمت جو وہ کرتے ہیں اس پر فخر کرنے والے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو ان کی کوئی پروانہیں ہے جب تک کہ وہ دعا کو اپنی تمام شرائط کے ساتھ نہ کریں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو قبول کر کے رحمانیت کے جوش میں ان کے اعمال کو قبول نہ کر لے۔ (خطبات ناصر جلد اول ص 723-724)

پھر ایک اور موقعہ پر فرمایا۔

عقل کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہمیں جو تعلیم دی ہے اس میں بھی وہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ فلاح اور کامیابی کے حصول کے لئے محض تدبیر کافی نہیں۔ الٰہی سلسلے دعا کے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ الفرقان کے آخر میں فرمایا ہے۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا (الفرقان:78)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے رسول! تو کہہ دے میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے اگر تمہاری طرف سے دعا نہ ہو۔ لَوْلَا دُعَاءُ کُمْ لغت میں ہے دَعَاہُ نَادَاہُ اس نے اس کو پکارا۔ رَغِبَ اِلَیْہِ (المنجد باب الدال)

اس کی طرف رغبت کی اِسْتِعَانَہٗ (المنجد باب الدال) اس سے مدد چاہی ان معنوں کی رو سے اس حصہ آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جب تک تم اللہ تعالیٰ کو اپنا مطلوب اپنا مقصود اور اپنا محبوب اس سے امداد حاصل کرنے کے لئے اور اس کی نصرت چاہنے کے لئے اسے نہیں پکارو گے تو مَایَعْبَؤُبِکُمْ رَبِی اُسے تمہاری کیا پرواہ ہو گی وہ یَعْبَؤُ کے مفہوم کے مطابق تم سے سلوک نہیں کرے گا۔ مَایَعْبَؤُا کی لغت میں یہ معنی ہیں کہ

مَاعَبَأْتُ بِہٖ أی لَمْ اُبَالِ بِہٖ وَأَصْلُہٗ مِنَ الْعَبْ ءِ أی الثِّقْلِ کَأَنَّہٗ قَالَ مَاأَ رىٰ لَہٗ وَزْنًا وَقَدْ رًاقَالَ:(قُلْ مَایَعْبَؤُبِکُمْ رَبِّیِ)وَقِیْلَ أَصْلُہٗ مِنْ عَبَأْتُ الطَّیِّبَ کَاَنَّہٗ قِیلَ مَایُبْقِیْکُمْ لَوْلَادُعَاءُ کُمْ،وَقِیْلَ عَبَأْتُ الْجَیْشَ وَعَبَّأْتُہٗ ھَیَّئْتُہٗ، وَعَبَاَةُ الجَاھِلِیَّةِ مَاھِیَ مُدَّخَرَةٌ فِی اَنْفُسِھِمْ مِنْ حَمِیَّتِھِمُ الْمذْ کُوْرَةِ فِی قَوْلِہٖ:(فِی قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاھِلِیَّةِ)(المفردات راغب۔ کتاب العین صفحہ 320)

ان معانی کی رو سے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عَبَأَ کے مفہوم والا سلوک تم سے کرے گا سوائے اس کے کہ تمہاری دعا اس کے جلوہ حسن و احسان کو جذب کر لے۔ اب یَعْبَؤُا کے چار معنی بنتے ہیں۔

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جب تم میرے حضور عاجزی اور انکساری کے ساتھ نہیں جھکو گے اور مجھ سے مدد طلب نہیں کرو گے اور میری قوت کاملہ پر بھروسہ نہیں کرو گے اور یہ یقین پیدا نہیں کرو گے کہ تم میرے فضل کے بغیر کامیاب نہیں

ہو سکتے اس وقت تک میری نظر میں تمہاری کوئی قدر و منزلت نہیں ہوگی اور تمہارے اعمال میری نظر میں کوئی وزن نہیں رکھیں گے۔

یَعْبَؤُا کے دوسرے معنوں کے مطابق اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ جب تم دعا سے کام نہیں لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری بقا کے سامان نہیں کرے گا۔ مَایُبْقِیکُمْ لَوْلَادُعَاؤُ کُمْ یعنی عاجزانہ دعاؤں کے بغیر تمہارے لئے قیومیت باری کے جلوے ظاہر نہیں ہوں گے۔

تیسرے معنوں کی رو سے قُلْ مَایَعْبَؤُ ابِکُمْ رَبِّی کی یہ تفسیر بنے گی کہ تمہیں جان لینا چاہئے تمہاری تیاریاں اس وقت تک تمہیں کامیابی کا منہ نہیں دکھا سکیں گی جب تک کہ آسمان سے ملائکہ کی افواج کا نزول نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میرے اذن اور حکم سے آسمان سے فرشتے اتریں اور تمہاری مدد کریں تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم دعا کے ذریعہ میری اس نعمت کو حاصل کرو۔ کیونکہ عَبَاتُ الْجَیْشَ کے معنی ھَیَّاتَہٗ یعنی لشکر کو پورے ساز و سامان کیساتھ تیار کر دیا اور اسے حکم دیا کہ جس مقصد کے لئے اسے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے حصول کے لئے باہر نکلے۔

چوتھے حمیت کے معنوں کی رو سے اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے غیرت نہیں رکھے گا اور غیرت نہیں دکھائے گا جب تک کہ تم دعاؤں کے ذریعہ سے اس کی غیرت کو تلاش نہ کرو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی ایک جگہ فرمایا ہے۔

اب غیروں سے لڑائی کے معنی ہی کیا ہوئے
تم خود ہی غیر بن کے محل سزا ہوئے

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص 26 مطبوعہ 1906ء۔ روحانی خزائن جلد 17 ص 79)

پس یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس غیریت کے پردہ کو صرف دعا ہی چاک کرسکتی ہے اگر تم دعاؤں کے ذریعہ اور میری محبت کے واسطے سے میری مدد اور نصرت کے متلاشی ہو گے تو میں ایسے سامان پیدا کردوں گا کہ ہمارے درمیان کوئی غیریت باقی نہیں رہے گی۔ تب میری غیرت تمہارے لئے جوش میں آئے گی اور تم اپنے مقاصد کو حاصل کرسکو گے۔

غرض اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے وسیع مضامین بیان کئے ہیں۔ جن کا اختصار کے ساتھ میں نے ذکر کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ یعنی تم لوگ دعا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس جماعت میں شامل نہیں ہوتے جو صبح شام دعاؤں میں مشغول رہنے والی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اس بات کو جھٹلا رہے ہو کہ دعا کے بغیر خدا تعالیٰ کی نگاہ میں نہ اعمال کا کوئی وزن ہے اور نہ کسی قوم یا کسی انسان کی کوئی قدرومنزلت ہے تم اس بات سے بھی انکاری ہو کہ تمہاری مدد کے لئے خدائے قیوم کے حکم، منشاء، اور ارادہ کی ضرورت ہے تم اس بات کو بھی جھٹلا رہے ہو کہ انسان کامیابی صرف اسی صورت میں حاصل کرسکتا ہے جب اس کے مقصد کے حصول کے لئے آسمان سے ملائکہ کی افواج نازل ہوں اور وہ بنی نوع انسان کے دلوں میں ایک پاک تبدیلی پیدا کردیں تم اس بات کو بھی جھٹلا رہے ہو کہ جب تک تم میں اور خدا تعالیٰ میں غیریت قائم رہے گی خدا تعالیٰ کی مدد نازل نہیں ہوگی۔

(خطبات ناصر جلد اوّل ص 197-200)

جس دائرہ کے اندر تم صاحب اختیار ہو اگر اس دائرہ میں تم اپنی فلاح اور بہبود چاہتے ہو، اگر اس دائرہ میں تم خدا تعالیٰ کی رحمتوں سے حصہ لینا چاہتے ہو، اس کی رضا پانا چاہتے ہو اور اس کی جنتوں میں داخل ہونا چاہتے ہو تو غفور اور رحیم خدا سے تعلق پیدا

کرواوران صفات کا واسطہ دے کراس سے دعائیں کرو کیونکہ اس کے بغیر انسان کی کوشش بے نتیجہ رہ جاتی ہے اور بے ثمر ہو جاتی ہے۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمیت اور اس کی مغفرت سے مدد حاصل کرو۔ اس کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُابِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَادُعَآؤُكُمْ (الفرقان:78) کہ اگر تم دعا کے ذریعے خدا تعالیٰ کی مغفرت اور رحیمیت اور خدا تعالیٰ کی دوسری صفات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرو گے تو پھر خدا تعالیٰ تمہاری کیا پرواہ کرے گا۔ دعا ہی ہے جو خدا تعالیٰ کی رحمتوں کو جذب کرتی ہے۔ اگر تم بندہ ہونے کے باوجود اس سے دعا نہیں کرو گے اور اس کی پرواہ نہیں کرو گے تو وہ تو غنی اور حمید ہے وہ غنی ہوتے ہوئے تمہاری کیا پرواہ کرے گا اس کو تو تمہاری حاجت نہیں تمہیں اس کی احتیاج ہے۔

(خطبات ناصر جلد7ص259)

اس کے فضل سے بشاشت کے ساتھ ہمیں عمل کرنے کی توفیق مل جائے اور ہمارے ایمان اس کی رحمت سے مضبوط ہو جائیں خود انسان کچھ نہیں کر سکتا انسان کو بھکنا نہیں چاہئے انسان کو یہ نہیں زیب دیتا کہ وہ اپنے نفس کو فربہ کرے۔ انسان کو یہ نہیں چاہئے کہ وہ خود نمائی کرے وہ اپنے کو کچھ سمجھے اور اس کا اظہار کرے عاجزی اس کی حقیقت اور عاجزانہ راہیں اس کا طریق ہونا چاہئے۔ فرمایا مَا يَعْبَؤُابِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَادُعَآءُ كُمْ (الفرقان:78) اللہ تعالیٰ کی ذات تو غنی ہے اسے تو تمہاری احتیاج نہیں ہے تمہیں اس کی احتیاج ہے اگر تم اس احتیاج کا احساس نہ رکھتے ہو، تو تم مارے گئے تم ہلاک ہو گے مَا يَعْبَؤُابِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَادُعَآءُ كُمْ اگر تم دعا کے ذریعہ سے اس غنی کے دروازے کو نہیں کھٹکھٹاؤ گے (جسے تمہاری احتیاج نہیں جس کی تمہیں ہر آن احتیاج ہے) تو مارے جاؤ گے پس بے پرواہ نہیں ہونا چاہئے غافل نہیں ہونا چاہیے جس طرح اسے جو ہمارا محبوب اور پیارا آقا ہے نیند نہیں آتی اور اونگھ نہیں آتی، اسی

طرح تم بھی جس حد تک تمہیں خدا نے طاقت اور توفیق دی ہے بیدار رہنے کی کوشش کروتا کہ تم خواہ چھوٹے سے پیمانہ پر ہی سہی، اس کی اس صفت کے (جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے کہ نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ آتی ہے ) اپنی استعداد کے مطابق اپنی طاقت کے لحاظ سے مظہر بنو۔ یہ درست ہے، لیکن تمہارے دل میں یہ بڑی شدید خواہش ہونی چاہئے کہ اس کی ہر صفت کا ہم نے مظہر بننا ہے اور اس صفت کا بھی ہم نے مظہر بننا ہے جب یہ ہوگا، جب تمہیں اپنا پتہ لگ جائے گا کہ تم کچھ بھی نہیں، جب تم کو اس کا علم اور اس کی معرفت حاصل ہو جائے گی کہ وہی سب کچھ ہے وہی سب طاقتوں والا ہے جب تم یہ پہچان لو گے کہ اسے تمہاری ضرورت اور احتیاج نہیں، جب تم اس کی یہ معرفت حاصل کر لو گے کہ تمہیں ہر چیز میں اس کی احتیاج ہے تو پھر وہ تمہیں مل جائے گا، پھر وہ تمہاری دعاؤں کو قبول کرے گا۔ اور اپنی قدرت کے نشارت تمہارے لئے ظاہر کرے گا۔

(خطبات ناصر جلد 3 ص 393)

پس دعائیں کریں اور بہت دعائیں کریں۔ حقیقت یہی ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآءُ كُمْ (الفرقان:78)

ساری خیر اور برکت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس سے ایسا تعلق ہو جس سے مجبور ہو کر انسان پورا سہارا اور توکّل اس کی ذات پر کرتا اور دُعا کے ذریعہ اس کی رحمت کو جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز ہے جس کے نتیجہ میں انسان کو رحمت ملتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان کو فضل ملتا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کو خوش حالی ملتی ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ دن ملے گا جس دن ہر انسان اس لئے خوش ہوگا کہ اس کا دل محمد ﷺ کے لائے ہوئے نور سے منوّر ہو گیا اور اپنے پیدا کرنے والے رب سے اس کا تعلق قائم ہو گیا۔

(خطبات ناصر جلد 3 ص 467)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ اس آیت کریمہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اَلَّا لِیَعْبُدُوْدِ(الذّریت:57) کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

عبد بننے کے لئے صرف انسان کو پیدا کیا گیا۔اس کائنات کی بے شمار مخلوق میں سے کسی اور چیز کو عبد بننے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ان کی کیفیت یَفْعَلُوْنَ مَایُؤْمَرُوْنَ(النحل: 51) خدا تعالیٰ حکم دیتا چلا جاتا ہے وہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ان کو نافرمانی کی طاقت بھی نہیں ملی۔اس کا احساس بھی نہیں کیونکہ وہ کرتے ہی نہیں لیکن چونکہ انسان ایک بلند مقصد کے لئے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ خدا کا عبد بنے اور اس کے پیار کو حاصل کرے اس لئے صرف انسان کے ساتھ یہ لگایا کہ دعا کرو، ملے گا۔دعا نہیں کرو گے نہیں ملے گا یعنی عبد بننے کے لئے ،اپنی انسانی زندگی میں کامیابی کے لئے ،خدا تعالیٰ کے پیار کے حصول کے لئے ،خدا تعالیٰ کی نگاہ میں عزت اور پیار دیکھنے کے لئے ،خدا تعالیٰ کا محبوب بننے کے لئے بے شمار عمل کرنے پڑتے ہیں جنہیں اسلامی اصطلاح میں اعمال صالحہ کہا جاتا ہے۔انسانی زندگی کا ہر فعل اسی غرض کے لیے ہونا چاہئے اور انسانی زندگی کے ہر فعل کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے دعا کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو فرمایا آنحضرت ﷺ کے ذریعہ یہ اعلان ہوا مَایَعْبَؤُابِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَادُعَآءُ کُمْ(الفرقان:78) عربی زبان میں یَعْبَؤُا کے کیا معنی ہیں۔اس کے معنی ہمیں بتائیں گے کہ خدا تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے۔

منجد ایک چھوٹی کتاب ہے لغت کی اُس نے تو یہ لکھا ہے۔

لَااَعْبَأُ بِہٖ اَیْ لَااُبَالِیْ بِہٖ اِحْتِقَارًا کہ حقارت کے نتیجہ میں جو یعنی خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ میرے اندر تمہارے لئے تحقیر پیدا ہو گئی اور میں تمہاری پرواہ نہیں کروں گا اگر تم دعا نہیں کرو گے۔

مفردات نے اس کے معنی کئے ہیں مَاعَبَأْتُ بِہٖ اَیْ لَمْ اُبَالِ بِہٖ کَاَنَّہٗ

قَالَ یعنی آپ کہتے ہیں کہ گویا خدا نے یہ اعلان کیا مَااَرَی لَہٗ وَزْنًا وَقَدْرًا کوئی قدر میرے دل میں ایسے بندہ کے لئے نہیں ہوگی، نہ کوئی مقام ہوگا اس کے لئے اگر وہ دعا نہیں کرتا۔ پس جس طرح ہمارے جسم کے ساتھ دل کی دھڑکن اور خون کی روانی لگی ہوئی ہے اسی طرح ہماری روح کے ساتھ دعا لگی ہوئی ہے اگر انسان سمجھے۔ اسی لئے حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز کے حصول کے لئے اپنے آپ کو کچھ سمجھ نہ لینا، خدا سے مانگنا یہاں تک کہ اگر تمہارے بوٹ کا تسمہ ٹوٹ جائے تو بوٹ کا تسمہ بھی اپنے خدا سے مانگنا اور خود میرے مشاہدہ میں ہے کہ بعض دفعہ ایک انسان ایک چھوٹی سی غرض کیحصول کے لئے سائیکل پر سوار ہوتا اور چند فرلانگ پر اس نے جانا ہے اور غرض کو پورا کرنے کے لئے اگر مقبول دعا کئے بغیر وہ روانہ ہو جاتا ہے تو مقصود تک پہنچنے سے پہلے راستہ میں اس کا دم نکل جاتا ہے۔

زندگی اور موت کسی کے اختیار میں نہیں۔ روحانی طور پر اور اخلاقی لحاظ سے کامیابیاں اور ناکامی بھی کسی کے اختیار میں نہیں۔ خدا تعالیٰ کی نظر سے گر جانا اور خدا تعالیٰ کی نظر میں پیار دیکھنا، یہ بھی کسی کے اختیار میں نہیں۔ خدا تعالیٰ کی درگاہ تک پہنچ جانا یا درگاہ سے دھتکارا جانا، یہ بھی کسی کے اختیار میں نہیں۔ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

(خطبات ناصر جلد9ص420-421)

خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اَلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت: 57) کہ میں نے انسان کو اس لئے بنایا کہ وہ اپنی کوشش سے میری صفات کا رنگ اپنی صفات میں بھرے۔ میرا عبد بنے۔ اگر اس قسم کی مخلوق کو عبد کہا جائے جیسے مثلاً فرشتے ہیں۔ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (النحل:51) کہ خدا جو حکم دیتا ہے کرتے ہیں۔

(خطبات ناصر جلد8ص27)

اے شخص! تجھے میں نے پیدا کیا تھا اس لئے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ

اِلَّالِیَعْبُدُوْن(الذّٰریٰت: 57) تا کہ تو میرا بندہ بنے۔تا کہ تو تخلق باخلاق اللہ کرے۔میرے اخلاق کا رنگ تیرے اعمال میں سے ظاہر ہو۔تو نے تو میری پرواہ ہی کوئی نہ کی۔تو نے میرے اس نور کو چھوڑ کے شیطانی ظلمات کو ترجیح دی۔تو نے میرے حسن کو نظر انداز کر کے انتہائی بدصورتی جو ہے شیطان کی،اس کو اچھا سمجھا اس واسطے میرے سے کوئی تعلق نہیں۔مقام قرب سے میں تجھے رد کر رہا ہوں۔

(خطبات ناصر جلد9ص458)

انسان زمینی گراوٹ کے لئے نہیں پیدا کیا گیا انسان کو مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اَلَّالِیَعْبُدُوْن (الذّٰریٰت:57) کی آیت جس کی طرف اشارہ کرتی ہے آسمانوں کی بلندیوں کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔نبی کریم ﷺ نے یہ بشارت دی امّت مسلمہ کو کہ جب تم میں سے کوئی عاجزی،انکساری اور تواضع کی راہوں کو اختیار کرے گا رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ (کنزالعمال جلد2ص25) ساتویں آسمان کی بلندیاں اسے حاصل ہو جائیں گی۔

(خطبات ناصر جلد9ص300)

ہمیں کیوں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن (الذاریات:57) اس لئے پیدا کیا کہ ہم اس کے عبد بنیں۔اس کا رنگ اپنی زندگی پہ چڑھائیں۔اس کے ہم رنگ ہو جائیں۔وہ پاک ہے پاکیزگی اس کے فضل سے ہماری زندگی میں پیدا ہو اور ایک ذاتی تعلق،زندہ تعلق،زندہ خدا کے ساتھ ہو جائے جس کے نتیجہ میں ہر وہ رحمت جو مل سکتی ہے وہ ہمیں ملے“

(خطبہ جمعہ 10جولائی 1981ء خطبات ناصر جلد 9 ص 173)

# ارشادات

## حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے اپنی خلافت کے آغاز پر ہی مؤرخہ 25 جون 1982ء کو سورۃ الفرقان کی آیت 75 کی تلاوت فرما کر عبادالرحمن کے اوصاف بیان فرمائے اور اس تعلق میں خلیفہ اور جماعت کا تعلق بیان فرما کر اس دُعا کو کثرت کے ساتھ پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا۔

☆ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ مِنْ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا○ (الفرقان:75)

یہ آیت کریمہ جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس میں دعا کی صورت میں مومنوں کو کچھ ہدایات عطا فرمائی گئی ہیں ان میں سے دو کی طرف میں خصوصیت کے ساتھ آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ فرمائی گئی ہے کہ مومن اپنے رب سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے آقا! تو ہی ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کے سامان پیدا فرما اور دوسری درخواست یہ کی گئی کہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا یہ سامان کچھ اس رنگ کا ہو کہ ہم متقیوں کے سربراہ بنیں متقیوں کے پیشوا کہلائیں۔ متقیوں کے آباء واجداد بن کر تاریخ میں چمکیں۔ فاسق اولاد پیچھے نہ چھوڑ کر جائیں اس میں پہلی قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ ہم آنکھوں کی ٹھندک کی جو دعا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو اس کی درخواست کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے قابل قدر آنکھوں کی ٹھنڈک، آنکھوں کی حقیقی ٹھنڈک، آنکھوں کی وہ ٹھنڈک جو دراصل ذکر کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اولاد متقی بن جائے اور کسی کو اس سے زیادہ آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی اولاد

کو متقی دیکھ لے۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے بڑے بے ساختہ اور پیارے انداز میں اس مضمون کو یوں بیان فرمایا ایک دعا کی شکل میں اپنے رب کے حضور عرض کرتے ہیں۔

یہ ہو میں دیکھ لوں تقویٰ سبھی کا
جب آئے وقت میری واپسی کا

(درثمین)

کہ اے میرے آقا! آخری نگاہ جو میری اپنی اولاد پر پڑ رہی ہو وہ ایسی ہو کہ میں ان کو متقی حالت میں دیکھ کر دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ سب سے زیادہ معراج آنکھوں کی ٹھنڈک کا اس وقت انسان چاہتا ہے جب وہ زندگی کے انجام تک پہنچ کر آخری نگاہیں ڈال رہا ہوتا ہے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کا خلاصہ یوں بیان فرمایا:

یہ ہو میں دیکھ لوں تقویٰ سبھی کا
جب آئے وقت میری واپسی کا

(درثمین)

پس سب سے پہلے تو جماعت احمدیہ کو خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ کرنی چاہئے کہ ہم لوگ نیک اولاد پیچھے چھوڑ کر جانے والے بنیں۔ فاسق اور بد اولاد پیچھے چھوڑ کر جانے والے نہ بنیں اور یہ چیز دعا کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ نصیحت ہی دعا کے رنگ میں ہمیں سکھائی گئی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ دعائیں کرو گے تو اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کر سکو گے اگر محض اپنی تربیتوں پر انحصار کرو گے یا اپنی کوششوں پر بھروسہ کرو گے تو یہ اعلیٰ مقصد تمہیں نصیب نہیں ہو گا۔

پس بہت دعا کرنی چاہیے اپنی اولاد کے لئے اور دعا صرف بچوں کی پیدائش

کے بعد ہی نہیں پیدائش سے پہلے بھی کرنی چاہئے بعض دفعہ تو انبیاء نے ایسی دعائیں کیں کہ سینکڑوں سال بلکہ ہزاروں سال بعد آنے والوں کے لئے بھی انہوں نے دعائیں کیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰہ و السلام نے خانہ کعبہ کی عمارت کو اٹھاتے ہوئے آنحضرت سید ولد آدم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو دعائیں کیں وہ ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والے ایک بچہ ہی کے لئے تو دعا تھی پس صرف یہی نہیں کہ اپنی اس اولاد کے لئے دعائیں کریں جو آپ کے سامنے حاضر طور پر پیش ہو چکی ہوں بلکہ اس اولاد کے لئے بھی دعائیں کریں جس کا کوئی وجود ابھی نہیں بنا۔ اس اولاد کے لئے بھی دعائیں کریں جو نسلا بعد نسل پیدا ہوتی چلی جائے گی اور قیامت تک آپ کی ذریت کے طور پر دنیا میں باقی رہے گی تو ان سب کے لئے تقویٰ کی دعا کو اوّلیت دیں اور سب سے زیادہ اسی دعا کی طرف توجہ کریں۔

دوسری بات میں یہ بیان کرنی چاہتا ہوں کہ وَ اجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا میں اسلامی نظریہ قیادت پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں قیادت اور سرداری کا تصور دنیا کی دوسری قوموں کے قیادت اور سرداری کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ محض قوموں کی سرداری عطا ہو جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا اگر فاسقوں، بدکاروں، بے عمل لوگوں کی سرداری نصیب ہو تو وہ سرداری بجائے فخر کے ایک لعنت بن جاتی ہے۔ چنانچہ فرعون کو جس قوم کی سرداری نصیب ہوئی `وہ اس کے لیے بھی لعنت تھی اور قوم کے لیے وہ سرداری لعنت بن گئی۔ پس اللہ تعالے فرماتا ہے کہ سرداری کو اہمیت محض تقویٰ کے اوپر ہے۔ اگر متقی لوگ تمہارے پیچھے ہوں گے اگر متقی لوگ تمہارے پیروکار بنیں گے تو اس سرداری کو قابل توجہ، قابل فخر تو نہیں کہہ سکتے مگر اس لائق ہے کہ اللہ کے حضور دعائیں کر کے ایسی سرداری حاصل کی جائے یہی سرداری ہے جس کی دونیا و آخرت میں اللہ کی نظر میں کوئی قیمت ہے۔ اس کے سوا

سیادت اور قیادت کے کوئی بھی معنے نہیں۔

پس اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو خلافت احمدیہ کی طاقت کا راز دو باتوں میں نظر آتا ہے۔ ایک خلیفۂ وقت کے اپنے تقویٰ میں اور ایک جماعت احمدیہ کے مجموعی تقویٰ میں۔ جماعت کا جتنا تقویٰ من حیث الجماعت بڑھے گا احمدیت میں اتنی ہی زیادہ عظمت اور قوت پیدا ہوگی۔ خلیفۂ وقت کا ذاتی تقویٰ جتنا ترقی کرے گا اتنی ہی اچھی سیادت اور قیادت جماعت کو نصیب ہوگی۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت ایک ہی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر ترقی کرتی ہیں۔

پس ہماری دعا ہونی چاہیئے آپ کی میرے لیے اور میری آپ کے لیے آپ اپنے رب کے حضور گریہ وزاری کرتے ہوئے ہمیشہ یہ دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالے مجھے تقویٰ نصیب فرمائے۔ ایسا تقویٰ جو اس کی نظر میں قبولیت اور اس کی درگاہ میں مقبولیت کے قابل ہو اور میری ہمیشہ یہ دعا رہے گی کہ مجھے بھی اور آپ کو بھی اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا فرمائے کیونکہ بحیثیت آپ کے امام کے اور بحیثیت خلیفۃ المسیح کے مجھے جتنی زیادہ متقیوں کی جماعت نصیب ہوگی اتنی ہی زیادہ ہم اسلام کی عظیم الشان خدمت کر سکیں گے۔ احمدیت کو اتنی ہی زیادہ قوت نصیب ہوگی اتنی ہی زیادہ احمدیت کو عظمت نصیب ہوگی محض اعداد کی کوئی بھی حقیقت نہیں ہے روحانی دنیا میں اعداد کے ساتھ فضیلتیں نہیں ناپی جاتیں جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تو ساری دنیا کی کل قیمت ایک وجود یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقابل پر آپؐ کی جوتی کی خاک کے برابر بھی نہیں تھی۔ وہ ایک ہی وجود تھا جو اس دنیا میں خدا کا قائم مقام تھا اور وہ ایک ہی وجود تھا جس کی خاطر ساری کائنات کو قربان کر دیا جاتا تو عرش الٰہی میں ایک ذرا بھی ارتعاش پیدا نہ ہوتا۔

پس حقیقت میں خدا تعالیٰ کے ہاں قیمت اقدار کی ہوا کرتی ہے تعداد کی کوئی

قیمت نہیں ہوتی اور وہی تعداد باعث برکت ہوتی ہے جو اعلیٰ اقدار کے نتیجہ میں خود بخود نصیب ہو جایا کرتی ہے جب کسی قوم میں زندہ رہنے کی قدریں پیدا ہو جائیں جب تقویٰ کا معیار بلند ہو جائے تو اتنی عظیم الشان مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ باہر کی دنیا کی تعداد خود بخود کھنچتی چلی آتی ہے اور تقویٰ والوں کے ساتھ آکر ہم آہنگ ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی تقدیر ظاہر ہوتی ہے اور عددی غلبہ بھی نصیب ہو جاتا ہے مگر اس عددی غلبہ کی قیمت، اس کی حیثیت محض یہ ہے کہ اگر یہ تقویٰ کے تابع نصیب ہو تو قدر کے لائق ہے اگر یہ تقویٰ کے تابع نصیب نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

پس ہمیں دوسری دعا یہ بھی کرتے رہنا چاہئے کہ اللہ کی نظر میں ہم متقیوں کی وہ جماعت ہوں جن کے مقابل پر اللہ کی نظر میں دنیا کی ہر دوسری چیز قربان کئے جانے کے لائق ہو اور دنیا میں ایک عظیم الشان معجزہ رونما ہو کہ متقیوں کی یہ جماعت جو ساری کائنات کی سردار مقرر کی گئی ہے۔ یہ ساری دنیا کی خادم بن کر ان پر نچھاور ہوتے ہوئے ان کے لئے قربانیاں کرتے ہوئے، ان کی بھلائی کے لئے دعائیں کرتے ہوئے ان کو اپنی ذات میں ضم کرتی چلی جائے۔

(خطبات طاہر جلد اول ص 21-24)

☆ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے ایسے تمام جرائم کی جن کی بنیاد جھوٹ پر ہے اور جو روزمرہ کے خفیف جھوٹ کے زمرہ میں آتے ہیں کے بارہ میں فرمایا۔

''امر واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں جتنے جرم ہو رہے ہیں۔ ان میں شاذ ہی کوئی جُرم ایسا ہو گا جس کا تعلق جھوٹ سے نہ ہو۔ شاذ سے مراد وہ جُرم ہیں جو اشتعال انگیزی کے وقت بغیر سوچی سمجھی سکیم کے تابع اچانک رونما ہوتے ہیں۔ ان میں جھوٹ بعد میں آتا ہے۔ انسان بعد میں سوچتا ہے کہ میں کیسے جھوٹ بول کر اپنے عمل کی پاداش سے بچ سکوں گا۔ لیکن جرائم

کی بھاری اکثریت وہ ہے جو جھوٹ کے بچوں کے طور پر رونما ہوتے ہیں۔ ایک جُرم کرنے والا پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس جُرم کے نتیجہ میں اگر پکڑا جاؤں، اگر کوئی گواہی کسی کے ہاتھ آجائے، کوئی میرے جُرم کا نشان مل جائے تو میں کیا عذر تراشوں گا۔ پہلے جھوٹ کا تانا بانا بُنا جاتا ہے پھر اُس تانے بانے کے لباس میں انسان بظاہر دُنیا کی نظر سے پوشیدہ ہوکر پھر جُرم کا ارتکاب کرتا ہے اور یہ چیز جو ہے یہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات پر بھی حاوی ہے۔ ماں باپ کے تعلقات پر بھی حاوی ہے۔ جہاں بھی کوئی ظلم ہو۔ جہاں بھی کسی سے کوئی بے اعتدالی ہو، ناانصافی کا سلوک کیا جائے یا کسی کے خلاف کوئی مجرمانہ حرکت کی جائے۔ اگر آپ ان نیتوں کا تجربہ کریں تو ہمیشہ ان سے پہلے جھوٹ ہوگا۔" (الفضل 21 ستمبر 1992ء)

☆ "تمام بدیوں کی جڑ جھوٹ ہے اور لطیفے کے طور پر بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، ماؤں کو بچوں کے سامنے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، جھوٹے بہلاوے نہیں دینے چاہئیں، جھوٹی کہانیاں نہیں سنانی چاہئیں۔ ماؤں کی گودوں میں سچ اور جھوٹ کے فیصلے اکثر ہوجایا کرتے ہیں۔ تو بہت اہم فرض ہے جماعت احمدیہ کا کہ جھوٹ کے خلاف ایک جہاد کریں اور اپنی سوسائٹی میں جہاد کریں، لوگوں کو بھی روکیں جھوٹ سے اس کے نتیجہ میں عظیم الشان روحانی فوائد حاصل ہوں گے۔ اور دنیاوی ترقیات بھی اس قوم کو عطا ہوں گی۔"

(خطبات طاہر جلد 3 صفحہ 225)

☆ "کوئی شخص اُس وقت تک کامل ایمان حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ مزاح میں بھی جھوٹ کو ترک نہیں کردیتا۔ یہ بہت ہی پاکیزہ بیان ہے اور ایک ایسا لطیف بیان ہے جسے پڑھ کر رُوح وجد میں آتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر مزاح میں جھوٹ کی ملونی نہ ہو تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مزاح جھوٹ سے کلیۃً پاک ہو چکا ہو۔ گویا فرمایا کہ ایمان میں کامل نہیں ہوسکتا جب تک جھوٹ سے ایسی نفرت نہ ہو کہ جھوٹ سے نفرت اُس

کے مزاح کا حصہ بن چکی ہو۔'' (الفضل 21 ستمبر 1992)

☆ ''بعض دفعہ ایک واقعہ سُناتے ہیں اور اس واقعہ میں مزا کوئی نہیں تو سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ میں مزا پیدا کرنے کے لئے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ نمک مرچ لگانا ضروری ہے۔ یہ بظاہر ذاتی منفعت کے لئے نہیں ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ یہ تو کوئی ایسا جھوٹ نہیں ہے یہ تو میں نے مجلس کا دل لگانے کی خاطر کیا لیکن اگر باریک نظر سے دیکھے تو اس میں ذاتی منفعت ہی کارفرما ہوتی ہے۔ایک شخص جب ایسی بات کرے جس میں لذت پیدا نہ ہو تو وہ نفسیاتی لحاظ سے الجھن محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرا وہ رُعب قائم نہیں ہوا۔ میں نے مجلس کے دل نہیں جیتے۔اس لئے سچ سے نہیں جیتے جا سکے تو جھوٹ سے سہی۔ وہ پھر غلط بات کا اضافہ کر دیتا ہے۔''

(الفضل 5/اکتوبر 1992ء)

☆ ''عام تعلقات کے معاملہ میں کسی کو دیکھا تو کہہ دیا کہ میں آپ ہی کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے آپ ہی کا خیال آ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ مہمان نوازی کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں تو غلط بات پیش کر کے اپنا اچھا اثر جمانے کی کوشش کرنا۔جبکہ دل کہہ رہا ہو کہ یہ تو مصیبت بنا ہوا ہے اور زبان کہہ رہی ہو کہ شوق سے آپ نوش فرمائیں۔آپ ہی کی چیز ہے یہ روزمرہ کے جھوٹ ہیں۔ میں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ عام گھروں میں عام ذہنوں میں،عام روزمرہ کے حالات میں یہ جھوٹ پلتے ہیں اور یہ بُت گھڑے جاتے ہیں۔اور دکھائی نہیں دے رہے ہوتے۔''

(الفضل 5/اکتوبر 1992ء)

☆ ''اب آپ اپنی سوسائٹی کا جائزہ لے کر دیکھیں جہاں جھوٹ زیادہ ہو وہاں یہ عادت روزمرہ ہر طبقہ میں عام طور پر ملتی ہے کہ اِدھر سے بات سُنی اُدھر لے اُڑے اور دوسری طرف سے باتیں بیان کرنی شروع کر دیں۔جس شخص کا مزاج جھوٹا ہو وہ تحقیق کی طرف

مائل ہی نہیں ہوتا۔ جس کا مزاج سچا ہو وہ تحقیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر کسی سچے کے سامنے آپ کوئی ایسی بات کریں تو وہ فوراً پوچھے گا کہ بتاؤ تم نے کس سے سُنی تھی وہ کون شخص ہے اس کے متعلق جائزہ لے گا کہ وہ کیسا تھا اگر وہ سچا ہو تو پھر بات کو آگے بڑھا کر مزید جستجو کرے گا۔ اگر وہ جھوٹا ہو تو وہیں اس بات کو ترک کر دے گا کہ جس سے تم نے روایت کی ہے وہ تو ہے ہی جھوٹا۔"

(الفضل 21 ستمبر 1992)

☆"اسائلم لینا ہو یا کسی خطرے سے، کسی بدی سے بچنا ہو تو پہلے دماغ میں جھوٹ کی ترکیب آتی ہے کہ اچھا ہم یہ کرتے ہیں کہ پاسپورٹ گما دیتے ہیں اور جا کر کہیں گے کہ گم گیا تھا اور یہ کہہ دیں گے کہ ہم جرمنی سے نہیں آئے، ہم تو سیدھے پاکستان سے آرہے ہیں۔ اگر جرمنی سے آئیں گے تو دوسرے ملک والے کہہ دیں گے کہ تم پہلے جرمنی پہنچے تھے تو ان کا کام ہے کہ تمہیں اسائلم دیں یا نہ دیں۔ اب ہمارے پاس کیا کرنے آئے ہو یا انگلستان آئے اور کسی اور جگہ پہنچے اور جا کر یہ بیان دے دیا کہ ہم تو سیدھا پاکستان سے آرہے ہیں۔ یہ ساری باتیں جھوٹ ہیں اور خدا کے سوا کسی اور کو رب بنانے والی بات ہے۔"

(الفضل 5/اکتوبر 1992ء)

☆"آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بدظنی سے بچو کیونکہ بدظنی سخت قسم کا جھوٹ ہے (مسلم کتاب الادب)...... جو شخص ظن کی بناء پر کسی کو داغدار کرتا ہے وہ لازماً جھوٹا ہے۔ خدا کے نزدیک وہ جھوٹا لکھا جاتا ہے...... بدظنی کی مزید قسمیں یوں بیان فرمائیں کہ ایک دوسرے کے عیب کی ٹوہ میں نہ رہو۔ اپنے بھائی کے خلاف تجسس نہ کرو۔ اب یہ عجیب لطیف کلام ہے کہ بظاہر بدظنی اور تجسس دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی عارفانہ نظر اس بات کو پا گئی کہ اگر پہلے بدظنی نہ ہو تو تجسس کا بچہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ تجسس اور دوسرے کے عیب کی تلاش کرنا یہ ایک ایسا اقدام ہے جس سے پہلے بدظنی ضروری ہے۔

بدظنی ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔اس سے بچواس سے بچو گے تو معاشرہ تمہارے شر سے بچ جائے گا اور معاشرہ امن میں آجائے گا۔اپنے بھائی کے خلاف تجسس نہ کرو۔اچھی چیز ہتھیانے کی حرص نہ کرو۔حسد نہ کرو۔دشمنی نہ رکھو۔بے رخی نہ برتو۔"

(الفضل 18 / اکتوبر 1992ء)

☆"جھوٹ کی باریک قسموں میں چرب زبانی کے ذریعہ غلط حق حاصل کرنا بھی شامل ہے پس آنحضور ﷺ نے اس باریک جھوٹ کی قِسم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ......ہوسکتا ہے چرب زبان ہو۔عمدہ طریق پر بات بیان کرے اور میں اس سے متاثر ہو کر کوئی رائے قائم کرلوں اور اس کے حق میں کوئی فیصلہ دے دوں حالانکہ حق دوسرے فریق کا ہو۔ایسی صورت میں اس فیصلہ سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے اور اپنے بھائی کا حق نہیں لینا چاہئے کیونکہ اس کے لئے وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو میں اسے دلا رہا ہوں۔اگر وہ لے گا تو قیامت کے دن وہ سانپ بن کر اس کی گردن پر لپٹا ہوگا۔"

(الفضل 18 / اکتوبر 1992ء)

☆"مکر بھی جھوٹ ہی کی قسم ہے مگر ایک فرق یہ ہے کہ جھوٹ زبان سے خلاف واقعہ بات کو دھوکے کی خاطر بیان کرنے کو کہتے ہیں......لیکن بعض افعال ہیں جن میں لفظ استعمال نہیں ہوتے ان میں بھی اگر نیت دھوکہ دینے کی ہو اور جھوٹ دکھانے کی نیت ہو تو وہ افعال مکر میں داخل ہو جاتے ہیں..........باقی تمام امور میں ہر وہ مکر جس میں بدی کی نیت ہو گناہ ہے اور اس سے پرہیز لازم ہے لیکن ہماری سوسائٹی میں مکر بھی جھوٹ کی طرح روزمرہ داخل ہو چکا ہے......اگر آپ تلاش کریں گے تو جھوٹ کے بعد سب سے زیادہ مجرم مکر دکھائی دے گا۔یوں لگتا ہے کہ مکاری کے بغیر دنیا کے معاملات چل ہی نہیں سکتے۔قرآن کریم نے اسے شرک قرار دیا ہے......

پس جہاں تک جماعت احمدیہ کا تعلق ہے ہمارا معاشرہ کلیۃً مکر سے پاک ہونا

چاہئے۔'' (الفضل 24/ اکتوبر 1992ء)

☆ آگے چل کر مکر سیئ مکر بد کی تشریح میں فرمایا۔

''ہر وہ مکر جو کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے یا اپنے ناجائز حق لینے کے لئے استعمال کیا جائے وہ مکر بد ہے...... یہ مکر خواہ بہو کی طرف سے ہو خواہ ساس کی طرف سے ہو، مکر بد ہی ہے اور ناجائز ظلم کسی پر کروانے کی خاطر کیا جاتا ہے لیکن یہ تو معمولی سی مثال ہے میں نے تفصیل سے جائزہ لے کر دیکھا ہے ابھی تک احمدیوں میں بھی مکر کا استعمال جاری ہے اور اس کے نتیجہ میں ہماری سوسائٹی میں ابھی تک بہت دکھ موجود ہیں۔ خصوصاً مالی لین دین میں، تجارتوں میں اور رشتے داریوں کے تعلقات میں ابھی تک ایک حصہ جماعت احمدیہ میں ایسا ہے جو مکر سے کام لیتا ہے۔''

(الفضل 24/ اکتوبر 1992ء)

☆ ''بعض دفعہ لوگ۔۔۔نظام جماعت میں بھی مکر شروع کر دیتے ہیں اور چالاکیوں سے کام لیتے ہیں اور عہدوں کو عزت کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور ووٹوں کے حصول کے لئے دھوکہ دے کر کئی طریق استعمال کرتے ہیں''

......بعض ایسے آدمی میرے علم میں ہوتے ہیں جن کو بہت زیادہ چندہ دینا چاہئے۔ اگر وہ خدا کی خاطر چندہ دیتے تو اُن کا بقایا دس ہزار بنتا لیکن انہوں نے جس بت کی خاطر چندہ دیا ہے وہ تو ہر بیان کو قبول کرے گا۔ وہ تو یہ چاہے گا کہ ووٹر بن جائے سہی، کم سے کم دے کر۔'' (الفضل 24/ اکتوبر 1992ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے سورۃ الفرقان میں بیان عبادالرحمٰن کے اوصاف کو مسلسل تین خطبات میں بیان فرمایا۔

7 مارچ 1997ء کو حضورؒ نے سورۃ الفرقان کی 64 تا 78 آیات کی تلاوت فرمانے کے بعد فرمایا۔

گزشتہ چند خطبات میں قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (الزمر:54) کی آیات کے حوالے سے توبہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے کا مضمون بیان کیا جارہا ہے جس کا آخری نتیجہ یہ بیان فرمایا گیا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اللہ تعالیٰ تمام تر گناہوں کو کلیۃً بخشنے کی طاقت رکھتا ہے اور اگر وہ تمہاری توبہ کو قبول فرمالے تو پھر بے انتہاء فضل ہیں جو تم پر نازل ہوں گے اور اللہ کو تم غفور اور رحیم پاؤ گے۔ بخشنے والا اور بار بار رحم فرمانے والا۔ اس مضمون کے حوالے سے چند باتیں میں گزشتہ خطبات میں پیش کر چکا ہوں۔ اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عبادالرحمٰن کی اصطلاح قرآن کریم نے دراصل ایسے ہی بندوں کے لئے استعمال فرمائی ہے جن کا اس آیت میں ذکر ہے قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا، دراصل رحمانیت کی طرف حرکت کرنے کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔ اگر مغفرت چاہتے ہو، اگر تمام گناہوں سے کلیۃً نجات چاہتے ہو تو خدا کی رحمت سے تعلق جوڑے بغیر یہ ممکن نہیں ہے اور جب خدا کی رحمت سے تعلق جوڑتے ہیں تو عبادالرحمٰن بنتے ہیں، رحمان خدا کے بندے۔ اور یہ کوئی فرضی بات نہیں ہے کہ آپ سمجھ بیٹھیں کہ ہم نے توبہ کرلی اب ہم رحمان خدا کے بندے بن گئے ہیں۔ قرآن

کریم نے تفصیل سے رحمان خدا کے بندوں کی علامتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک ہمارے لئے کسوٹی ہے اگر وہ ہم میں پوری ہے یا ہم اس کسوٹی پر پورا اترتے ہیں تو رحمان خدا کے بندے ہیں اگر نہیں تو محض خیالات کی جنت میں بسنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پس کلام الٰہی اتنا کامل اور اتنی تفصیل سے مضامین کے ہر پہلو کو روشن کرنے والا ہے کہ کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہیں چھوڑتا۔ پس بعض اور مضامین بھی اس سے تعلق رکھنے والے خدا نے توفیق دی تو میں بیان کروں گا مگر آج میں عبادالرحمان کے حوالے سے قرآن کریم کی بیان فرمودہ علامتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں جن کو دیکھ دیکھ کر آپ نے قدم آگے بڑھانے ہیں۔ جیسے مشکل راستوں پر جگہ جگہ نشان لگے ہوتے ہیں، وہ تیر کا نشان، رخ بتاتا ہے کہ یہ رستہ ہے، وہ رستہ نہیں اور اگر نشان نہ لگے ہوں تو آپ بھٹکتے بھٹکتے کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے۔ روزمرہ کی ہماری جو خدام الاحمدیہ کی کھیلیں ہوتی ہیں سائیکل ریس ہو یا پیدل لمبا سفر کرنا ہو تو خدام بڑی محنت سے ایک دن پہلے وہ نشان لگا دیتے ہیں اور ذرا آنکھ چوکی اور انسان کسی اور سڑک پر چل پڑا۔ تو قرآن کریم اتنا منظّم نظام پیش کرتا ہے، حیرت انگیز منظّم تعلیم پیش کرتا ہے کہ جگہ جگہ وہ نشان لگے ہوئے ہیں کہ دیکھو یہاں جا کر اس طرف مڑ کر Move کرنا ہے، یہاں سے اس طرف مڑنا ہے قدم بھٹک نہ جائیں اپنا جائزہ لیتے رہو تم صحیح رستے پر ہو بھی کہ نہیں۔ تو وہ جو لمبی سڑک ایک عام انسان کی توبہ سے شروع ہو کر عبادالرحمٰن تک پہنچا دیتی ہے اس کے یہ نشان ہیں جو قرآن کریم کی ان آیات نے آپ کے سامنے کھولے ہیں۔ اور پہلا نشان اس کا انکساری ہے۔ تکبر سے خالی ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب سے پہلے اس لئے رکھا کہ عبد بننے کے لئے تکبر سے کلیۃً نجات لازم ہے کیونکہ کسی کے سامنے انسان کوئی بھی اپنا تکبر رکھتے ہوئے سر جھکا نہیں سکتا۔ اپنی بڑائی کا

ادنیٰ بھی تصور ہو تو کسی اور کے سامنے سرخم کرنے کے رستے میں حائل ہو جائے گا۔

فرمایا وَعِبَادُ الرَّحْمَانِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وہ تو بری منکسر مزاجی کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں۔ ان کے قدم رعونت سے نہیں پڑتے بلکہ ہر قدم پر وہ اپنا عجز دیکھ رہے ہوتے ہیں، اپنی کمزوری دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا اور جب جاہل لوگ ان سے خطاب کرتے ہیں تو سلام کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں ان سے الجھتے نہیں ہیں ان کی بدی کا جواب بدی سے نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں ہماری طرف سے تو سلامتی تمہیں پہنچے گی۔ یہ دو بنیادی صفات ہیں جہاں سے رحمانیت کے ساتھ تعلق جوڑنے کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ہر انسان کو اپنے نفس کو کلیۃً ہر قسم کے تکبر سے خالی کرنا ہوگا ورنہ عبد کا مضمون اس پر صادق آ ہی نہیں سکتا۔ اتنا کامل کلام ہے کہ بات کو وہاں سے شروع کیا جو لازماً پہلا دروازہ ہے اس کے بغیر عبادالرحمان کے رستے میں داخل ہو ہی نہیں سکتے۔ ھوناً پیدا کریں اپنے اندر۔ یعنی جھک کر خدا کے حضور عاجزی اختیار کرتے ہوئے سفر اختیار کرنا اور اپنے نفس کو کلیۃً بیچ میں سے مٹا ڈالنا۔ اور دوسروں کے لئے شر سے کلیۃً خالی ہو جائیں کیونکہ وہ شخص جو ہر بات میں اپنے آپ کو عاجز ہی جانتا ہو اس شخص کی یہ علامت لازماً ظاہر ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بڑے کو سلام ہی کرتا ہے اور ایسے فقیر منش لوگ میں نے دیکھے ہیں کہ وہ کسی سے نہیں الجھتے، اپنے آپ کو نیچا کہتے ہیں ہم نیچے ہیں ہر آئے گزرے کو سلام کہتے ہیں۔ بس سلام ہماری طرف سے تمہیں سلام پہنچے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں تم سے۔ تو بنی نوع انسان کے لئے خدا کے بندے عجز کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور سلام کے پیغام لیتے ہوئے چلتے ہیں اس لئے قیامت کے دن ان کو بھی یہی سلام کا پیغام ہے جو پہنچایا جائے گا۔

پس یہ دو شرطیں ہیں جن سے ہمیں لازماً مزین ہو جانا، سج جانا چاہئے کامل عجز

اور ہر قسم کے شر سے اجتناب۔اب یہ دو شرطیں بھی اتنی مشکل ہیں، جتنی پیاری ہیں اتنی مشکل بھی ہیں۔یعنی آئے دن روزانہ انسان سے کسی نہ کسی اور کو کوئی نہ کوئی شر پہنچ ہی جاتا ہے، بات چیت میں تُو تُو، میں میں ہو جاتی ہے۔دلآزاری کی باتیں مونہہ سے نکل جاتی ہیں۔اپنی بڑائی کا کوئی کلمہ مونہہ سے نکل جاتا ہے۔کسی کے اندر کوئی نقص دیکھتے ہیں تو بعض عورتیں تو ہنستی ہیں مونہہ پر ہاتھ رکھ رکھ کر اور دوسری عورتوں کو اشارے کرتی ہیں کہ وہ دیکھو جی وہ کس قسم کی بھدی چیز ہے فلاں کا بچہ دیکھو، فلاں کی لڑکی دیکھو، فلاں کے کپڑے دیکھو اور وہ سمجھتی ہیں کہ کچھ بھی نہیں یہ تو ہم نے ذرا لطف اٹھایا ہے۔مگر قرآن کریم کی یہ آیت بتاتی ہے کہ تم نے اپنے اوپر رحمان کی بندی بننے کے لئے دروازے بند کر دیئے کیونکہ رحمان کے بندوں کی یہ علامت ہے کہ عجز اختیار کرتے ہیں۔جو عجز اختیار کرے وہ تو سب سے نیچا ہوگا اس کو دوسرے کی کمزوری پر ہنسنے کا موقع کیسے ہاتھ آئے گا۔پس ہنسی اپنی جگہ منع نہیں فرمائی مگر تکبر کی ہنسی منع فرمائی ہے۔جہاں دوسرے کو آپ نیچا دیکھ کر رعونت کے ساتھ اس کی ایسی کمزوریوں پر ہنستے ہیں جو بسا اوقات اس کے بس میں ہی نہیں ہوا کرتیں اور پھر ایسے آدمی سے کوئی نہ کوئی شر ضرور دوسروں کو پہنچتا ہی رہتا ہے۔پس سلام کا یہ مطلب صرف نہیں ہے کہ کسی جاہل نے آپ سے سختی کی بات کی تو آپ نے سلام کہہ دیا اور گزر گئے۔یہ دونوں باتیں مربوط ہیں۔عادت میں یہ بات داخل ہو تب یہ بات پیدا ہوتی ہے ورنہ اگر عادت میں یہ بات نہ ہو کہ میں نے خیر ہی پہنچانی ہے تو رستہ چلتے کوئی آوازہ کسے، دیکھیں آپ کیسے الٹ کے اس کا جواب دیں گے۔ہو ہی نہیں سکتا آپ رک سکیں۔یہ خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت کے گہرے راز بیان فرمائے ہیں ان کو معمولی کلام نہ سمجھیں، اپنے نفس پر اس کا اطلاق کر کے دیکھیں اور روزمرہ اپنا امتحان تو لے کے دیکھیں۔چلتے پھرتے کوئی آوازہ کسے کیسا غضب سے آپ اس پر پلٹتے ہیں اور بعض

دفعہ اس کے نتیجے میں شدید نقصان اٹھا بیٹھتے ہیں، لڑائیاں ہو جاتی ہیں، قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ عادت جب تک مزاج میں داخل نہ کر لی جائے، ایک قاعدہ کلیہ نہ بن جائے اس وقت تک یہ صفات پیدا نہیں ہوا کرتیں اور اس کا آغاز عجز سے ہوگا۔ اب نیچے آدمی کو اوپر والے کہتے رہتے ہیں کبھی وہ سر نہیں اٹھاتا بے چارہ۔ وہ آنکھیں نیچی کر کے ہر بات برداشت کرتا چلا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا عبادالرحمٰن ہونے کے لحاظ سے تم یہ کرتے ہو اس لئے جتنا ذلیل بنتے ہو اگر اس کی خاطر بنتے ہو تو وہ ضرور تمہیں عزت دے گا اور اپنے بندوں میں شمار کر لے گا۔

پس بندہ اپنی ذات میں تو کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا کوئی اس کی ملکیت نہیں رہتی مگر مالک طاقتور ہو، مالک عظیم ہو تو پھر دوسروں کی مجال نہیں رہتی کہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھیں۔ تو فرمایا تم اپنے مالک نہ بنے پھرنا، اپنے مالک بن کر چلو گے تو اس دنیا میں تمہارا گزارا ہو ہی نہیں سکتا۔ تم سے زیادہ طاقتور، زیادہ سخت مزاج، زیادہ ظالم لوگ موجود ہیں اور ساری دنیا کا مقابلہ تم کر ہی نہیں سکتے۔ ایک ہی طریق ہے غلام بن جاؤ اور جس کے غلام بنو وہ رحمان ہو جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے، جس نے قرآن سکھایا۔ اس رحمٰن کے بندے بنو تو پھر کچھ علامتیں ہیں جو تمہارے اندر ظاہر ہوں گی وہ یہ ہیں کہ تم عاجزی کے ساتھ چلو گے، لوگوں کی باتوں کی کچھ پرواہ نہیں کرو گے پھر۔ صبر سے کام لو گے اور رحمٰن کی وجہ سے اس میں رحمٰن کی شان کا پیش نظر رکھنا داخل ہے۔ یہ بتاتا ہے یہ کلام کہ ایرا غیرا کی اولاد اگر بدتمیزی سے بات کرے، بداخلاقی سے پیش آئے تو اس کا نقص وہیں تک رہتا ہے لیکن اگر ایک بڑے عظیم انسان کا بچہ ہو اور وہ ایسی باتیں کرے تو اس کو گزند پہنچتا ہے، لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ تو پیغام یہ ہے دیکھو رحمان خدا کی عزت کا لحاظ رکھنا۔ تمہارا اٹھنا بیٹھنا ایسا ہو کہ جس کے نتیجے میں رحمٰن کی عظمت دلوں پر ظاہر ہو، پتہ چلے کہ کتنے عظیم وجود کے یہ عظیم وجود کے

یہ بندے ہیں جو پھر رہے ہیں اور وہ تکبر سے نہیں وہ عجز ہی سے ظاہر ہوگا، تو یہ صفات رحمٰن کے تعلق میں اگر انسان اپنے اندر پیدا کرلے تو ان کا پیدا کرنے کا آغاز مشکل نہیں اس کو اپنے آخری نقطہ عروج تک پہنچانا مشکل ہے لیکن اس کے حل بھی قرآن کریم نے پیش فرمائے ہیں۔

تو سب سے پہلے اپنا یہ امتحان ہمیں شروع کردینا چاہئے کہ ہم رحمٰن خدا کے نام پر کوئی دھبہ تو نہیں بن جاتے۔ رحمٰن خدا جس کے غلام کہلا کے پھر رہے ہیں دنیا میں اس کی شان اور اس کی عزت پہ کوئی حرف تو نہیں لاتے اور اس پہلو سے بہت ہی انکساری کے ساتھ زمین پر وقت گزارتے ہیں عجز کے ساتھ وقت گزارتے ہیں کہ ہماری وجہ سے کسی طرح ہمارے آقاؐ کے نام پر کوئی حرف نہ آئے اور اس کی طرف ہمارے عبد کا منسوب ہونا جائز قرار ٹھہرے، ناجائز نہ بن جائے۔ یہ لوگ سلامتی کا مجسم پیغام بن جاتے ہیں اور جو دن کو اس طرح چلتے ہیں وہ راتوں کو سو کر بسر نہیں کیا کرتے کہ سارا دن تو وہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہوں، عجز کے ساتھ چلیں، سلامتی کے پیغام پہنچاتے پھریں، گھر آئیں تو آرام سے لمبی تان کے سو جائیں۔اس کا مطلب ہے کہ جو وہاں تھا وہ دکھاوا تھا۔ وہ کسی رحمٰن خدا کی خاطر نہیں تھا کیونکہ جب کوئی نہیں دیکھ رہا تو ان کا رحمٰن خدا سے تعلق ختم ہوگیا۔

اس لئے دوسری آیت نے اس مضمون کو پوری طرح مکمل حفاظت دے دی ہے کہ عبادالرحمٰن راتوں کو جب کوئی ان کو نہیں دیکھ رہا ہوتا اپنی رحمانیت سے اخذ کی ہوئی صفات کی حفاظت کرتے ہیں اور دن کو جو لوگوں کے سامنے جھکتے ہیں وہ خدا کی خاطر جھکتے ہیں ان کو سجدے نہیں کیا کرتے۔ جہاں تک روح کے سجدے کا تعلق ہے، جہاں تک حقیقی اطاعت کا تعلق ہے فرمایا وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا یہ وہ لوگ ہیں جو راتیں جاگ جاگ کر، خدا کے حضور سجدے کرتے ہوئے اور

احترام کے ساتھ کھڑے ہو کر گزار دیتے ہیں۔ تو صاف پتہ چلا کہ ان کا دنیا کے سامنے جھکنا ان کی بزدلی یا ذلت کے نتیجے میں نہیں ہے، رحمٰن خدا سے تعلق کے نتیجے میں ہے۔ اور جب اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو سجدہ اسی کو کرتے ہیں کسی غیر اللہ کو نہیں کرتے اور جب اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو کامل احترام کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اور یہ کہتے ہیں اس وقت وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا یہ عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم سے جہنم کا عذاب ٹال دے، دور فرما دے اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا بہت بڑی تباہی ہے جہنم کا عذاب تو ایسی چٹی ہے جس کے بوجھ تلے ہم پِسے جائیں گے۔ پس اس مضمون کا تعلق بھی ایک طرف عجز سے ہے دوسری طرف اس حقیقت سے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ بار بار اٹھائے جائیں گے۔ ان کا کامل ایمان ہوتا ہے مر کر دوبارہ اٹھنے پر اور اگر مر کر اٹھنے پر ایمان نہ ہو تو دنیا میں وہ اصلاحات جو عبادالرحمٰن سے توقع کی جاتی ہیں وہ ان کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ یہ مرکزی نقطہ ہے اس مضمون کا کہ تم آخرت پر ایمان رکھو اور یقین جانو کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے گا۔ پس محض ایک منطقی، عقلی رستہ نہیں ہے جو خدا تک پہنچائے گا بعض ٹھوس حقائق ہیں جو پیش نظر ہوں تو پھر تمہارا خدا کی طرف سفر آسان ہو جائے گا۔ ایک سفر کا جو مقصد ہے وہ کسی اچھی چیز کو حاصل کرنا ہوتا ہے اور ایک سفر کا مقصد کسی بُری چیز سے بچنا ہے تو یہ دونوں محرکات قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں۔ اس لئے ہر نبی کو بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا فرماتا چلا جا رہا ہے مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا کہ وہ انسان کے اندر دونوں جذبے یعنی حرص کا جذبہ۔ طمع کا جذبہ، کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ان کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں نصیحت کے وقت اور خوف کا جذبہ۔ یہ ڈر کہ ہم کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں، عزت کے

جذبے کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ تو فرمایا یہ لوگ رحمٰن خدا سے محبت اور تعلق رکھتے ہوئے اس کے سامنے جھکتے ہیں مگر خوف بھی رکھتے ہیں کہ اگر ہم سے کوئی کوتاہی ہوئی تو پھر قیامت کے دن ہم سے پوچھا جائے گا، ہمارا حساب کتاب ہوگا۔

پس وہ لوگ جو خدا تعالیٰ سے تعلق کو اور ان رستوں پر قدم مارنے کو مشکل سمجھتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ یوم آخرت پر یقین کے بڑھنے کے ساتھ یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے کیونکہ وہ شخص جو شیر کو دیکھ لے یا کسی اور خوفناک جانور کو دیکھ لے وہ اس سے دوڑتا ہے اور تھکا ہارا بھی ہو، یہ کہہ کر بیٹھ رہا ہو کہ اب تو مجھ سے ایک قدم نہیں اٹھایا جاتا، شیر دیکھے گا تو وہی قدم ہلکے ہو جائیں گے اس قدر تیزی سے دوڑ پڑتا ہے بعض دفعہ کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ تو جو مخفی طاقتیں ہیں انسان کی، جو دبی ہوئی ہیں جن کو عام حالتوں میں انسان استعمال میں نہیں لاتا خوف کے نتیجے میں وہ ایک دم بیدار ہو جایا کرتی ہیں۔ طمع کے نتیجے میں بھی ہوتی ہیں مگر خوف کے نتیجے میں ان میں Panic آجاتی ہے، ہراساں ہو کر وہ دوڑتے ہیں۔ پس فرمایا جہنم کا خیال ان کے اعمال کو صحت بخشتا ہے، ان کے اعمال کی بہترین تشکیل کرتا ہے وہ ہر اس چیز سے بچیں گے جس سے ان کو خطرہ ہو کہ وہ جہنم میں داخل کئے جا سکتے ہیں۔

تو یہ جو منفی پہلو خوف کا ہے یہ بھی عبادالرحمٰن بننے کے لئے لازم ہے کہ پیش نظر رہے اور جتنا یقین ہوگا اس حقیقت پر کہ ہماری جواب طلبی ہوگی اتنا ہی گناہ سے خوف آنے لگے گا خواہ وہ کتنے ہی خوبصورت دکھائی کیوں نہ دیں۔ ایسے درخت جو بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں لیکن کانٹے دار ہوتے ہیں آپ ہاتھ بڑھا کر ان کا پھول نہیں توڑنا چاہتے کیونکہ اِدھر ہاتھ بڑھایا اُدھر زخمی ہو گیا۔ لیکن جہاں پھول بھی زہریلے ہوں یا جانور ہو جو سانپ کی طرح زہریلا اور خواہ کیسا ہی خوبصورت رنگوں میں بنا ہوا ہو آپ اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکتے۔ تو گناہ کی حقیقت اگر اس کے

عذاب کے حوالے سے معلوم کی جائے پھر انسان کے لئے اس سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔ اگر کسی گناہ کے ساتھ لطف کا تعلق ذہن میں آپ باندھے ہیں اور اس کے عذاب کا پہلو نظر انداز کر دیں تو پھر گناہ پر دلیری ہوگی۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے فوری طور پر یہاں مضمون کے شروع ہی میں بیان فرمادیا کہ جو خدا کے حضور اٹھتے ہیں، گریہ وزاری کرتے ہیں، جھکتے ہیں تو اس میں صرف محبت کا پہلو نہیں رہتا کیونکہ محبت کے پہلو کے نتیجے میں بعض دفعہ انسان دلیر بھی ہوجایا کرتا ہے۔

''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ''

اپنے محبوب کو ایک شاعر کہتا ہے کہ تیرے کرموں نے تو ہمیں گستاخ بنادیا ہے۔ تو اتنا مہربان ہے کہ پکڑتا ہی نہیں تو اس کے نتیجے میں گستاخی ہوجاتی ہے۔ بچے جن کو لمبی ڈھیل دی جائے جس سے محبت ہی کی جائے اور ان کو ناراضگی کا خوف کبھی دامنگیر ہی نہ ہو، پتہ ہی نہ ہو کہ یہ کیا ہوتی ہے، بڑے بدتمیز اور آزاد ہوجاتے ہیں اور من مانی کرتے پھرتے ہیں پھر ساری زندگی ان کی برباد رہتی ہے۔

تو طمع اور خوف یہ دو پہلو لازماً انسانی تربیت کے لئے دو پہیوں کی طرح ہیں ایک پہیے کو نکال دیں تو ایک پہیے پر گاڑی چل نہیں سکتی۔ پس قرآن کریم فرماتا ہے وہ اٹھتے ہیں محبت سے مگر اپنا مقام سمجھتے ہیں، جانتے ہیں کہ جس سے ہم محبت کر رہے ہیں اس میں پکڑنے کی بھی طاقت ہے۔ وہ آیت جو میں نے پہلے آپ کے سامنے رکھی تھی اس میں اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ کے ساتھ خدا تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے۔ اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (الزمر:58) کہ اللہ تعالیٰ گناہ بھی بخشتا ہے اس کا عذاب بھی بڑا سخت ہے، اس کی پکڑ کے تصور سے لوگوں کی جان نکلتی ہے اور وہ کہتے ہیں جب عذاب کو دیکھتے ہیں تب ان کو سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے کیا بے احتیاطیاں برتی تھیں۔ پس محض غفور رحیم سمجھ کر خدا کی

طرف قدم نہیں اٹھا سکتے جب تک یہ نہ سمجھیں کہ وہ ذو العقاب الشدید ہے، وہ سخت عقوبت بھی کر سکتا ہے۔

پس عبادالرحمٰن کی دیکھیں کیسی کامل تصویر کھینچی گئی ہے، کیسی متوازن تصویر کھینچی گئی ہے۔ فرمایا وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ٥ اِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا وہ تو ایسی ظالم چیز ہے تیرا عذاب وہاں مستقل ٹھہرنا تو درکنار عارضی طور پر ٹھہرنا بھی ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ بہت ہی بُرا عارضی ٹھکانہ ہے اور مستقل ٹھکانہ تو بے حد وحساب بُرا ہے۔ اب اسی قسم کے الفاظ خدا تعالیٰ جنت کے تعلق میں عبادالرحمٰن کے لئے بیان فرماتا ہے اور ان پر کھول دیتا ہے کہ تمہارے لئے اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو عذاب کو قبول کرلو جو مستقر بھی بُرا ہوگا اور مقام بھی بُرا ہوگا یا بالا خانوں والی جنتیں حاصل کرلو جو عارضی طور پر بھی بہت پیاری ہیں اور ہمیشہ ٹھہرنے کے لئے بھی بہت ہی پیاری ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو ان کے خرچوں میں بھی ایک توازن پایا جاتا ہے اور نہ وہ اسراف کرتے ہیں کہ اپنی طاقت سے بڑھ کر خرچ کردیں۔ نہ وہ ہاتھ اتنا روک لیتے ہیں کہ کنجوس ہو جائیں۔ یہ جو آیت ہے یہ ان تمام آیات کی طرح جو اس رکوع میں موجود ہیں عبادالرحمٰن کے عنوان کے تابع ہیں ایک توازن پیش کر رہی ہیں اور سورہ رحمان میں اسی توازن کا ذکر ہے۔ سورہ رحمان میں آسمان اور زمین کے تعلق میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ یہ تم وزن کا انصاف کے ساتھ ترازو برابر رکھو وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ۔ لَا تُخْسِرُوْا فِی الْمِیْزَانِ کہ ہم نے آسمان کو بلند فرمایا اور متوازن کیا تا کہ تم جو بلندی کے خواہاں ہو تم توازن میں ناانصافی سے کام نہ لینا اس میں کمی بیشی نہ کرنا کیونکہ ہر رفعت انصاف کو

چاہتی ہے انصاف ہی سے ترقیوں کی ہر راہ شروع ہوتی ہے۔ پس قرآن کریم کے اندر ایک حیرت انگیز توازن پایا جاتا ہے۔ ایک ہی مضمون کو جہاں بھی شروع فرمائے گا اس کی بنیادی صفات میں سے کوئی بھی نہیں بھولتی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قطعاً یہ انسان کا کلام نہیں ہے ورنہ تئیس (۲۳) سال کے عرصے میں پھیلی ہوئی آیات ان بنیادی شرائط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں جو ایک مضمون سے تعلق رکھتی ہیں، یہ ناممکن ہے۔

تو ان تمام آیات میں اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو ایک توازن دکھائی دے گا اور عبادالرحمان بننے کے لئے وہ توازن شرط ہے اور قیام عدل کے بغیر عبادالرحمٰن بن سکتے ہی نہیں۔ رحم عدل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ عدل ہوگا تو رحم شروع ہوگا۔ عدل ہے نہیں تو رحم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تو رحمٰن سے تعلق جوڑنے کی باتیں کرو۔ اتنے بلند ارادے رکھو اور دنیا میں بے انصافی سے کام کرتے پھرو یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تو یہ دوسرا بڑا عظیم پیغام ہے۔ اور خرچ میں بھی ایک انصاف ہے۔ جو شخص خرچ میں بہت زیادہ دکھاوے کے طور پر یا طاقت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرتا اور جہاں خرچ کرنا چاہئے وہاں ہاتھ روکتا نہیں اس کی بہترین زندگی گزرتی ہے۔ اور ایسے شخص غریب بھی ہوں تب بھی وہ اچھے رہتے ہیں اور ان صفات سے عاری امیر بھی ہو تو وہ ضرور برباد ہو جایا کرتا ہے۔

پس محض روپے کی کمی یا زیادتی آپ کو سکون نہیں بخش سکتی۔ قرآن کریم کی اس آیت میں جو مضمون بیان فرمایا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے خرچ میں توازن رکھا کرو۔ خدا نے جتنا دیا ہے اسی حد تک، اسی نسبت سے خرچ بھی کرو اور اسی نسبت سے ہاتھ بھی روکو۔ جہاں خدا نے رکنے کے لئے کہا ہے رک جاؤ۔ جہاں خرچ کرنے کے لئے فرمایا ہے خرچ کرو مگر توازن کے ساتھ۔ تو جو اپنی طاقت کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرتا ہے وہ ہر قسم کے نقصانات اور دکھوں اور مصیبتوں سے بچتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ اور یہ بھی انصاف کے تقاضوں میں سب سے اہم تقاضا ہے کہ اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ قرآن کریم شریک ٹھہرانے کو ظلم کہتا ہے جو عدل کے منافی، برعکس مضمون ہے۔ پس جہاں بھی قرآن کریم میں شرک کی بُرائیاں بیان ہوئی ہیں آپ دیکھ لیں اٹھا کر، کھول کر دیکھ لیجئے وہاں آپ کو ناانصافی کا، عدل کے فقدان کا یا ظلم کا مضمون دکھائی دے گا۔ جو خدا کا ہے خدا کو دو یہ انصاف ہے۔ فرضی بتوں کو وہ دے دو جو خدا کا ہے یہ تو بہت بڑی جہالت ہے اور ظلم، ناانصافی ہی کے معنوں میں نہیں بلکہ اندھیروں کے معنوں میں بھی حد سے زیادہ ایک قبیح صورت اختیار کر جاتا ہے۔ پس ظلم دونوں معنے رکھتا ہے ایک ہے اندھیرا، تاریکی، جہالت اور ایک ہے ناانصافی۔ کسی کا حق لیا کسی اور کو دے دیا یا اپنا لیا اور یہ لفظ شرک کے تعلق میں سب سے زیادہ قوت کے ساتھ اطلاق پاتا ہے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اطلاق پاتا ہے کیونکہ شرک میں یہ دونوں باتیں بڑی نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں، جہالت حد سے زیادہ اور ظلم بھی حد سے زیادہ یعنی ناانصافی بھی حد سے زیادہ۔

تو فرمایا وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ اور آگے دیکھیں پھر انصاف کا مضمون وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ یعنی جو کسی کے اموال پر ہاتھ نہیں ڈالتا، جو کسی کے حقوق کا خیال رکھتا ہے وہ ناحق جان کیسے لے سکتا ہے۔

کہتا ہے یہ عبادالرحمٰن وہ ہیں جو کبھی بھی ناحق کسی کی جان نہیں لیتے الا بالحق سوائے حق کے جو خدا بخشتا ہے کیونکہ مالک وہی ہے۔ جب حق ان کو کہے تو پھر حق کے تقاضے پورا کرنا ان کا فرض ہے کیونکہ حق کو چھوڑنا بھی تو گناہ ہے۔

تو جہاں حق یہ کہے کہ یہاں جان لینا لازم ہے یا حق یہ کہے کہ اجازت ہے دونوں صورتوں میں جہاں مجاز بنائے گئے ہو چاہو تو جان لو، چاہو تو نہ لو دونوں صورتیں برابر ہو جائیں گی۔ جہاں حق ہو کہ تم نے لازماً جان لینی ہے یہاں، وہاں تمہارا فرض

ہے کہ جان لو۔ اب جب مسلمان مجاہدین غیر مسلم طاقتوں سے نبرد آزما ہوتے رہے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جہاد کے دوران، جو جہاد بالسیف تھا یعنی اس جہاد کے دوران یہ اجازت ہی نہیں تھی کہ جس کی جان لے سکو اس لڑائی کے دوران، اس کی جان نہ لو۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ روایت ہے بڑے نرم دل تھے بات بات پر رونا آجاتا تھا، بے حد شفیق لیکن جہاد کے دوران ان کا بیٹا جو اس وقت تک ابھی مومن نہیں ہوا تھا ایمان نہیں لایا تھا وہ ان کے مقابل پر لڑ رہا تھا۔ ایک موقع پر ان کے بیٹے کو یہ موقع ملا کہ حضرت ابوبکرؓ کو قتل کرسکتا لیکن اس نے نہیں کیا اور بعد میں اپنی طرف سے احسان کے طور پر یہ بتانے کے لئے کہ دیکھیں کیسا فرمانبردار بیٹا ہوں۔ یہ کہا اپنے ابا کو مخاطب کرتے ہوئے کہ آپ کو یاد ہے وہ جنگ جس میں آپ بھی شریک تھے لیکن مسلمانوں کی طرف سے اور میں مشرکوں کی طرف سے شامل تھا۔ ایک ایسا موقع تھا کہ میں چاہتا تو آپ کو قتل کرسکتا تھا مگر میں نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم اگر میں وہاں ہوتا اور تم میرے مقام پر ہوتے تو میں تمہیں ضرور قتل کردیتا۔ ناممکن تھا کہ میں تمہیں چھوڑ دیتا۔ یہ ہے قتل بالحق۔ بعض قتل میں حق کا تقاضا ہے وہ اجازت ہی نہیں دیتا کہ تم قتل سے باز آجاؤ۔ خدا نے حکم دیا ہے کہ ایسے شخص کو قتل کرنا ہے تو لازماً قتل کرنا پڑے گا، اپنے دل کی بات نہیں دیکھنی ہوگی، یہ عبادالرحمان ہیں۔

ولا یزنون اور وہ موت کے تعلق میں بھی اسی طرح انصاف سے کام لیتے ہیں جیسے زندگی کی پیدائش کے تعلق میں۔ اب عام طور پر لوگ سمجھتے نہیں کہ یہاں یزنون کا کیا مطلب ہوگیا اچانک۔ قتل کی باتیں ہو رہی ہیں اور زنا نہیں کرتے۔ قتل سے جان لی جاتی ہے اور قتل ناحق وہ ہے جہاں آپ کو اجازت نہیں اور آپ نے جان لے لی اور زنا کے ذریعے زندگی پیدا کی جاتی ہے اور وہ زندگی پیدا کی جاتی ہے جس

کے پیدا کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے تو آپ محی بھی بن جاتے ہیں ممیت بھی ہو جاتے ہیں۔ جس طرح اللہ کی صفات ہیں کہ وہ زندہ کرتا ہے اور وہ مارتا ہے۔ آپ دونوں صفات پر قابض ہو بیٹھتے ہیں اور اس کا بھی شرک سے تعلق ہے وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ جو خدا کی چیزیں ہیں وہ خدا کو دیتے ہیں اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیتے۔ پس موت کا اختیار خدا کو ہے کوئی اور نہیں ہے جو کسی کی موت کا فیصلہ کر سکے۔ پیدا کرنے کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر پیدا کرے۔ اور یہ خدا کے وہ بندے ہیں جو قتل بھی حق کے ساتھ کرتے ہیں اور پیدا بھی حق ہی کے ساتھ کرتے ہیں۔ تو یہ مضمون ہے زنا نہیں کرتے، جس کے نتیجے میں لازماً پھر ایسے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ فرمایا وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ أَثَامًا اور جو یہ باتیں کرے جو اوپر بیان کی گئی ہیں تو بہت بڑا گناہ کمانے والا ہے اور اس کا نتیجہ دیکھ لے گا۔ یَلْقَ اَثَامًا کا مطلب یہ ہے اس نے بہت بڑا گناہ کمایا اور اس گناہ کا بدنتیجہ وہ دیکھ لے گا اس کے لئے عذاب آئے گا اس کے پیچھے، عذاب اسی کو دیا جائے گا اور یُضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ عذاب میں بڑھا دیا جائے گا کیونکہ عام گناہوں کے مقابل پر یہ جو گناہ شرک کا گناہ اور زندگی اور موت کے معاملے میں خدا کی ملکیت میں دخل اندازی یہ تمام تینوں چیزیں مل کر اتنا بڑا گناہ بن جاتی ہیں کہ فرمایا یَلْقَ اَثَامًا بہت بڑے گناہ کو پہنچے گا اور اس کے عذاب کو دیکھے گا اور ایسے شخص کا عذاب بڑھایا جائے گا اور اس میں وہ چھوڑ دیا جائے گا ذلیل اور خوار ہو کر۔ یعنی اس کو پھر پوچھا بھی نہیں جائے گا کہ تم کس حالت میں ہو۔

یُضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَیَخْلُدْ فِیْہٖ مُھَانًا وہ اس میں لمبے عرصے تک ذلیل و خوار پڑا رہ جائے گا اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا سوائے اس کے جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا

اور نیک اعمال بجالائے فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا سوائے اس کے کہ کوئی شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ تو یہ وہی لوگ ہیں جن کی بدیوں کو حسنات میں اللہ تعالیٰ تبدیل فرمادے گا وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم فرمانے والا ہے۔

وہ لوگ جن کو یہ وعدہ دیا گیا کہ ان کا عذاب بڑھایا جائے گا اور بہت شدید عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے ان کے متعلق فرمایا

اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ یہ جو مضمون ہے اب عبادالرحمان سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہاں وَلَا يَزْنُوْنَ والا جو حصہ ہے جو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں زندگی اور موت پہ قابض بن بیٹھتے ہیں اب کچھ ان کے متعلق باتیں شروع ہوگئی ہیں۔ فرمایا اگر تم ان میں سے ہو تو عبادالرحمان سے تو تمہارا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رہا پھر یاد رکھنا تم سے یہ سلوک کیا جائے گا اور وہ سلوک یہ ہے کہ عذاب بڑھایا جائے گا اور بہت ہی بری حالت میں تم رہو گے يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا اس میں ذلیل حالتوں میں مدتوں اسی طرح پڑے رہو گے۔

لیکن اس سے بچنے کا ایک طریق ہے جو تمہارا رستہ موڑ دے گا اور پھر تم عبادالرحمان کی طرف واپس رخ کر سکتے ہو تو یہ ایک Deviation ہے رستے کی جس سے متنبہ فرمادیا گیا۔ اللہ کے رستے پر چلتے ہوئے یہ حرکتیں نہ کر بیٹھنا ورنہ تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔ واپس خدا کی طرف جانا ہے اگر اس طرف سے جہاں تم جا پہنچے ہو غلطی سے، تو یہ شرط ہے کہ توبہ پھر کرنی ہوگی اور نیک اعمال، ایمان دوبارہ لانا ہوگا۔ توبہ کے بعد ایمان یا ایمان کے بعد توبہ یہ مضمون ہے جو یہاں کھلنا چاہئے۔ ایک ایمان

سرسری ہوا کرتا ہے جس سے ساری بات شروع ہوئی ہے اور ایک ایمان ہے جو حقیقی ہوتا ہے۔ تو جو توبہ کر کے ایمان لاتا ہے مراد یہ ہے کہ توبہ کر کے اپنے ایمان کی سچائی کو ثابت کرتا ہے ورنہ اگر حقیقی ایمان نہ ہو خدا تعالیٰ کے صاحب اختیار ہونے پر اور جہنم کے حق ہونے پر تو ایسا ایمان اس کو توبہ کرنے دے گا ہی نہیں۔

پس فرمایا تمہارے ایمان کی اصلاح ضروری ہے جو سچی توبہ سے ہوگی۔ سچی توبہ کرو اور پھر جو تمہارا ایمان نصیب ہوگا وہ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا تک تمہیں پہنچا دے گا کہ ایسا شخص پھر لازم ہے کہ نیک اعمال بجالائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں

فَاُولٰٓئِكَ يُنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ حسنات میں تبدیل کرنا شروع کر دے گا۔ اب دیکھ لیں وہی بات جو میں آپ سے عرض کر چکا ہوں پہلے بھی کہ اپنی بُرائیوں کو خود تبدیل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، بہت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن فیصلہ کرنا اور یہ ارادہ کر لینا کہ ہم نے آج اپنی زندگی میں ایک تبدیلی پیدا کرنی ہے یہ آغاز ہر انسان کے دل سے ہونا چاہئے اس کے بغیر خدا تعالیٰ کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرے گا۔ فرمایا ایک فیصلہ کرو اور اس کی سچائی کو اپنے عمل سے ثابت کرنے کی کوشش کرو۔

تو پہلے ہے عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا اس سے مراد یہ ہے نیک اعمال بجالانے کی کوشش کرے گا کیونکہ بعد کی آیت یہی مضمون کھول رہی ہے۔ پس ہر وہ شخص جو ایسی توبہ کرے گا کہ اس کے بعد نیک اعمال بجالانے کی کوشش کرتا ہے فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا تو وہ ہلکی پھلکی توبہ نہیں کیا کرتا۔ وہ تو اپنے رب کی طرف توبہ کرتے ہوئے جھپٹ پڑتا ہے۔ اس تیزی سے الٹ پڑتا ہے اس طرف کہ جیسے آناً فاناً کوئی واقعہ ہو گیا ہو۔ تو جو خدا تعالیٰ کی عظمت کو پہچان لے اور عذاب کی حقیقت کو جان لے وہ پھر ٹالا نہیں کرتا توبہ کو کہ اچھا آج میں اتنا سا کر لوں گا، کل میں اتنا کروں گا۔ یہ وہ

لوگ ہیں جو خدا کی حفاظت کی گود میں آجاتے ہیں فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا وہ تو اللہ کی طرف توبہ کرتے ہوئے الٹ پڑتے ہیں۔

پھر فرمایا وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا جو متابا کا مضمون ہے یعنی بے محابا توبہ۔ ایک دم گویا ایک زلزلہ سا برپا ہو گیا ہو ایسی توبہ، اس کے نتیجے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض باتیں لازماً ہوں گی اور بعض علامتیں ظاہر ہوں گی۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ میں نے وہ توبہ کر لی ہے جس کا دوسرا نام توبۃ النصوح بھی ہے تو اس توبۃ النصوح کے بعد پھر یہ علامتیں ظاہر ہونی چاہئیں وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا کہ وہ جھوٹ کا مونہہ تک نہیں دیکھتے۔ وَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ کا ایک ترجمہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ میرے نزدیک یہاں موقع جھوٹی گواہی کا نہیں بلکہ وہی معنی ہے جیسے رمضان کو دیکھنے کے لئے بھی شہادت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کسی کو دیکھنا بھی شہادت ہوتی ہے تو فرمایا کہ وہ جھوٹ کا مونہہ تک نہیں دیکھتے۔ اس تسلی کی خاطر کہ اہل علم میں سے کوئی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ نہیں۔ میں نے (مفردات) امام راغب کو کھولا تو ان کی کتاب میں اسی آیت کے تابع یہی معنے پیش کئے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ایسی توبہ کرنے والے جھوٹ کی طرف کسی پہلو سے اس کے پاس بھی نہیں جاتے، پھٹکتے نہیں اس کے پاس۔ تو یہ معنی وہی ہے کہ اس کا مونہہ تک نہیں دیکھتے بالکل اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا اب دیکھیں آیات کا مضمون اسی طرف سے شروع ہوا تھا کہ وہ جب خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ان کے ساتھ مل جل کے بیٹھا نہیں کرتے جاہلوں کے ساتھ، ان کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ تو دوبارہ واپس پھر عبادالرحمٰن میں اس توبہ نے اس مضمون کو داخل کر دیا یعنی عبادالرحمٰن کا مضمون شروع ہوا بیچ میں ان کا ذکر

جو رستوں کی ٹھوکریں کھا کر بھٹک گئے تھے انہوں نے بچنا ہے تو کس طرح بچیں گے دوبارہ اللہ کے راستے پر پڑنا ہے تو کیسے پڑیں گے، یہ مضمون شروع کرتے ہی وہ صفات دہرانی شروع کردیں۔

وَ لَا یَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ کا ایک معنی ہے شرک کے قریب تک نہیں جاتے کیونکہ قرآن کریم نے شرک کو زُور فرمایا ہے۔ تو پہلے جو شرک سے بچنے کا مضمون ہے وہ اس کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ پس وہ جھوٹ کے قریب تک نہیں جاتے، شرک کے پاس نہیں پھٹکتے۔ جب یہ باتیں ہوں تو پھر لغو باتوں میں ان کو دلچسپی نہیں رہتی۔ بے ہودہ لغو باتوں میں جو انسانی دلچسپی ہے اس سے ان کا دل پھر جاتا ہے ان کا مزہ نہیں رہتا ان باتوں میں۔ اور اس کے نتیجے میں ایک چیز یہ پیدا ہوتی ہے وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بآیاتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے جب خدا تعالیٰ کی باتیں کی جائیں، خدا تعالیٰ مراد ہے، لفظ استعمال ہوا ہے رَبِّھِمْ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے جب ان کے رب کے نشان پیش کئے جاتے ہیں لَمْ یَخِرُّوا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا وہ اس کے اوپر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں پڑتے۔ اس سے بہروں اور اندھوں والا سلوک نہیں کیا کرتے بلکہ بڑی توجہ کے ساتھ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ أَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا اب یہاں وقت تھوڑا رہ گیا ہے باقی حصہ انشاء اللہ بعد میں بیان کروں گا، ایک اہم بات اس آیت کے تعلق میں بیان کرنے والی یہ ہے کہ آپ لغو سے مونہہ موڑیں گے تو خدا تعالیٰ کی باتوں میں دلچسپی ہوگی۔ خدا تعالیٰ کی باتوں میں دلچسپی ہوگی تو لغو سے خود بخود مونہہ مڑنے لگیں گے اور یہ روزمرہ پہچان ہے کہ ہم عبادالرحمان بننے کے قریب ہو رہے ہیں یا دور ہٹ رہے ہیں

اس بات کو اچھی طرح پلے باندھ لیں۔ بعض لوگ ہیں جو نیکی کی باتیں ہو رہی ہوں درس ہو رہا ہو، خطبہ ہو رہا ہو، ایسی باتیں ہوں تو ان کی آنکھوں سے کچھ روشنی بجھ سی جاتی ہے۔ وہ بیٹھتے تو ہیں اگر بیٹھیں مگر ہر بات کو غور سے سن نہیں رہے ہوتے طبعاً دلچسپی نہیں ہوتی۔ مگر ان کی مرضی کا ٹیلی ویژن کا پروگرام ہو تو پھر دیکھیں اچانک اندر سے ایک روشنی نکلتی ہے اور آنکھیں چمک جاتی ہیں ٹیلی ویژن کے ساتھ اور اگر کوئی بچہ شور ڈالے تو (کہتے ہیں) ایں، ہیں، ہیں، خبردار، چپ چپ !وہ دیکھو وہ کیا کر رہا ہے، مزہ خراب کر دیا۔

تو عبادالرحمان اور جو دوسرے بندے ہیں کسی کے ان میں بڑا فرق ہے اور یہ علامتوں سے پہچانا جاتا ہے اور ہر انسان روزمرہ اپنی علامتوں کو دیکھتا ہے، جانتا ہے اور ان آیات کے ذریعے جو اس کے اندر سے ظاہر ہو رہی ہیں وہ شناخت کر سکتا ہے اپنے آپ کو۔ پس خدا تعالیٰ نے جو مشکل رستے دکھائے ہیں، بلند منزلیں قائم فرمائی ہیں ان کے ہر قدم پر راہنمائی فرمائی ہے۔ ہر قدم پر جانچ، پہچان کے سائن بورڈ لگا دیئے ہیں تا کہ آپ کو بعد میں جا کر نہ پتہ چلے کہ اوہو یہ کیا ہو گیا، میں کہاں جا نکلا۔ ہر وقت، ہر لمحہ، ہر قدم آپ کو پتہ ہو کہ میں کس سمت میں قدم اٹھا رہا تھا، کس سے دُور جا رہا ہوں اور کس سے قریب جا رہا ہوں۔ تو عبادالرحمٰن بننا مشکل تو ہے مگر خدا تعالیٰ نے اتنا تفصیل سے یہ مضمون بیان فرما دیا ہے کہ ان میں سے ایک ایک آیت جو میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے آیت کے حوالے سے وہ اپنی ذات میں بہت بڑا مضمون رکھتی ہے۔ اگر اس کے اوپر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تو ایک لمبا سلسلہ چاہئے ان باتوں کے بیان کا۔ تو سر دست میں چونکہ وقت ختم ہو گیا یہیں اسی پر اکتفا کرتا ہوں انشاءاللہ آئندہ عبادالرحمان والے مضمون کو ہی ہم پھر بیان کریں گے۔

(الفضل انٹرنیشنل 25-اپریل 1997ء)

مورخہ 14 مارچ کو اس مضمون کو جاری رکھتے ہوئے حضورؒ نے فرمایا

گزشتہ خطبے میں انہی آیات کی تلاوت کی تھی جن میں سے بعض میں نے اب پڑھی ہیں اور کچھ پہلے اس سے آیات کی تلاوت کی تھی جن کے متعلق میں جو کہنا چاہتا تھا گزشتہ خطبہ میں کہہ چکا ہوں اب ابتداء کی جو دو آیات ہیں یہ پہلے بھی پڑھی تھیں اور ان کا ترجمہ بھی غالباً آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے اور یہیں سے میں اس مضمون کو اٹھا رہا ہوں اگرچہ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے مگر آئندہ جو بات بیان ہونی ہے اس کا پہلے سے تعلق جوڑنے کے لئے کچھ آخری دو آیات کے ساتھ دوبارہ مضمون کو باندھنا ہوگا۔

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُوْنَ الزُّوْرَ وہ لوگ جو رحمٰن خدا کے بندے ہیں ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ جھوٹ کا مونہہ تک نہیں دیکھتے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا اور لغو چیزوں سے ان کا اجتناب دراصل اسی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ لغو جھوٹ ہوتا ہے۔ پس تمام لہو و لعب، جتنی بھی لغو باتیں ہیں بنیادی طور پر چونکہ وہ جھوٹ ہیں اس لئے جھوٹ سے اجتناب کے نتیجے میں لغو سے ان کی دلچسپی از خود کم ہونے لگتی ہے جب کہ دوسروں کی زندگی کا مقصد لغو چیزیں ہیں وہ سرسری نظر سے ان کو دیکھتے ہیں اور کوئی دلچسپی نہیں لیتے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا اب یہ جو بیان ہے بہت ہی عظیم بیان ہے کہ جب وہ دلچسپی نہیں لیتے تو حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھتے، ان لوگوں پر اپنی کوئی برتری بھی نہیں ثابت کرتے، عزت اور بے نیازی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ یعنی کئی لوگ بعض دفعہ بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں، کوئی فضول باتیں اور کرر ہے ہیں، کہیں جوا چل رہا ہے، مومن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر جگہ کھڑا ہو اور ان سے جھگڑا شروع کر دے اور کہے دیکھو میں تو نہیں کرتا تم ایسا کرتے ہو۔ ان

کے جوگزرنے کی طرز ہے وہی پیغام دے دیتی ہے۔ان کے اندر عزت اور حترام کا ایک مقام ہے جس کو وہ اپنی چال سے ظاہر کرتے ہیں۔سرسری نظر ڈالتے ہوئے اس طرح گزرتے ہیں جیسے ان کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔پس یہ وہ لوگ ہیں جو جھوٹ سے نفرت کے نتیجے میں ازخود اس قسم کی صفات ظاہر کرنے لگتے ہیں ان دونوں چیزوں کا بہت گہرا تعلق ہے۔جتنا جھوٹ سے تعلق ہوگا اتنا لغو سے تعلق ہو گا۔جتنا جھوٹ سے بے نیازی ہوگی اتنا لغو سے بے نیازی ہوتی چلی جائے گی اور جب ایک چیز سے بے نیازی ہو تو انسانی فطرت مرتو نہیں جایا کرتی اس کی ضرورت تو اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔انسانی فطرت اس خلاء کو بھرنا چاہتی ہے جو ہر انسان کے دل میں ہے کہ میں کچھ حاصل کروں، تسکین قلب کا سامان ہو۔وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ ان کی توجہ لغو سے ہٹتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی آیات کی طرف ہوتی ہے محض خالی نہیں ہو جاتے بلکہ بہتر چیز اس کی جگہ لے لیتی ہے۔اس لئے جب آیات ان پر پڑھی جائیں تو ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں، وہ اندھوں اور بہروں کی طرح آیات سے سلوک نہیں کرتے۔

پس ایک طرف وہ ہیں جن کے دل جھوٹ سے باندھے گئے ہیں جب آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں ان کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اپنی آنکھیں اور اپنے کانوں کو لغویات سے پھیر لیتے ہیں ان میں دلچسپی کوئی نہیں رہتی۔مگر کچھ تو سننا ہے کچھ تو دلچسپی کے سامان کرنے ہیں جہاں ذکر الٰہی چلے وہاں ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں ان کے کانوں میں توجہ پیدا ہوتی ہے۔کہتے ہیں اچھا کیا کہا تھا آپ نے، ہمیں بھی سنائیں یہ بات، تو دلچسپیاں رخ بدلتی ہیں، دلچسپیاں مٹ نہیں جایا کرتیں اور پھر یہ اتنی بڑھ جاتی ہیں نیکیوں میں دلچسپیاں لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اسی مضمون کو

خدا آگے بڑھا دیتا ہے کہ وہ کلیتہً خدا کے ہو جاتے ہیں، ہر خواہش اس سے طلب کرتے ہیں، ہر لذت اسی سے چاہتے ہیں یہاں تک کہ اپنے دنیاوی تعلقات کی لذتیں جو عام لوگوں کو براہ راست ملتی ہیں وہ خدا کے حوالے سے لیتے ہیں، یہ عبادت کا ایک عظیم مقام ہے۔

تو کہتے ہیں وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں میں یا اپنے خاوندوں میں اور اپنی اولاد میں وہ لذتیں عطا کر کہ ہم ان کے غیر سے بے نیاز ہو جائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی بیوی کے مونہہ میں اس وجہ سے لقمہ ڈالتے ہو کہ اللہ کو پسند ہے تو لقمہ ڈالنے کا مزہ تو ویسے بھی آنا تھا مگر اب دوہرا مزہ آئے گا۔ ایک محبوب نہیں دو محبوب جیت لو گے اور جو محبوب حقیقی ہے وہ بھی ساتھ جیتا جائے اور روزمرہ کی زندگی کی ایک طبعی خواہش بھی پوری ہو جائے اس سے بہتر اور کیا سودا ہو سکتا ہے۔ تو ایک مضمون اس میں یہ ہے کہ اپنی ازواج سے اور اپنی اولاد سے وہ طبعی لذتیں جو حاصل کرتے ہیں وہ اللہ کے حوالے سے حاصل کرتے ہیں اور اللہ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اے اللہ! ہمیں متقیوں کا امام بنا۔ اب یہ آیت آج کل کے زمانے میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ عائلی مسائل کی خرابیاں اور بہت سی باتوں میں اپنی اولاد کی تربیت سے بے اعتنائی اس آیت کے مضمون سے غفلت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ پس اس دعا سے پہلے جو تیاری ہے وہ ضروری ہے اگر بغیر اس تیاری کے اس دعا میں داخل ہوں گے تو یہ دعا کچھ بھی حقیقت نہیں رکھے گی۔ پہلے جھوٹ سے نفرت، غیر اللہ سے نظریں پھیرنا اور اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی طرف مائل کرنا، یہ جب چیزیں پیدا ہوں تو پھر دل سے یہ دعا نکلے گی تو اور زیادہ گہرے معنے لے کر اٹھے گی۔ هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ہمیں اپنی بیویوں یا

اپنے خاوندوں اور اپنی اولاد سے وہ آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کر جس کے نتیجے میں نیک اولادیں پیدا ہوتی ہیں اور یہ دو مضمون ایک دوسرے سے اس طرح باندھے جاتے ہیں کہ آنکھوں کی ٹھنڈک بیان فرمادی ہمیں اپنی بیویوں سے یا اپنے خاوندوں سے یا اولاد سے مل کر بیٹھنے میں جو خوشیاں محسوس ہوتی ہیں وہ نہ ہوں جب تک یہ یقین نہ ہو کہ اولاد نیک ہوگی جب تک یہ نہ یقین ہو جائے کہ یہ متقی پیدا ہو رہے ہوں اس وقت تک ہمیں ان کے ساتھ بیٹھنے، تعلقات میں کوئی مزہ ہی نہ آئے یہ وہ دعا ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے ہمیشہ مانگی ہے اور اسی طریق پہ مانگی ہے۔

یہ ہو میں دیکھ لوں تقویٰ سبھی کا

جب آوے وقت میری واپسی کا

یہ بارہا میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں لیکن اتنی اہم بات ہے کہ جتنی دفعہ بھی بیان کی جائے یہ پُرانی نہیں ہوسکتی۔ یہ تمناء مرتے وقت کی آخری تمنا ہو کہ میں اپنی اولاد کا تقویٰ دیکھ جاؤں بہت عظیم بات ہے اور یہی دعا ہے جو یہ بیان فرما رہی ہے کہ وہ اللہ کے حضور یہ مانگتے ہیں کہ ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک دے۔ مگر آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد یہ نہیں کہ ملنے جلنے کی دلچسپیوں تک ہی وہ ٹھنڈک رہے۔ وہ تو ہر کافر کو بھی ملتی ہے بلکہ کافر زیادہ اس کی جستجو کرتا ہے لیکن اس کی تفصیل بیان فرمادی۔

وَاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا ایسی نسلیں پیچھے چھوڑ کے جائیں جو متقی ہوں اور متقیوں کا امام بننے کا ہی مزہ ہے ورنہ تو امامت کوئی بھی حقیقت نہیں رکھتی۔ اگر متبع گندے ہوں تو اس امامت کا کیا فائدہ۔ خواہ کروڑوں اربوں بھی ہوں تو جو گندوں کا امام ہے وہ گندوں ہی کا امام رہے گا بلکہ زیادہ گندے ہوں گے تو اور بھی زیادہ بے ہودہ امام بنے گا۔ اس لئے لازم ہے کہ متبعین متقی ہوں اور اولادیں متقی ہوں اور جتنی زیادہ متقی ہوں گی اتنا امامت کا مرتبہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ کے حوالے

سے جب آپ یہ دعا کرتے ہیں تو ایک نئی ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ ہمیشہ یہ دعا کرتے رہے اور آپؐ کی یہ دعا ہمارے حوالے سے قبول ہوئی ہے کہ نہیں، یہ سوال اٹھتا ہے۔ کیا ہم پر بھی آنحضور ﷺ یہ تسکین کی نظر ڈال سکتے ہیں کہ میری دعا ان لوگوں کے حق میں بھی قبول ہوگی جو میرے چودہ سو سال بعد پیدا ہوئے اور عجیب سلسلہ ہے مقبولیت کا جو قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ اور خدا تعالیٰ مجھے ان لوگوں میں سے بھی متقی عطا کر رہا ہے یعنی روحانی ذریت متقیوں کے بعد متقی پیدا کرتی چلی جاتی ہے تو اس پہلو سے جو ذمہ داریاں ہیں وہ بڑھ بھی جاتی ہیں ان میں ایک خاص لذت بھی پیدا ہو جاتی ہے یعنی ادائیگی فرض، فرض سمجھ کے بھی ہوتی ہے لیکن ادائیگی فرض میں اگر پیار کا تعلق قائم ہو جائے، انسان کو ذاتی دلچسپی اس کام میں ہو تو پھر وہ فرض کی محض ایک فرض کی ادائیگی نہیں بلکہ ایک دلی تمنا کا پورا ہونا بن جاتا ہے، اپنی خواہش کو پورا کرنے میں جو مزہ ہے وہ فرض کی ادائیگی میں پیدا ہو جاتا ہے۔

پس دعاؤں کے مضمون کو جتنا آپ گہری نظر سے دیکھیں، پھیلائیں اتنا ہی دعاؤں میں لذت بڑھتی ہے اور اگر دعا میں لذت بڑھ جائے تو دعا مقبول بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک قطعی غیر مبدل حقیقت ہے کہ دعا میں جب تک کوئی لذت نہ ہو اس وقت تک دعا مقبول ہو نہیں سکتی اور لذتیں دو قسم کی ہیں ایک خوشی کی لذت ہے ایک غم کی لذت ہے۔ پس اس پہلو سے یہ خوشی کی لذت ہے جو پیدا کر رہی ہے۔ بہت ہی مزے کا مضمون ہے۔ اچھے خاوند، اچھی بیویاں، ایک دوسرے پیار کرنے والی اللہ ان کے ساتھ تعلقات میں پاکیزگی بھی پیدا کرے، وفا بھی پیدا کرے، ان سے دل ٹھنڈے ہوں لیکن وہ دل ٹھنڈے ہونے کا آخری نقطہ معراج یہ ہو کہ انسان اس یقین کے ساتھ جان دے کہ میرے پیچھے نیک اولادیں رہ گئی ہیں۔ اور پھر نئی لذت اس میں

اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم نیکوں کی اولاد تھے، نیکوں کی اولاد بننے کے مستحق بھی ٹھہرے کہ نہیں۔ کس باپ کے بیٹے، کس دادا کے پوتے اور پھر جب آگے بڑھتا ہے مضمون تو آنحضرت ﷺ کی آنکھیں بھی ٹھنڈی ہوسکتی ہیں کہ نہیں۔ تو اولاد کی تربیت آپ کرتے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد آپ کی تربیت کرتے ہیں خواہ موجود ہوں یا نہ ہوں۔ پس اس دعا کا تعلق مستقبل سے بھی ہے، ماضی سے بھی ہے اور جتنا گہری سوچ کے ساتھ آپ یہ دعا کریں گے اتنا ہی زیادہ یہ فائدہ بخش بھی ہوگی اور لذتیں بھی عطا کرے گی۔

دوسرا اس سے پہلے گزرا تھا، لغو سے وہ پرہیز کرتے ہیں، اس سے پہلے یہ ذکر گزرا ہے کہ وہ بدکاری نہیں کرتے اور اپنا دامن پاک رکھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے بھی یہ دعا ہے کیونکہ اگر ایک انسان کی توجہ گھر کی طرف ہو اور بیوی کو خاوند سے تسکین قلب ملے، خاوند کو بیوی سے تسکین قلب ملے اور اولاد ایک نعمت کے طور پر اس کے اردگرد رہے تو ایسے گھر میں بدکاری، نہیں پیدا ہوتی۔ آج کل کے زمانے کا علاج اس دعا میں ہے جہاں بھی بدکاری بڑھتی ہے وہاں اس دعا کے منفی اثرات دکھائی دیں تو بڑھتی ہے یعنی اس دعا میں خوبیاں بیان فرمائی گئی ہیں ان کا جو برعکس ہے وہ اگر پایا جائے تو لازماً وہاں فحاشی، بدکاری، لغویات پھیل جائیں گی۔ پس آج کل کے زمانے میں جو گھر ٹوٹ رہے ہیں آج کل کے زمانے میں جو لذتوں کے مرکز گھروں سے نکل کر باہر جا چکے ہیں اس کی وجہ اسی دعا کے مضمون کا فقدان ہے۔

یہ تجربہ شدہ حقیقت ہے کہ جو عورتیں اپنے خاوندوں کی وفادار رہتی ہیں جو خاوند اپنی بیویوں کے وفادار رہتے ہیں، جن کے بچوں کے ساتھ ان کا تعلق پیار اور محبت کا ایسا رہتا ہے کہ گھر ہی ان کی لذتوں کا مرکز بن جائے یہ ساری قوم کے اخلاق کی حفاظت کا مرکزی نقطہ ہے۔ جہاں گھروں میں یہ تعلقات کم ہو جائیں یا مٹ

جائیں وہاں تمام لذتیں گھروں سے باہر نکل جاتی ہیں کیونکہ لذتوں کے بغیر انسان رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ جھوٹ ہے کہ ایسا متقی ہو کہ بالکل نفس مار کے بیٹھ جائے۔ایسا متقی خشک مولوی بن جائے گا لیکن متقی نہیں بن سکے گا۔تقویٰ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ یا طمع رکھی ہے یا خوف رکھا ہے۔سارا قرآن پڑھ لیں اس کے بغیر تقویٰ کا ذکر نہیں ملے گا آپ کو۔خوف میں بھی ایک ہیجان ہے اور موت کا مضمون خوف میں دکھائی دے نہیں سکتا کیونکہ خوف سے انسان مضطرب ہو جاتا ہے اور موت ساکت و جامد ہونے کا نام ہے اور طمع بھی انسان کو مضطرب کرتی ہے۔ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو یہ پتہ ہو کہ کوئی فائدہ آپ کو کسی سے ملنے والا ہے تو جتنا وہ وقت قریب آئے گا آپ کا دل اور زیادہ ہیجان پکڑتا چلا جائے گا۔

پس تقویٰ کا تعلق خوف سے اور طمع سے ہے اور قرآن کریم یہی مضمون کھولتا چلا جا رہا ہے تو اس لئے یاد رکھیں کہ گھروں میں اگر انسان کی طمع ہو اور سکون وہاں آجائے اور یہ خوف رہے کہ ہماری اولادیں ضائع نہ ہو جائیں تو وہ گھر ہی ہمیشہ آپ کی توجہ کا مرکز بنا رہے گا۔یہاں سے آپ کی توجہ پھر جائے تو گھر قبرستان ہو جائے گا۔لوگ گھروں کو لوٹتے ہیں، بڑی ہی تھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اور بوجھل دلوں کے ساتھ کہ اچھا یہ رات کاٹنی ہے کاٹو،صبح پھر باہر جائیں گے۔اور بچے سکولوں سے آکر گھروں میں کتابیں پھینکتے ہیں کچھ پڑھنا ہے پڑھیں گے اور توجہ یہ ہو کہ بعد میں فلاں ٹولی کے ساتھ باہر نکلیں گے،فلاں کے ساتھ وہاں کھیلوں میں جائیں گے،بہرحال اکثر آج کل کی سوسائٹی میں گھر محبتوں کے مرکز نہیں رہے اور جس حد تک یہ گھر محبتوں میں مر گئے ہیں اسی حد تک زندگیاں باہر جا چکی ہیں اور زندگی کی تلاش میں انسان کو باہر نکلنا پڑتا ہے۔پھر کچھ لوگ ہیں جن کی زندگیاں محض لغویات سے وابستہ ہیں مگر گناہوں سے نہیں۔تبھی قرآن کریم نے لغویات اور گناہوں میں فرق کر کے دکھایا

ہے پہلے فرمایا کہ وہ زنا نہیں کرتے، بدکاریوں میں مبتلا نہیں ہوتے، پاک دامن رہتے ہیں اور پھر اس سے اگلا قدم یہ فرمایا کہ لغو سے بھی پرہیز کرتے ہیں تو یہ ایک سلسلہ ہے ایک قدم ایک طرف اٹھتا ہے تو پھر آگے دوسری طرف اٹھتا ہے اور واپسی بھی اسی طرح شروع ہوتی ہے۔ پس اگر گناہوں سے توبہ کرنی ہو اور سخت محسوس ہو تو کچھ دوسری دلچسپیاں بڑھانی ہوں گی جو لغو کی گندی قسمیں نہ ہوں جن کو خدا تعالیٰ بعض صورتوں میں خود بھی آگے بڑھاتا ہے مثلاً صحت مند کھیلیں ہیں۔ ایک پہلو سے وہ لغو ہیں مگر ایک اور پہلو کے ساتھ وہ صحت مند ہیں، فائدہ مند ہیں اور قرآن کریم نے ان کی طرف توجہ دلائی ہے مختلف پہلوؤں سے۔ تو کھیلوں میں دلچسپی بچوں کی پیدا ہو جائے تو وہ بھی باہر جائیں گے مگر وہ اس قسم کے بچے نہیں ہیں جو گندے تعلقات کی وجہ سے باہر نکلتے ہیں۔

تو اس لئے ماں باپ کو یہ تو نظر رکھنی چاہئے کہ بچے باہر جاتے ہیں تو کہاں جاتے ہیں مگر یہ نظر آج کے زمانے میں رکھی جا نہیں سکتی جب تک ان کے دلوں کی دلچسپیوں پر نظر نہ ہو۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ہر ماں باپ اپنی بچیوں کے ساتھ ان کے سکول جائیں اور وہیں بیٹھے رہیں جو جب اپنے دوستوں کے ساتھ دوسری کھیلوں یا مشاغل میں مصروف ہوں تو ان پر نظر رکھیں، یہ ناممکن ہے۔ تو پھر اس دعا کی تائید میں کیا عمل ہے جو اس دعا کو تقویت دے سکتا ہے وہ میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہر بچے کی دلچسپی پر نظر رکھیں اور وہ دلچسپی گھروں سے دکھائی دیتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ بچہ گھر میں پہچانا نہ جائے۔ اس کا اُٹھنا، بیٹھنا، اس کی ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں دلچسپیاں، اس کی کتابیں خریدنا، اس کی تصویریں بنانا، اپنی دیواروں پر تصویریں لٹکانا یا کچھ ماٹو بنا کر لکھتے رہنا، یہ ساری ادائیں ہیں جو اس کے دل کا حال بتا رہی ہیں اور ان تصویروں کو پڑھ کر آپ دل کا حال پڑھ سکتے ہیں اور پھر اگر یہ بچہ

باہر نکلے گا تو آپ کو پتہ ہے کہ یہ محفوظ ہے یا غیر محفوظ ہے۔وہ بچے جو گھروں میں محفوظ نہیں وہ باہر بھی محفوظ نہیں ہوا کرتے۔مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ تحکم کے ذریعے اور خشک نصیحتوں کے ذریعے ان کو ٹھیک کرو۔ان کا علاج اس آیت میں ہمیں ایک دعا سکھاتی ہے۔اسی میں موجود ہے،"قرۃ اعین" بنانا "ذریت" کو یک طرفہ ہو ہی نہیں سکتا۔جس قرۃ العین کا ذکر فرمایا گیا ہے یہ آنکھوں کی ٹھنڈک یک طرفہ ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ شرط یہ ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اب آپ دیکھیں کہ بہت سے ماں باپ ہیں جو اپنے بچوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک پاتے ہیں خواہ جو مرضی کرتے پھریں۔وہ جتنے زیادہ فیشن ایبل ہوں گے،جتنا زیادہ لغویات میں مصروف ہوں گے اگر وہ پڑھائی میں اچھے ہوں اور دنیا کمانے کا یقین ہو جائے ماں باپ کو تو ان کی ہر دوسری دلچسپی بھی ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پیدا کرتی ہے خواہ وہ متقی نہ بن رہے ہوں۔پس قرآن کریم نے جس دلچسپی کا ذکر فرمایا ہے یہ ایسی دلچسپی ہے کہ جس کے نتیجے میں جب تک آپ کو اولاد میں نیکیاں دکھائی نہ دیں قرۃ عین نصیب نہیں ہوسکتی۔

پس ایسا تعلق جوڑیں بچوں سے کہ جو ان کے اندر نیکیاں پیدا کرنے والا ہو اور نیکیوں کے باوجود تعلق آپ سے رہے محض دنیاوی طور پر ان کا کچھ حاصل کرنا آپ کے لئے تسکین کا موجب نہ بنے۔یہ پیغام ہے جو اس آیت کریمہ میں ملتا ہے۔اب اپنے گھروں کے تجربوں میں ہر احمدی خاندان اپنا جائزہ لے سکتا ہے کہ ان کے بچے ان کے اندر باوجود ان کے نیک ہونے کے دلچسپی لیتے ہیں کہ نہیں۔یہ پہچان ہے اس بات کی کہ آیا آپ ایسی اولاد پیچھے چھوڑ رہے ہیں جو متقی بنے اور آپ ان کے امام بنے یا نہیں۔بعض بچے اس طرح پہچانے جاتے ہیں ماں اگر بے پرواہ ہے دین کے معاملات میں اور باپ نیک ہے اور ماں سے بہت تعلق رکھتے ہیں اور باپ سے گھبراتے ہیں۔اگر ماں نیک ہے اور باپ بے تعلق ہے دین سے تو بعض بچے ہیں جو

باپ کی طرف دوڑتے ہیں اور ماں کی پرواہ نہیں کرتے اور ایسی مائیں بے چاری روتی پیٹتی رہ جاتی ہیں کہ ہائے کیا ہو گیا تجھے، نیکی کی طرف آ، کیا ہو گیا ہے اپنے باپ کی بدیوں کی طرف تو جا رہا ہے۔ میری نیکیوں کی طرف نہیں آتا اور یہ روزمرہ کی حقیقتیں ہیں۔ آپ میری ایک دن کی ڈاک دیکھ لیں آپ کو سمجھ آجائے گی۔ کثرت سے اس مضمون کے خط ملتے ہیں کبھی باپ کی طرف سے رونا، کبھی ماں کی طرف سے رونا، باپ کہے گا ماں کو دنیا میں دلچسپیاں ہیں، نماز نہیں پڑھتی، فلاں کام نہیں کرتی اور ہماری اولاد جو ہے وہ انہی کی طرف بھاگی جا رہی ہے، میں آتا ہوں اور سر پیٹ کے رہ جاتا ہوں مگر میرے دکھاوے کے لئے کچھ کر لیں گے، میں نے پیٹھ پھیری تو پھر وہی حرکتیں۔ بعض مائیں روتی ہیں کہ باپ بڑا ظالم ہے۔ دین میں کوئی دلچسپی نہیں، نماز تک نہیں پڑھتا اور میرے بچے باپ کے پیچھے لگ گئے ہیں اور میری کوئی حقیقت ہی نہیں، میں تو پرانے زمانے کی عورت بن کے یہاں رہ گئی ہوں۔ تو یہ وہ چیزیں جن کے نتیجے میں اس دعا کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا کر کے دیکھ لیں۔ نہ خاوند بیوی کے لئے ٹھنڈک بنے گا۔ نہ بیوی خاوند کے لئے ٹھنڈک بنے گی۔ نہ اولاد ماں باپ کے لئے ٹھنڈک بنے گی، نہ ماں باپ اولاد کے لئے تو اس دعا نے ایک ایسا رشتہ ہمیں سکھایا ہے جو بالکل صاف روزمرہ کی زندگی میں پہچانا جاتا ہے۔

لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کی دعا تب پوری ہو سکتی ہے اگر ماں باپ نیک ہوں اور اولاد کو ان کی نیکی کے باوجود ان سے پیار ہو بلکہ نیکی کی وجہ سے پیار ہو۔ جتنا ماں باپ میں نیکی دیکھیں اتنا ہی احترام بڑھتا جائے، اتنا ہی ان سے محبت بڑھتی جائے اگر یہ بات ہو تو پھر آپ یقین کے ساتھ جان دے سکتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کا تقویٰ دیکھ کے مر رہے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو آپ کی زندگی موت بن جائے گی، آپ اپنے بچوں کی آنکھوں میں پڑھ نہیں سکتے کہ آپ نمازیں پڑھتے ہیں تو وہ یوں کر کے دیکھتے ہیں

کوئی دلچسپی نہیں ، اور جب ان کے ساتھ بیٹھ کر کوئی دلچسپ پروگرام دیکھیں تو کس طرح وہ آپ کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔تو انسان غافل بننا چاہے تو غافل ہو جاتا ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے پتہ نہیں چلا۔ایسا نظام فطرت خدا نے بنایا ہے کہ ہر انسان اپنا حال پڑھ سکتا ہے، اپنا واقف ہے بہانے خواہ لاکھ تراشے، جانتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔

پس اس دعا پر غیر معمولی اہمیت دینے کی ضرورت ہے اس لئے میں یہاں آ کر ٹھہر گیا ہوں اور یہ میری نیت تھی کہ اس کے ہر پہلو کو آپ کے سامنے کھول کے رکھوں۔اپنی اولاد کے لئے اگر آپ نے یہ دعا مانگنی ہے، اپنی بیویوں کے لئے دعا مانگنی ہے تو دیکھیں وہ دعا قبول ہو رہی ہے کہ نہیں۔اگر بیویوں کو آپ کی نیکیوں سے محبت ہو رہی ہے اور نیکیاں بڑھنے کے نتیجے میں وہ اور زیادہ آپ سے پیار کرنے لگی ہیں تو پھر آپ کی دعا قبول ہو رہی ہے۔اگر بیویوں کے خاوندوں کو اپنی بیویوں کی نیکیوں سے محبت ہو اور جتنا وہ زیادہ نیک بنیں اتنا ہی زیادہ ان کے دلوں میں طمانیت پیدا ہوتی چلی جائے، سکون ملتا چلا جائے تو یقین کریں کہ ان کی دعا قبول ہو رہی ہے۔اگر اولاد پر بھی یہی بات صادق آئے تو لازماً یہ دعا قبول ہو رہی ہے۔اس لئے دعا کی قبولیت کے لئے کوئی استخارے کا جواب آنا تو ضروری نہیں، پتہ چل جاتا ہے بعض دفعہ دعا اٹھتے اٹھتے بتا جاتی ہے کہ میں قبول ہوگئی ہوں کیونکہ اس وقت دل کا ہیجان، دل کے اندر ایک تموج کی کیفیت، جس گہرے خلوص سے انسان دعا مانگتا ہے دعا بتا کے جاتی ہے کہ میں مقبول ہو کر یہاں سے اٹھ رہی ہوں۔

تو اس دعا کی طرف آج کل کے زمانے میں غیر معمولی توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا کا سکون ہی نہیں اگلی دنیا کا گھر بھی اسی سے وابستہ ہو چکا ہے۔فرمایا أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا یہی وہ

لوگ ہیں جنہیں، عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے، بالا خانے دیئے جائیں گے۔مگر یہ اس لئے ہے کہ غــرفۃ اگرچہ واحد ہے مراد یہی ہے کہ سب کو اونچا مقام ملے گا اس لئے اس کو ترجمے میں بالا خانے کہہ دیتے ہیں جو بالکل جائز ہے۔اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ارفع منازل عطا ہوں گی یا بالا مقام عطا ہوگا۔تو صرف گھروں کی ٹھنڈک اسی طرح وہاں منتقل نہیں ہوگی بلکہ گھروں کی ٹھنڈک میں ایک اونچا مقام ان کو عطا ہوگا، یہ مراد ہے بالا خانوں سے۔ورنہ یہ تو نہیں کہ جنت میں دو منزلہ مکان ہیں نچلا پبلک کے لئے اور اوپر اپنے پرائیویٹ کمروں کے لئے۔بالا خانے سے مراد ہے جو نیکیاں وہ اس دنیا میں حاصل کریں گے، جیسا گھر وہ اس دنیا میں اپنے لئے بنائیں گے اس کی بالائی منزل ان کو ملے گی۔وہ تقویٰ کی محبتیں، وہ نیکیوں کے پیار اور گھر والوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نیکیوں میں تسکین پانا یہ مرتبہ ان کا بہت بلند ہو جائے گا گویا دنیا میں وہ نیچے رہا کرتے تھے اور اب اونچے مقامات تک پہنچا دیئے گئے ہیں۔اور پھر یُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلَامًا اس میں وہ تحائف پائیں گے ایک دوسرے سے اور سلام۔جہاں محبت اور پیار بڑھ جائے وہاں تحائف کا ضرور تبادلہ ہوتا ہے، ایک قدرتی بات ہے اور نیک تمنائیں بھی بار بار نکلتی ہیں۔وہ مائیں جو اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی ہیں وہ ذرا سی ٹھوکر لگے سلام، اللہ کی حفاظت، اللہ بچائے، اللہ کی حفاظت میں اور آتے جاتے سلام سلام ہو رہا ہوتا ہے تو جنت کا یہ نقشہ کھینچا گیا ہے اسی پیار اور محبت کی وجہ سے جسے دنیا میں قرۃ عین قرار دیا۔

فرمایا تمہاری یہ دعا جب دنیا میں قبول ہوگی تو اسی دعا نے تمہاری جنت اس دنیا میں بنانی ہے اور یاد رکھنا اگر یہاں جنت نہیں بنا سکے تو وہاں بھی نہیں ملے گی، وہم ہے محض۔پس یہاں جنت حاصل کر لینا اور وہ جنت گھر کی جنت ہے، گھر میں تمہارے تعلقات اگر جنت نشان ہو جائیں اولاد نیک ہو، ماں باپ کے تعلقات آپس میں

اچھے، بچوں سے اچھے تو اس کے نتیجے میں پھر وہ غرفے ملیں گے جن کو اللہ تعالیٰ بالائی غرفے کہتا ہے۔ وہ ایسا مقام ہے جہاں یہ ساری لذتیں پہلے سے بہت زیادہ آگے بڑھادی جائیں گی اور تحائف ایک دوسرے کو دیں گے۔ اب جنت میں تو ہر چیز اپنی مرضی سے ملتی ہی ہے تحفوں کا کیا تعلق ہے وہاں۔ تحفوں کا تعلق یہ ہے کہ وہاں یہ بھی فرماتا ہے اللہ تعالیٰ۔ ایک دوسرے سے چھین چھین کے بھی کھائیں گے۔ تو جہاں سب کچھ بے شمار مل رہا ہو وہاں چھیننے کا کیا موقع، تحفے کی بات تو بعد میں آئے گی اس لئے کہ محبت کے اظہار ہیں صرف یہ۔ ایک انسان کسی پیارے کے ہاتھ سے لقمہ چھین کے بھاگ جائے تو یہ تو نہیں کہ اس کو بھوک لگی ہوئی تھی، ضرورت پڑی ہوئی تھی وہ اپنے محبت کے اظہار کے لئے کہ مجھے تمہارے ہاتھ کا لقمہ بھی پیارا لگتا ہے اور میں نے لے لیا ہے یہ۔ اور تحائف اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ وہ جس کو دیئے جاتے ہیں اس کی ضرورت کا خیال نہیں ہوتا بلکہ اپنی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ چنانچہ نماز میں جب روزانہ آپ تحیات میں بیٹھ کے کہتے ہیں التحیات للہ تو تحیات اللہ کے لئے، اللہ کو ضرورت ہے کوئی تحفوں کی !؟ جس نے سب کچھ دیا ہے اس کو آپ کیا تحائف دیں گے۔ آپ اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں اور یہ تحفے کی پہچان ہے جب کسی کی ضرورت کے لئے دیا جاتا ہے تو وہ صدقہ بھی ہو جاتا ہے، خیرات بھی ہو جاتی ہے، بدلہ بھی ہو جاتا ہے، ذمہ داری کی ادائیگی بھی ہے لیکن تحفے کی پہچان اپنے دل سے ملتی ہے۔ آپ کے دل میں یہ ضرورت پیدا ہوئی تھی کہ نہیں کہ جس سے ہمیں محبت ہے اس سے محبت کے اظہار کے لئے اس کو کچھ پیش کریں۔ اگر اس وجہ سے چیز اٹھی ہے تو پھر یہ تحفہ ہے ورنہ تحفہ نہیں کوئی نام اور رکھ دیں۔ تجارت کہیں، صدقہ خیرات کہیں جو بھی کہیں تحفہ نہیں بنے گا۔

تو اللہ کے لئے تحفہ کی شرط یہ ہے التحیات للہ کہ دل میں تمنا اٹھا کرے کہ

ہم اللہ کو خوش کریں اور دل چاہے کہ کچھ نہ کچھ تو ہم خدا کے حضور پیش کریں تو اس کے لئے پھر طیبات کی تلاش ہو، صلوات کی تلاش ہو کبھی نمازیں پڑھ کے خوش کریں، کبھی خدا کی راہ میں صدقے دے کر خوش کریں، کبھی چندے بڑھا کے خوش کریں۔ تو یہ توجہ ہوگی تو یہ تحفہ بنے گا ورنہ تحفہ نہیں بنے گا۔ پس جنت میں تحفوں کا یہ مطلب ہے اور جنت میں سلام کا یہ مطلب ہے۔ اتنا پیار ہوگا آپس میں کہ بے ضرورت جس کو دے رہے ہیں اس کو ضرورت کوئی نہیں آپ کا دل چاہتا ہے آپ دیں اور جب اس طرح کوئی چیز ملے تو اس کی لذت بہت بڑھ جایا کرتی ہے۔

پس جنت کی لذتیں بڑھانے کا ایک مضمون ہے جو بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا کی لذتیں بھی اسی طرح بڑھاتا ہے۔ جس سوسائٹی میں تحائف چلتے ہیں جو تحفہ دیتا ہے وہ اپنی طرف سے کچھ کمی محسوس کرتا ہے اس کو اپنی طرف سے کمی محسوس کرنی چاہئے اس کی چیز کم ہوئی ہے مگر کرتا نہیں۔ کیونکہ جس چیز کی زیادہ قدر ہے وہ اس معمولی چیز کے بدلے اسے مل جاتی ہے۔ اس کے دل کو محبت کی پیاس ہوتی ہے اصل میں اور تحفہ اگر محبت حاصل نہ کرے تو تحفہ چلتا ہی نہیں گھر سے۔ اسی لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جس کو تحفہ دیا جائے اس کو بتایا ضرور جائے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو اخفاء ہے اس کی حکمت اور ہے اگر اللہ تعالیٰ کو بھی پتہ نہ چلے تو کوئی بھی انسان نیکی نہیں کر سکتا۔ کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ اپنی چیز کو انسان یونہی پھینک دے۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں اخفاء کی اس لئے ضرورت ہے کہ اللہ جانتا ہے اور اگر محبوب کو تحفہ دیا جائے اس طرح کہ اور کسی کو خبر نہ ہو محبوب ہی کو پتہ چلے تو اس کی جتنی قیمت اس تحفے کی مل سکتی ہے اتنی کسی اور تحفے کی نہیں مل سکتی۔ پس اللہ تعالیٰ یہ محبتیں چاہتا ہے آپ سے کہ تحفے پیش کرو تو کبھی اس طرح پیش کیا کرو کہ خدا کے سوا کسی کو پتہ ہی نہ چلے اور یہ جو مخفی تحائف ہیں یہ زیادہ اعلیٰ درجے کے تحائف ہیں۔ تو اس دنیا میں

یعنی جنت میں جو تحائف چلیں گے وہ نہ صرف دینے والوں کے لئے لذت کے سامان پیدا کریں گے بلکہ لینے والا وہ چیزیں عام ہونے کے باوجود انہی سے مزے اٹھائے گا جو تحفے کے طور پر اس کو پیش ہو رہی ہیں۔ کبھی کھانے کے دوران کئی دفعہ تجربہ ہوتا ہے ایک بچے کو کوئی چیز آپ اپنی پلیٹ سے دے دیں تو اسے سنبھال کے الگ رکھتا ہے۔ کوئی اور اس سے لینے لگے تو کہے گا یہ لو، یہ نہیں میں نے دینی، یہ مجھے فلاں نے دی ہے، تو تحفوں سے کھانا تو وہی رہتا ہے، مزہ بڑھ جاتا ہے۔ پس یہ مزے ہیں جو جنت میں بیان کئے جا رہے ہیں کہ گھروں میں یہ پیدا کرو گے تو وہاں بہت بڑھ کر ملیں گے۔ اگر گھروں میں پیدا نہیں ہوں گے تو وہاں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ جن گھروں میں ہر وقت تو تکار، ایک دوسرے کو گالیاں دی جا رہی ہیں، فساد برپا ہیں، ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور کہتا ہے کیا مصیبت دیکھ رہے ہیں ہم۔ بعض دفعہ بعض میاں واقعتہً عورت کو کہتے ہیں واپس آ کر گھر میں کہ آج تیرا منحوس کا مونہہ دیکھ کر گئے تھے نا باہر، دیکھو کہ یہ ہوا اور اگر عورت بے چاری مار سے نہ ڈرے تو کہہ دیتی ہے کہ تیرا منحوس چہرہ دیکھا تو میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ جن کے آپس کے تعلقات یہ ہو جائیں ان کو نہ ایک دوسرے سے ٹھنڈک، نہ اپنی اولاد سے ٹھنڈک، وہ یہ دعا کیسے کریں گے، یہ سوال ہے۔ حرکتیں یہ ہوں اور دعائیں یہ ہوں

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوٰجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا

لیکن ایک اور بات اس دعا سے تعلق میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کئی گھروں کی اصلاح میں اس دعا نے مجھے بہت کام دیا ہے۔ بعض بیویاں جو بہت ہی تکلیف میں تھیں، شکایت کرتی تھیں کہ ہماری طرف توجہ نہیں ہے، ہم ہر کوشش کر چکی ہیں مگر کوئی پرواہ نہیں۔ ان کو میں نے کہا یہ دعا سنجیدگی کے ساتھ، باقاعدہ لگ کر کرو اور یقین رکھو کہ اس کا سننے والا ہے۔ جو دل تمہارے اختیار میں نہیں وہ خدا کے اختیار میں ہے۔

کر کے دیکھو پھر مجھے بتاؤ۔ ہر دفعہ تو نہیں کیونکہ بعض دفعہ وہ اگلا انسان ہی بدنصیب ہوتا ہے۔ دعا جس کے حق میں ہو اس کے لئے بھی اس کا کچھ استحقاق ہونا ضروری ہے۔ جس شخص کے حق میں دعا کی جائے اگر وہ مستحق نہ ہو تو دعا کرنے والا خواہ کتنا ہی بزرگ اور پہنچا ہوا کیوں نہ ہو اس کے حق میں قبول نہیں ہوتی۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ تمام کفار مکہ، تمام مشرکین، سب دنیا کے لئے دعائیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ کس بے قراری سے کرتے ہیں مگر فرماتا تھا کہ ہدایت اسی کو دوں گا جس کو میں سمجھتا ہوں مستحق ہے۔ دو عمروں میں سے آپؐ نے ایک مانگا اور حضرت عمرؓ مل گئے اور ابوجہل نہ ملا اس لئے کہ وہ مستحق نہیں تھا۔ پس یہ دعا ہر عورت کی قبول نہیں ہوتی۔ اگر خاوند بدنصیب ہو جائے کہ خدا کی نظر میں گیا گزرا ہے تو پھر بے چاری آخر یہی دعا کرسکتی ہے کہ اے خدا! مجھے اس ظالم سے نجات دے اور جنت میں مجھے گھر عطا کر، اس کے سوا چارہ کوئی نہیں۔ مگر بسا اوقات میں نے یہ دیکھا ہے کہ بعض عورتیں بے حد خوشی اور شکریہ کا خط لکھتی ہیں کہ جس طرح آپ نے نسخہ بتایا تھا اسی طرح استعمال کیا ہے پورا دل لگا کر، خدا کو حاضر و ناظر جان کر، اس پر اعتماد کرتے ہوئے، پورا بھروسہ کرتے ہوئے دعا کی۔ اے خدا! اب تیرے سوا چارہ نہیں اور خاوند کا دل بدل گیا اور کایا پلٹ گئی ہے، ہمارے گھر کی تو حالت ہی بدل گئی ہے، ہم تو ایک دنیا میں جنت حاصل کر چکے ہیں واقعتہً یہ لکھتے ہیں۔

مگر وہ جن کو یہ دعا نصیب نہ ہو سکے یا جن کی بعض وجوہات کی بناء پر یہ دعا قبول نہ ہو ان کے لئے پھر اللہ تعالیٰ نے فرعون کی بیوی کی دعا سکھائی ہے کہ اے خدا اس ظالم سے مجھے نجات بخش اور اس دنیا میں تو میں گھر نہیں دیکھ سکی، آخرت میں مجھے گھر دے دے۔ تیری محبت کی خاطر میں ایمان لائی ہوں اور یہ نہ ہو کہ دنیا میں بھی بے نصیب رہوں اور آخرت میں بھی بے گھر رہوں۔ تو ان کو بھی پھر جنت میں بالا

خانے ضرور ملتے ہیں اور فرعون کی بیوی کی دعا میں تو بڑا ہی درد ہے یہ دعا بھی استعمال کر کے دیکھیں پھر۔ درد کی کیفیت یہ ہے کہ اس پر ایمان لائیں جس کو پالا تھا اور ایک بادشاہ کی بیوی ہوتے ہوئے بادشاہ کا عتاب لے لیا لیکن ایمان نہیں چھوڑا۔ تو ایک گھر قربان ہوا اس کے بدلے خدا بہت بڑا اور بلند تر گھر اس کو عطا کرے گا اور اسی ارادے کے ساتھ خدا نے دعا سکھائی۔

پس خدا جو دعائیں سکھاتا ہے اس میں قبولیت کا ارادہ شامل ہوتا ہے۔ پس اس بات کو یاد رکھیں تو اس دعا کی اور بھی قیمت بڑھ جائے گی جو دعائیں خدا براہ راست سکھاتا ہے کہ یہ دعا کر، یہ دعا کر جب تک عطا کرنے کا ارادہ نہ ہو سکھانے کا کیا مطلب ہے۔ پس اس دعا کے لئے ہر گھر میں مقبولیت کا ایک در کھلا ہوا ہے۔ کوئی گھر بھی نہیں جس کی چھت پر ایک در نہ کھلا ہو جو اس دعا کے ذریعے سے خدا تعالیٰ سے رحمتیں طلب کرنے کے لئے کھولا گیا ہے۔ تو یقین کریں جب خدا سکھا رہا ہے تو دینے کا ارادہ رکھتا ہے، بادشاہ جب کہتے ہیں مانگ جو مانگتا ہے تو جو مانگتا ہے پھر اس کو دیتا ہے جس حد تک دینا ہو لیکن اگر یہ بھی ساتھ سکھائے کہ یہ دے سکتا ہوں میں اور اس طرح مانگ تو پھر کیسے انکار کر سکتا ہے۔

تو یہ وہ دعا ہے جو خدا نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں پہنچائی ہے کہ یہ دعا مانگا کرو تو تمہیں دنیا کی جنت بھی ملے گی آخرت کی جنت بھی ملے گی اور آخری بات اس کے بعد ہے أُولٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا صبر اس میں ضروری ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ بعض دعاؤں میں اگر صبر نہ ہو تو اس صبر کے فقدان کی وجہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں کیونکہ ہر چیز کے لئے ایک وقت ہے اور ہر بیماری کی شفا کا بھی ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ یہ میں بہت لمبے تجربے سے آپ کو بتاتا ہوں کہ ہر بیماری فوراً ٹھیک ہو نہیں سکتی اس لئے اگر دو دن دوائی کھائیں اور چھوڑ دیں تو ہرگز یہ

نہیں کہہ سکتے کہ اس دوا نے فائدہ نہیں دیا اس میں شفا تھی ہی نہیں۔ کئی ایسے مریض ہیں جو مجھے لکھتے ہیں کہ جی ہم نے اتنے دن کھائی ہے ان کو میں بتاتا ہوں کہ آپ کی بیماری ایسی ہے کہ ایک سال، دوسال کھانی پڑے گی یعنی دوا فوراً اثر نہیں دکھائے گی بعضوں کو میں کہتا ہوں ایک مہینہ کھاؤ پھر بتانا اور اگر میری تشخیص درست ہو تو مہینے والوں کی دوا مہینے کے بعد ضرور اثر دکھاتی ہے پھر وہ لکھتے ہیں ہاں اچانک ہم ٹھیک ہو گئے، اور سالوں والی دعا سالوں میں اثر دکھادیتی ہے۔

بعض عورتیں بچے کی خواہش لے کر آتی ہیں دعا کے لئے بھی اور دوا کے لئے بھی تو دوا جب میں دیتا ہوں تو بعض کہتی ہیں جی دو مہینے ہو گئے ہیں ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ دو مہینے کی بات نہیں ہے بعض دفعہ یہ دوا دوسال، تین سال بھی کھانی پڑتی ہے مگر کھاتی چلی جائیں کیونکہ ہر بیماری کی تبدیلی کے اندر اس کا وقت لکھا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی جو چیزیں آہستہ آہستہ آکر خلیوں میں بیٹھ جائیں، جسم کی بناوٹ کو تبدیل کر دیں، رحم کے اوپر کچھ ایسی پپڑیاں جم جائیں جو اس کے بچے کے پیدا ہونے کے رستے میں ایک دیوار بن کر حائل ہوں تو کوئی تیزاب ڈال کے تو نہیں آپ گھول سکتے ان پپڑیوں کو۔ آہستہ آہستہ جسم میں ایک ردعمل پیدا ہوتا ہے، صحت مند خون چلتا ہے پھر وہ رفتہ رفتہ دور ہونے لگ جاتی ہیں۔ تو جب دنیا کی بیماریوں کا یہ حال ہے تو اخلاقی اور روحانی بیماریوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ بعض لوگ فوراً شفا پا نہیں سکتے مگر جو صبر نہیں رکھتا نہ وہ دنیا کی بیماریوں سے شفا پا سکتا ہے، نہ روحانی بیماریوں سے شفا پا سکتا ہے تو ایسا کامل نسخہ ہے قرآن کریم کہ اس کے ہر نسخے کے اندر ہر احتیاط کا پہلو ہر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کوئی پہلو نہیں چھوڑا گیا۔

تو یہ دعا سکھا کر کہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر ہمیں اور اولاد کی طرف سے بھی ہم ٹھنڈ پائیں ایک دوسرے سے بھی ٹھنڈ پائیں، فرمایا، تمہیں بالا خانے تو ملیں

گے مگر اس وجہ سے ملیں گے بِمَا صَبَرُوْا یعنی ان لوگوں کو، ان دعا کرنے والوں کو جو جزا ملے گی اس لئے کہ اس دعا کے ساتھ صبر بھی شامل تھا اور صبر میں دو مضمون ہیں ایک یہ کہ دعا کے ساتھ ایک دکھ کی لذت بھی شامل تھی یعنی خشک مونہہ سے دعائیں نہیں کیا کرتے تھے۔ صبر کے ساتھ دکھ کا ایک لازمی تعلق ہے ورنہ صبر کا معنیٰ ہی کوئی نہیں اگر ویسے آرام کی زندگی ہے تو اسے صبر کون کہہ سکتا ہے تو فرمایا ان کو جو جزا ملے گی اس لئے کہ ان کی دعاؤں میں ایک دکھ تھا اور صبر کرتے تھے دو باتوں میں۔ ایک تو یہ کہ ہم پر توکل میں صبر کرتے تھے اور آئے دن یہ نہیں کہتے تھے کہ لو جی ہماری تو دعا قبول نہیں ہوئی اور دوسرے یقین رکھتے تھے کہ خدا تعالیٰ تبدیلی کر سکتا ہے اس لئے تبدیلی نہ بھی نظر آئے تو ایمان نہیں جاتا تھا ان کا اور صبر کر کے وہ دعا کرتے چلے جاتے تھے۔

حضرت زکریاؑ کی دعا دیکھو کتنی عظیم الشان ہے۔ وہ کہتے ہیں دعائیں کرتے کرتے میں بوڑھا ہو گیا ہوں، ہڈیاں گل گئیں، سر بڑھاپے سے آگ کی طرح بھڑک اٹھا ہے، سفید ہو گیا ہے وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا اے خدا! آج تک میں وہ بد بخت نہیں جو تیری دعا سے مایوس ہو جاؤں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ یہ ہے صبر جو بعض دفعہ اتنا لمبا کھینچا جاتا ہے جس طرح حضرت زکریاؑ کا ذکر ہے مگر روزمرہ کی زندگی میں اتنے لمبے امتحان خدا نہیں لیا کرتا۔ انبیاء کے مناصب بلند ہیں، ان کے امتحان بھی بڑے کڑے ہوا کرتے ہیں اور بعض دفعہ لمبے چل جاتے ہیں مگر نیا نیا خدا کا مہمان بن رہا ہو اس کے ساتھ خدا اتنے لمبے معاملے نہیں کیا کرتا۔ شروع شروع میں دعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں پھر جب انسان آگے ترقی کرے تو پھر پورا صبر کے مضمون میں داخل ہو جاتا ہے۔

تو یہ دعا بہت ہی اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر ہمارا معاشرہ تبدیل نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر عبادت کا لطف بھی نہیں آ سکتا۔ عبادت کا لطف اس ماحول میں ہی ہے جو

ماحول یہاں بیان فرمایا گیا ہے۔ نیک ماحول ہے ایک دوسرے کی نیکیاں اچھی لگتی ہیں ایک دوسرے کی نیکیاں دیکھنے کو دل چاہتا ہے، ان نیکیوں کے لئے دعائیں کرتے وقت گزرتا ہے پھر جب وہ عطا ہوتی ہیں تو جتنا نیک ہو کوئی ساتھی اتنا زیادہ اس سے پیار بڑھ جاتا ہے اتنی ہی زیادہ اس کی دل میں قدر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ فرمایا خَالِدِیْنَ فِیْهَا یہ وہ حالت ہے جو ہمیشہ کی ہے اتفاقی آئی گئی حالت کا نام نہیں ہے۔ یہ حالت تو آکر ٹھہر جانے والی ہے اور صبر کے ساتھ اس مضمون کا گہرا تعلق ہے۔ صبر کا مطلب ہے جتنا لمبا چاہے اللہ آزمائے، ہٹنا نہیں اور جب انسان استقامت دکھادے، صبر دکھادے تو خدا کیسے اس کی جزا کو عارضی بنا سکتا ہے۔ پس دائمی جزا کا صبر سے ایک گہرا تعلق ہے۔

فرمایا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا کیا ہی عمدہ، کیا ہی خوبصورت عارضی ٹھکانہ اور کیا ہی خوبصورت مستقل ٹھکانہ ہے۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح ٹھکانے کا ذکر گزرا ہے سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا کہ وہ لوگ جو اس مضمون کو نہیں سمجھتے اور اپنے گھر کو خود برباد کر لیتے ہیں ان کے لئے تو وہ گھر بھی خواہ وہ عارضی ہو وہ بھی مصیبت ہے، مستقل ہو تو اور بھی مصیبت اور جہنم میں بھی یعنی دوسری دنیا میں بھی ان سے پھر یہی سلوک ہوگا جو ان کو دوسری دنیا کا گھر نصیب ہوگا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا اس سے تو ایک لمحہ بھر کے لئے گزرنا ہی بڑی مصیبت ہے، کہاں یہ کہ آپ وہاں مستقل ڈیرہ ڈال کے بیٹھ رہیں۔ تو اس کے مقابل پر یہ جزا بیان فرمائی گئی ہے۔ ایک گھر تم وہ بھی بنا سکتے ہو جو تم جہنم میں بنا رہے ہو اس دنیا میں بیٹھے یہاں بھی مارے گئے وہاں بھی مارے گئے اور ایک گھر اس کے مقابل پر جنت میں بنانے کا یہ طریق ہے اگر اس کو اختیار کرو گے تو یہاں بھی کامیاب ہو گے اور وہاں بھی کامیاب ہو گے اور دونوں جگہ کی جنتیں نصیب ہوں گی۔

قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا تو کہہ دے کہ میرا رب تمہاری کچھ بھی پرواہ نہ کرتا لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ اگر تمہاری دعا نہ ہو۔ یہ کیا وجہ ہے کیا اللہ تعالیٰ بندوں سے ایسا بے نیاز ہے جو مرضی برباد ہوتے پھریں ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ میں بندے کی بے اعتنائی کا ذکر ہے اصل میں، جب تم میرا پوچھتے ہی نہیں میرے پاس آنے کی تمنا ہی پیدا نہیں ہوتی تو پھر تمہارے دل سے دعا اٹھ ہی نہیں سکتی۔ پس دعا سے مراد یہ نہیں کہ اللہ کو بلوانے کا شوق ہے۔ مراد یہ ہے کہ تمہارے دل میں میری اتنی بھی محبت نہیں کہ کبھی مجھے پکارو، کبھی مجھے بلاؤ تو پھر میں بھی گرا پڑا نہیں ہوں۔ اگر تم مستغنی ہو تو میں تم سے بڑھ کر مستغنی ہوں، اگر تم دعا نہیں کرتے، میری طرف توجہ ہی کوئی نہیں اور یہ سارا مضمون وہی دعا کا ہے۔ دعاؤں کے ذریعے تم دنیا کی جنتیں اور آخرت کی جنتیں حاصل کرنے کی تمنا ہی نہیں رکھتے، کوشش ہی نہیں کرتے تو پھر كَذَّبْتُمْ تم جھٹلا بیٹھے ہو۔

فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا اس دعا کو جھٹلانے کی جو وبا ہے یا دعا کو جھٹلانے کی جو بلاء ہے وہ تم سے چمٹ جائے گی، تمہیں چھوڑے گی نہیں کیونکہ خدا کے سوا دنیا میں کوئی سہارا ہی نہیں ہے۔ پھر ہر مصیبت، ہر بلاء تمہارا دائمی حصہ بن جائے گی۔ پس اس سے پہلے دیکھیں فرمایا تھا وہ ہمیشہ کے لئے ہے خَالِدِيْنَ فِيْهَا اب جو بدی ہے اس کے مقابل کی اس کو بھی مستقل کر کے دکھا رہا ہے اللہ تعالیٰ۔ خَالِدِيْن کے مقابل پر یہ ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا تم نے جب دعا کو جھٹلا ہی دیا ہے تو جو بدیاں دعا کے بغیر تم سے چمٹنے والی ہیں وہ پھر مستقل چمٹی رہیں گی، وہ چھوڑیں گی ہی نہیں تمہیں۔ تو یا اُس طرف کا دوام حاصل کر لو یا اِس طرف کا دوام حاصل کر لو، یا اُدھر کی ہمیشگی لے لو یا ادھر کی ہمیشگی لے لو یہ دو ہی رستے ہیں تمہارے لئے جس کو چاہے اختیار کرو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس دعا کے متعلق اپنے ایک کشف کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں اور یہ بہت ہی اہم کشف ہے جسے ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے۔فرماتے ہیں ''انسان کی پیدائش کی اصل غرض تو عبادتِ الٰہی ہے لیکن اگر وہ اپنی فطرت کو خارجی اسباب اور بیرونی تعلقات سے تبدیل کرکے بے کار کر لیتا ہے''۔فرمایا فطرت میں خدا کی طرف جھکنا ہے اور اگر نہیں جھکو گے اور دنیا کی لذتوں کی طرف مونہہ رکھو گے تو پھر تم اس کے عبد بن نہیں سکتے۔اور جب تم اس کے عبد نہیں بن سکو گے تو پھر اس کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔اس مضمون کے لئے جو دوسری آیات میں نے چنی ہیں وہ آج تو خطبے کا وقت ختم ہو رہا ہے پھر انشاءاللہ وقت ملے گا تو آپ کو سناؤں گا۔یہاں کشف سن لیجئے۔

فرماتے ہیں کہ ''میں نے ایک بار پہلے بھی بیان کیا تھا کہ میں نے ایک رویا میں''۔یہ رویا ہے،کشف ان معنوں میں نہیں جو عام طور پر معروف ہیں،فرمایا ''میں نے ایک رویا میں دیکھا کہ میں ایک جنگل میں کھڑا ہوں شرقاً غرباً اس میں ایک بڑی نالی چلی گئی ہے۔اس نالی پر بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اور ہر ایک قصاب کے جو ہر ایک بھیڑ پر مسلط ہے ہاتھ میں چھری ہے'' ایک ایک بھیڑ پر ایک ایک قصاب الگ الگ مقرر ہے ''جو انہوں نے ان کی گردن پر رکھی ہوئی ہے اور آسمان کی طرف مونہہ کیا ہوا ہے میں ان کے پاس ٹہل رہا ہوں میں نے یہ نظارہ دیکھ کر سمجھا کہ یہ آسمانی حکم کے منتظر ہیں تو میں نے یہ آیت پڑھی قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ یہ سنتے ہی ان قصابوں نے فی الفور چھریاں چلا دیں اور یہ کہا کہ تم ہو کیا آخر گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو''۔

اب یہ جو رویا کا نظارہ ہے بہت ہی گہرا اور بہت ہی لطیف تفسیر ہے اس آیت کریمہ کی۔بھیڑیں گوہ پر مونہہ مارنے میں مشہور ہیں۔بکریاں بھی ہر طرف مونہہ

مارتی ہیں مگر بھیڑیں خاص طور پر گندگی کھانے میں ایک خاص شہرت حاصل کر چکی ہیں تو مضمون جو بیان ہوا ہے اس آیت سے پہلے وہ یہی تو ہے کہ یا اِدھر کا مونہہ رکھو گے یا اُدھر کا مونہہ۔ اِس طرف دلچسپیاں لو گے یا اُس طرف دلچسپیاں لو گے۔ اگر تمہاری دلچسپیوں کا رخ غیر اللہ کی طرف ہی رہے گا تو تم پھر عبادت نہیں کر سکتے اور جب اللہ کے عبد نہیں رہو گے تو خدا کو پھر تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ پھر آسمان سے کسی وقت بھی تمہاری ہلاکت کا حکم نازل ہو سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر وقت پکڑے جاؤ۔

پس اس آیت میں جہاں تنبیہہ ہے اور ایک خوفناک نظارہ ہے وہاں بخشش کے لئے اور توبہ کے لئے گنجائش بھی کھلی رکھی ہے۔ کوئی تقدیر کا فرشتہ آپ کی گردن پر چھری نہیں پھیرے گا جب تک آسمان سے یہ آواز نہ اُترے کہ ہاں اس کا وقت آ گیا ہے۔ پس اس وقت سے پہلے پہلے پھر جاؤ اور خدا کی طرف توجہ کر کے دنیا کی ہلاکتوں سے بچنے کی کوشش کرو پھر دعا زیادہ زور اور شدت کے ساتھ اٹھے گی کیونکہ خطرے کی دعا ہے، مضطر کی دعا بن جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ کو نئی زندگی عطا ہو سکتی ہے جس میں عبادت میں لذت پیدا ہو جائے گی اور اور بھی بہت سے فوائد، جو اس دنیا کے بھی ہیں آخری دنیا کے بھی ہیں، وہ اسی دعا سے وابستہ ہو جائیں گے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھ کے سنائی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (الفضل انٹرنیشنل 2 مئی 1997ء)

عباد الرحمٰن کے مضمون کے تسلسل میں حضورؒ نے مؤرخہ 21۔ مارچ کو سورۃ یٰسین کی درج ذیل آیات تلاوت فرمائیں۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ج اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ط اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝

(یٰس: 61-63)

ان کا ترجمہ یہ ہے اے بنی آدم! کیا میں نے تم پر یہ عہد فرض نہیں کر دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِین وہ تو تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے، یقیناً وہ تو تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے اور میری عبادت کرو یہ صراط مستقیم ہے۔ اور وہ تو اس سے پہلے تمہی میں سے بہت بڑی تعداد میں مخلوق کو گمراہ بنا چکا ہے۔ لَقَد میں اس سے پہلے کا مضمون داخل ہے وہ پہلے ہی یہ کام کر چکا ہے تم جانتے ہو کہ بڑی بھاری تعداد مخلوق میں سے ایسی ہے جسے اس نے گمراہ کر دیا اَفَلَمْ تَکُوْنُوْا تَعْقِلُوْن تو کیا تم عقل والوں میں سے نہیں بنو گے۔ ایسے نہیں ہو گے جو عقل رکھتے ہوں یا عقل سے کام لیں، عقل استعمال کریں۔

یہ جو آیات ہیں ان کا تعلق اسی مضمون سے ہے جو گزشتہ چند خطبات میں اب تک جاری رہا ہے سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش کے حصول کے لئے اس کے اس وعدے سے ہم کیسے استفادہ کر سکتے ہیں جس میں وہ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! میری بخشش سے مایوس نہ ہو، میں چاہوں تو تمام گناہ بخش سکتا ہوں۔ اس عظیم وعدے کے بعد پھر وہ کون سی شرائط ہیں جن کی پابندی کے نتیجے میں ہم اللہ تعالیٰ کی اس وسیع رحمت کی مغفرت کی چادر کے نیچے آ سکتے ہیں۔ رحمت کی مغفرت میں نے اس لئے کہا کہ رحمت ہی سے مغفرت پھوٹتی ہے اور بنیادی صفت اللہ تعالیٰ کی جو اس کی مغفرت کے زیر سایہ ہر مخلوق کو ڈھانپنے والی ہے وہ رحمانیت کی صفت ہے۔

پس یہ وہ مضمون ہے جس کو آسان کرنے کی خاطر میں نے قرآن کریم کی سورہ الفرقان کی وہ آیات آپ کے سامنے رکھیں جس میں مضمون شروع ہی عبادالرحمٰن کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ اگر تم مغفرت کی تمنا رکھتے ہو تو مغفرت تو رحمان سے ہو گی اور رحمٰن کے بندے بننا پڑے گا۔ اگر رحمٰن خدا کے بندے بن سکتے ہو تو پھر تمہاری مغفرت کی توقعات برحق ہوں گی۔ اگر رحمٰن کے بندے نہیں بنتے اور

توقعات یہ ہوں کہ جو فیض رحمانیت کا ہے وہ تمہیں پہنچے تو اس تو ہم کو دل سے نکال ڈالو۔ اللہ تعالیٰ کوئی فرضی چیز نہیں ہے جو آپ کے جذبات کی آپ کی امنگوں کی پیداوار ہو۔ آپ کے جذبات اور آپ کی امنگوں کو خدا تعالیٰ کی حقیقت کے سامنے سرنگوں ہونا ہوگا۔ وہ حق ہے، ایک دائمی حقیقت ہے کسی انسان کے تصور کی پیداوار نہیں۔ انسان کے تصور کو اس کے سامنے جھکنا ہوگا اور وہی رنگ اختیار کرنے ہوں گے جن کی وہ انسان سے توقع رکھتا ہے۔ اس پہلو سے وہ آیات میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں جن میں عبادالرحمٰن بننے کے متعلق قرآن کریم نے کچھ توقعات آپ کے سامنے رکھیں کہ عبادالرحمٰن بننا چاہتے ہو تو یہ بن جاؤ، یہ بن جاؤ، یہ بن جاؤ۔ یہ نہ بنو، وہ نہ بنو اس طرح تم عبادالرحمٰن کے زمرے میں داخل ہو سکتے ہو۔

اب ان آیات میں جن کی میں نے تلاوت کی ہے ان آیات میں ایک ایسی شرط رکھ دی گئی ہے جو اگر آپ پوری نہ کریں تو عبادالرحمٰن بن سکتے ہی نہیں اور وہ شرط ہے عبادالشیطان نہ بنو۔ تو پہلے اس منفی شرط کو پورا کریں تو پھر مثبت دائرے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ منفی شرط پوری نہ کی جائے تو جو مثبت دائرے ہیں جو اعلیٰ درجے کے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں وہ ممکن ہی نہیں۔ بعض پرہیز اگر نہ ہو تو کوئی دوا فائدہ نہیں دیتی۔ بعض زہر کھائے جائیں تو اس کے نتیجے میں تریاق کی تلاش بیکار ہوگی۔ اگر آپ زہر کھائیں اور کھاتے رہیں تو تریاق بھی بیکار ہوگا۔ تو یہ جو آیات ہیں یہ اس زہر سے تعلق رکھتی ہیں جس کے ہوتے ہوئے خدا کی رحمت کا تریاق آپ سے کھینچ لیا جائے گا۔ وہ آپ کو عطا ہی نہیں ہوگا۔

اور عجیب بات ہے کہ ان آیات کا بھی درحقیقت تعلق سورہ فاتحہ ہی سے ہے جہاں رحمانیت کے مضمون کو خوب کھول کر پیش فرمایا گیا ہے، عبادت کے مضمون کو خوب کھول کر پیش فرمایا گیا ہے۔ اور اس بات کو سمجھنے کے نتیجے میں آپ کو بہت سی ایسی

باتیں سمجھ آجائیں گی جن کے نتیجے میں آپ شیطان کی عبادت سے بچ سکتے ہیں ورنہ یہ کہہ دینا کہ شیطان کی عبادت سے بچو اور اس کا تفصیلی طریقہ نہ سمجھانا یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو بہت سی جگہوں پر کھولا ہے کہ شیطان کی عبادت ہوتی کیا ہے، کیسے اس سے بچنا ہے۔ مگر اس جگہ سورہ فاتحہ کے حوالے سے اس بات کو کھول کر بیان فرمایا گیا ہے یعنی بظاہر یہ اشارے ہیں لیکن ہر اشارے میں کھلے مضمون شامل ہیں۔

اب دیکھ لیں آپ اس کا سورہ فاتحہ سے تعلق اَنِ عْبُدُوْنِیْ ط ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْم ۔اِیَّاكَ نَعْبُدُوَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم تو ایک ایک بیچ کا لفظ چھوڑ دیا گیا اور سورہ فاتحہ کے اہم ایسے الفاظ استعمال کئے گئے جو آپ کا ذہن لازماً سورہ فاتحہ کے رستے پر ڈال دیں۔ صراط مستقیم کے بعد مغضوب کا لفظ چھوڑ کے پھر ضالین کا لفظ استعمال فرمادیا گیا۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْراً ۔ تو یہ عجیب اللہ کی شان ہے کہ جگہ جگہ وہ نشان راہ مقرر فرماتا چلا جاتا ہے۔ تفصیل کے ساتھ سورہ فاتحہ کو نہیں دہرایا گیا مگر اتنے قطعی نشان دے دیئے ہیں سورہ فاتحہ کے کہ کسی انسان کا دماغ اس رستے سے بہک سکتا ہی نہیں۔

پس اِیَّاكَ نَعْبُدُ سے شروع ہو کر ضالین تک کے مضامین کے حوالے دے کر آپ کو بتایا گیا ہے کہ شیطان کی عبادت کرو گے تو یہ نعمتیں تمہیں نصیب نہیں ہوسکیں گی۔ اس کی سچی عبادت، صراط مستقیم اور ضالین کی لعنت سے بچنے کی جو نعمتیں ہیں یہ تمہیں نصیب نہیں ہوسکتیں۔ اب یہ تو نشان دہی ہوگئی مگر آگے شیطان کو پہچاننے والی باتیں یا اس کی عبادت سے بچنے کے طریق کہاں گئے۔ وہ دراصل اس سے پہلے جو مضمون ہے سورہ فاتحہ کا، اس میں بیان ہوئے ہیں اور اس

طرف یہ آیات اشارہ کررہی ہیں بلکہ کھلم کھلا انگلی اٹھا کر دکھا رہی ہیں۔ جب آپ سورہ فاتحہ کے اس حصے پہ پہنچتے ہیں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ ہم تیری عبادت اور صرف تیری عبادت کرتے ہیں تو کیوں یہ فیصلہ دل میں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اس سے پہلے خدا تعالیٰ اپنا ایک تعارف کروا چکا ہے اور وہ تعارف ہے کہ وہ رب العالمین ہے، وہ رحمان ہے، وہ رحیم ہے، وہ مالک یوم الدین ہے۔ یہ چار صفات اگر کسی وجود میں ہوں تو بے اختیار اس کی عبادت کے لئے روح آمادہ ہوتی ہے اور ان چار صفات کا علم کافی نہیں جو محض ذہن سے تعلق رکھتا ہو۔ ان چار صفات کے ایسے علم کی ضرورت ہے جو حق الیقین ہو اور کامل طور پر اعتماد ہو کہ ہاں یہی ہے۔ اگر یہ چار صفات آپ کو کسی جگہ دکھائی دیں گی تو لازماً روح عبادت کرے گی اس وجود کی۔ اب شیطان کو پہچاننے کا طریقہ سمجھا دیا۔ فرمایا اگر تم رحمانیت میں بھی شیطان کی طرف جھک رہے ہو، غیر اللہ کی طرف جھک رہے ہو، اگر تم رحیمیت میں بھی غیر اللہ کی طرف جھک رہے ہو، اگر تم ربوبیت میں سب سے پہلے کہنا چاہئے تھا، ربوبیت میں غیر اللہ کی طرف جھک رہے ہو، رحمانیت میں، رحیمیت میں اور اسی کو مالک یوم الدین سمجھتے ہو تو پھر لازماً تم اس کی عبادت کرو گے۔ پھر تم اس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتے جہاں سے روح کی گہرائی سے یہ آواز اٹھے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ اور اس میں شیطانی صفات کو منفی انداز میں اس طرح پیش فرما دیا کہ ربوبیت جہاں نہیں ہے وہاں ربوبیت رکھ دینا، رحمانیت جہاں نہیں ہے وہاں رحمانیت تصور کر لینا، رحمیت جہاں نہیں ہے وہاں اس مقام کو رحیمیت کا مقام سمجھ بیٹھنا، جہاں ملکیت نہیں اور مالکیت نہیں وہاں ملکیت اور مالکیت کو تصور میں لانا اور اس پہلو سے اگر تم کرو گے تو لازماً مشرک بنو گے اور عبادت کا رخ یکسر بدل جائے گا اور شرک کی سب سے خطرناک تعریف یہ ہے جو اس آیت میں کی گئی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تم سے میں نے عہد نہیں لے رکھا تھا کہ شیطان کی عبادت نہیں

کرو گے۔ پس اس عبادت کے لفظ کے ساتھ یہ عہد لینا کہ شیطان کی عبادت نہیں کرو گے اس نے اس مضمون کو خوب کھول دیا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ خدا کو کہو اور رب اور رحمان اور رحیم اور مالک شیطان کو سمجھو یہ وہ عبادت ہے جس سے ہم نے تمہیں روکا تھا۔

اور لفظ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ کا محاورہ عام عہد سے مختلف ہے۔ ایک عہد ہوتا ہے جس میں دو طرف شریک ہوتے ہیں اس کو معاہدہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے جو انبیاء سے میثاق لئے ہیں ان میں دو طرفہ عہد ہے تم یہ کرو تو میں یہ کروں گا۔ ایک عہد ہوتا ہے جو ایک غالب اور مقتدر ہستی اپنے ماتحتوں سے لیتی ہے اور اس میں دو طرفہ عہد کی شقیں نہیں ہوتیں۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ یہ کام نہیں کرو گے، جب آپ یہ کہیں کسی بچے کو اور اس کو مجبور کریں کہ وہ آپ سے یہ عہد کرے تو یہ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ والا مضمون ہے۔ چنانچہ حضرت امام راغب لکھتے ہیں کہ یہ مضمون اس طرح کا ہے کہ کسی پر عہد فرض کر دینا اور اس کی حفاظت کی تلقین کرنا۔ تو فرمایا کہ ہم نے کیا ہمیشہ سے تم پر یہ عہد فرض نہیں کر دیا تھا اور لازم نہیں کر دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہیں کرنی۔ اگر تم اس کی عبادت کرو گے تو اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا تعلق ہم سے کٹ جائے گا۔ پس اب پہچاننے کے طریقے کیا ہمارے سامنے آئے۔ اب دنیا میں جہاں جہاں بھی شیطان کی عبادت ہو رہی ہے یا غیر اللہ کو مالک سمجھنے کے نتیجے میں ہو رہی ہے غیر اللہ سے چار صفات کھینچ لیں تو آپ کی جوتی کی نوک بھی اس وجود کو سجدے نہیں کرے گی کیونکہ ہر سجدہ ایک منفعت کو چاہتا ہے ہر عبادت کے نتیجے میں کچھ حاصل ہوتا ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے نتیجے میں صراط مستقیم نصیب ہوتی ہے وہاں شیطان کی عبادت کے نتیجے میں ضالین کا مقدر ملتا ہے۔

یہ باتیں ساری ان آیات میں اپنے اپنے مقام پر رکھ دی گئی ہیں اور جب آپ ان کو کھول کر پڑھتے ہیں تو حیرت انگیز اس میں ایک ربط ہے، اس مضمون میں

ایک تسلسل ہے، ایک گہرائی ہے اور ایک بات کو سمجھنے سے دوسری بات از خود سمجھ آنے لگتی ہے۔ پس اس پہلو سے میں اس آیت کے بعض دوسرے پہلو آپ کے سامنے کھولتا ہوں۔ کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا یا تم پر یہ عہد فرض نہیں کر دیا تھا اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ج اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ وہ تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے۔ اب سب سے پہلے یہ دیکھنے والی بات ہے کہ شیطان کو ایک جگہ تو یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ کھلا کھلا دشمن ہے اور دوسری جگہ یہ فرمایا گیا کہ اِنَّہٗ یَرٰکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ ط اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (الاعراف:28) کہ شیطان تو ایسا ہے کہ وہ تمہیں وہاں وہاں سے دیکھ کر تم پر حملے کرتا ہے جہاں جہاں سے تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ تو کھلا کھلا کیسے ہو گیا۔

شیطان کھلا کھلا دکھائی دینے والا نہیں لیکن اس کی دشمنی ضرور تمہیں دکھائی دے جائے گی، یہ وہ مضمون ہے عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ہونا اس کا ثابت ہے جن رستوں سے خدا تعالیٰ تمہیں روک رہا ہے جب قومیں اس رستے پر چلتی ہیں تو لازماً نقصان اٹھاتی ہیں۔ پس پہچانیں یا نہ پہچانیں کہ کس کی تحریص اور تحریک پر ہم ان رستوں پر چل رہے تھے مگر اس کا بد نتیجہ ضرور دیکھ لیتی ہیں تو تضاد نہیں ہے بلکہ مضمون کے بعض مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر نصیحت فرمائی جارہی ہے۔ وہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

پس اس کا، شیطان کا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ہونا اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ جب بھی آپ اس کی پیروی کریں اس کے نتیجے میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور اس عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ کی پیروی کیوں کرتے ہیں جب کہ خدا فرما رہا ہے وہ تمہیں وہاں سے دیکھ رہا ہے جو تم اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ وہ کون سا طریق ہے اس کا جس کے نتیجے میں تم اس کو پہچان نہیں سکتے۔ فرمایا اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ شیطان دوست

بن کر آتا ہے اور جو دوست بن کر آئے جس کے دوستوں کے زمرے میں تم داخل ہو، جس کو تم اپنے دوستوں کے زمرے میں داخل کر لو اس کو تم پہچان نہیں سکتے پھر۔ اس لئے شیطان اور شیطانی صفات کے لوگوں سے دوستی کرنا انتہائی مہلک چیز ہے پھر تمہیں شیطان کے شر سے آگاہی نہیں ہوگی اور وہ تم پر حملہ کر دے گا۔

ایک تو یہ بات کھل گئی کہ شیطان تو نظر نہیں آتا مگر شیطان کے اولیاء اپنے بد اعمال، بدکرداری کی وجہ سے دکھائی دے دیتے ہیں۔ اپنے اولیاء میں وہ ظاہر ہوتا ہے اس لئے پیشتر اس کے کہ تم اس کے اولیاء میں داخل ہو جاؤ اس کے اولیاء کو پہچانو اور ان سے پرہیز کرو، اپنی مجلسوں کی حفاظت کرو، بدکردار لوگوں سے دُور بھاگو۔ خدا کے خلاف بدزبانیاں اور بدتمیزیاں کرنے والوں کو اپنی مجلس میں کوئی راہ نہ دو۔ ان لوگوں سے توبہ کرو تو پھر تم خدا کی عبادت کے قریب تر ہو سکتے ہو۔

ایک موقع پر کالج کے طالب علم تھے، حضرت خلیفۃ المسیح الاول سے یہ گزارش کی کہ میرے دل میں دہریت کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور میں مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں، دباتا ہوں لیکن وہ دبتے نہیں۔ آپ نے فرمایا تمہارا کوئی ساتھی ایسا ہے جو دہریہ ہے اس سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ کیونکہ بعض دفعہ وہ کہتا بھی نہیں مگر اس کے دل کے خیالات دوسرے انسان کے دل میں منتقل ہو جاتے ہیں، نمازی اگر ساتھ کھڑا ہوا کچھ اور سوچ رہا ہے تو نماز پڑھنے والے کی نماز کی توجہ میں فرق پڑے گا اور یہ ایک تجربہ شدہ حقیقت ہے، یہ کوئی توہّمات سے تعلق رکھنے والی بات نہیں ہے۔ جس مجلس میں آپ بیٹھتے ہیں وہاں خیالات از خود ایک دوسرے کی طرف منتقل ہو رہے ہوتے ہیں گو تعیین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس کے خیالات کس طرف جا رہے ہیں مگر خاموشی سے بیٹھیں تو مجلس میں خیالات از خود منتقل ہوتے ہیں اور کسی ظاہری سائنسی ذریعے سے ان کے انتقال کو ثابت نہیں کیا جا سکتا مگر ہوتے ضرور ہیں۔

پس صحبت شیطان کی اگر براہ راست نہ پہچانی جاسکے تو اس کے اولیاء سے پہچانی جائے گی جو شیطان کے اولیاء ہیں وہ ویسا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اَلَااِنَّ اَوْلِیَـاءَ اللّٰـہِ مخاطب کر کے ان کی صفات بیان فرمائیں جو خدا کے ولی ہیں۔ تو اللہ کے ولی اپنی صفات سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے رنگ بدل جاتے ہیں، ان کا اٹھنا بیٹھنا مختلف ہوجاتا ہے، ان کی چال ڈھال الگ ہوجاتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ کا ولی ہو اور ایک بدکردار انسان اور دونوں میں فرق نہ پتہ لگے!!؟ پس خدا تعالیٰ نے لفظ اولیاء میں اس شیطان کو سمجھنے کی چابی رکھ دی۔ ایک طرف فرمایا وہ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر فرمایا اس سے بچ کے رہو۔ اب انسان کہے گا جو دکھائی ہی نہیں دیتا، ہمیں پتہ ہی کچھ نہیں بچیں کس طرح۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ اولیاء بن کر تمہارے پاس آئے گا، تمہارا ولی بن کے آئے گا اور جو بھی شیطانی بات کرے گا شیطان کا ولی بنے گا، وہ پہچانا جاتا ہے کیونکہ ولی کے اندر اس کی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ اب اللہ کے ولیوں سے آپ کو خدا کی شناخت تو ہوتی ہے مگر ان کی ذات میں خدا تو نہیں ہوتا، صفات جلوہ گر ہوجاتی ہیں۔ پس لازماً شیطان کے اولیاء میں شیطان کی صفات جلوہ گر ہوجاتی ہیں وہاں وہ دکھائی دینا چاہیئے اور دکھائی دیتا ہے۔ پس ایسے لوگوں سے پرہیز اور اپنے تعلقات کی حفاظت کرنا، نہ ایسے لوگوں کو گھروں میں آنے دیں، نہ ان کے گھروں میں جائیں، نہ ان سے مجلسیں لگائیں جن کی باتوں میں آپ کو کوئی بھی دین کے خلاف بو آتی ہو جن میں اللہ اور اس کے رسول کا احترام نہ ہو۔

چنانچہ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی مجالس کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ جہاں دین سے مذاق ہو رہا ہو وہاں سے اٹھ جایا کرو لیکن فرمایا کہ اگر دوبارہ جاؤ اور پھر تمہیں یہ محسوس ہو کہ تمہارے دل پر کوئی زنگ لگا ہے تو پھر کلیتہً ان سے تعلق کاٹ لو۔ عارضی

علیحدگی ابتداء کے لئے ہے جب عارضی علیحدگی کے بعد وہ دوسری باتوں میں مصروف ہوں اور پھر تم ان کے پاس جا کے بیٹھ جاؤ اور ان کی بدکرداری میں فرق نہ آئے اور تمہیں یہ خطرہ محسوس ہو کہ تم ان کا اثر قبول کرنے لگے ہو تو پھر تم پر لازم ہے کہ ان سے کلیتہً تعلق کاٹ لو ورنہ تم بالکل ان جیسے ہو جاؤ گے۔ پس یہ اولیاء الشیطٰن کو پہچاننے کے طریقے قرآن کریم نے نہ صرف اس آیت میں جس کا میں نے حوالہ دیا ہے بلکہ اور آیات میں بھی خوب کھول کر بیان فرما دیئے ہیں۔

تو اپنی سوسائٹی کی حفاظت کریں، اپنی سوسائٹی سے اپنے بچوں کو بچائیں، اپنی بیویوں کو بچائیں، بیویاں اپنے خاوندوں پر نگاہ رکھیں اور ہماری سوسائٹیاں شیطان کے دوستوں کلیتہً کٹ جانی چاہئیں اور الگ ہو جانی چاہئیں۔ یہ ایک طریق ہے بچنے کا، مگر اور بھی بہت سے طریق اسی آیت نے ہمیں سکھا دیئے ہیں۔ رحمان، رب العالمین، اللہ ہے جب بھی ایک انسان خدا کی ربوبیت کو چھوڑ کر غیر اللہ کو رب سمجھتا ہے تو خدا تعالیٰ نے ربوبیت کی جتنی شرائط مقرر فرما رکھی ہیں ان سب کو نظر انداز کر دیتا ہے اور یہ سب سے بڑا محرک شیطان کی عبادت کا ربوبیت ہے۔ دنیا میں سب سے بڑے فتنے اقتصادی فتنے ہیں۔ بڑی بڑی قومیں جو دنیا میں ناانصافی کرتی اور دوسری قوموں پر ظلم کرتی ہیں، اپنی ذات میں بعض دفعہ بڑی مہذب ہوتی ہیں۔ وہ سیاست دان جو یہ ظالمانہ فیصلے کرتے ہیں کہ فلاں قوم کے اقتصادی وسائل کو کاٹ ڈالو اگر وہ تمہارے ہاتھ نہیں آتے، وہ اپنے روزمرہ کے معاملات میں بہت بااخلاق اور شریف النفس، ادب سے بات کرنے والے اور آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ دیکھو کتنی سلجھی ہوئی قومیں ہیں لیکن جہاں ربوبیت کا معاملہ آیا وہاں ان کا شیطان کو رب قبول کر لینا اتنا کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ کسی دیکھنے والے کے لئے شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ تمام دنیا کی بڑی بڑی قوموں پر نظر ڈالیں وہ کتنے دعوے کرتے ہیں اپنی

عظمتوں کے، اپنی تہذیب وتمدن کی فضیلت کے، اپنے اعلیٰ اخلاق کے مگر جہاں بھی ربوبیت کا مسئلہ ہوگا وہ شیطان کے سامنے سر جھکائیں گے، ہرگز کوڑی کی بھی پرواہ نہیں کریں گے کہ اللہ ان سے کیا تقاضے کر رہا ہے۔ اگر قوم کے رہنما ربوبیت یعنی رزق کے معاملے میں قوم کے مفاد پر کسی اور قوم کے مفاد کو اس لئے ترجیح دیں کہ اللہ یہ چاہتا ہے تو ان کو اس منصب پر رہنے ہی نہیں دیا جائے گا اس لئے کچھ ان کی بے اختیاری بھی ہے، ساری قوم شیطان کی عبادت کر رہی ہے اور یہ عام طور پر انسان کا حال ہو چکا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم دعویٰ میری عبادت کا کرو اور مجھ سے توقع رکھو کہ میں اس کے فوائد تمہیں پہنچاؤں اور تمہارا ہر فعل شیطان کی عبادت میں ڈھلا ہوا ہو اور تم مجسم اس کے بندے بن چکے ہو تو بیک وقت ایسی باتیں کیسے ممکن ہیں، دو حکومتوں کے سامنے بیک وقت سجدہ نہیں ہوسکتا یا اُس کو کرو گے یا اِس کو کرو گے۔

پس عبادت کا مضمون شرک سے تعلق رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ شرک سے توبہ کئے بغیر تم عباد اللہ کی صف میں داخل ہو نہیں سکتے اور تمہاری دعائیں قبول ہی نہیں ہوں گی۔ اب اس پہلو سے جب آپ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کو دوبارہ دہرا کے دیکھیں تو اور عظیم مضمون آپ کو دکھائی دینے لگیں گے۔ جب آپ کہتے ہیں اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تو اس میں ایک تو یہ عجز کا اظہار ہے، ہم عبادت تیری کرنا چاہتے ہیں کیونکہ جو صفات تو نے پیش فرمائی ہیں اگر کوئی یقین کے ساتھ ان کو سچا مان جائے تو اس کے سوا چارہ ہی نہیں رہا۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں کوئی احسان نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر کہ ہم نے فیصلہ کر لیا تیری عبادت کریں گے۔ یہ کہنے کا طریق ہے کہ تو نے اور چھوڑا کیا ہے جس کی عبادت کریں جب رب بھی تو، رحمان بھی تو، رحیم بھی تو اور مالک بھی تو، تو ہم پاگل ہو گئے ہیں جو کسی اور کی طرف جھکیں عبادت کے لئے۔ کوئی رہا ہی نہیں باقی۔

تو اِیَّاکَ میں یہ نفی جو غیر اللہ کی ہے، یہ لَا اِلٰہَ کی یہ کامل ہونی چاہئے۔ جتنی یہ کامل ہوگی ''ایاک نستعین'' کی دعا اتنی ہی مقبول ہوگی۔ اس مقصد کو سمجھے بغیر جب آپ دعائیں کرتے ہیں تو بسا اوقات سمجھ ہی نہیں آتی۔ دعائیں تو ہم بڑی کر رہے ہیں مگر قبول نہیں ہو رہیں۔ اے خدا! تمہاری ہم تیری عبادت کرنا چاہتے ہیں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تجھ سے مدد چاہتے ہیں، ادھر سے جواب ہی نہیں ملتا۔ ساری عمر کی عبادتیں اسی طرح غیر اللہ کے لئے وقف رہتی ہیں یا بے ثمر رہ جاتی ہیں، پھل نہیں لگتا اس لئے کہ عملی زندگی ان کی شیطان کی عبادت کر رہی ہوتی ہے۔ واقعاتی طور پر ان کا رزق غیر اللہ سے حاصل کیا جاتا ہے ان معنوں میں، ویسے تو سب رزق اللہ ہی سے ملتا ہے، کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکامات کی نافرمانی کرتے ہوئے رزق کے ان ذرائع سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے نزدیک جائز نہیں ہیں۔ جہاں بھی یہ بات داخل ہوگی یا جب بھی کسی آزمائش کے وقت انسان یہ فیصلہ کرے کہ ٹھیک ہے میری بلا سے، اللہ کو پسند ہو یا نہ ہو میرا رزق یہاں سے مل رہا ہے میں ضرور لوں گا، وہیں اس کا ربوبیت سے رشتہ کٹ گیا۔ پھر وہ جب نمازیں پڑھے گا تو اس کی نمازوں میں مزہ آ ہی نہیں سکتا۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ میں تو بڑی دفعہ کہتا ہوں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ اللہ مدد ہی نہیں کرتا میں کیا کروں۔ اس لئے مدد نہیں کرتا کہ تم اس راز کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی سچائی اس بات کو لازم کرتی ہے کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی دعا قبول ہو اور یہ جو مضمون ہے اتنا تفصیل کے ساتھ، اتنا گہرائی کے ساتھ روزمرہ صادق آتا ہے کہ آدمی اگر آنکھیں کھول کر دیکھے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

جس جس معاملے میں بھی انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت حقیقت میں کر رہا ہو خواہ ربوبیت کا معاملہ ہو خواہ رحمانیت کا، خواہ رحیمیت کا، خواہ مالکیت کا جہاں جہاں وہ سچا نکلے وہیں وہیں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی دعا جاگ اٹھتی ہے اور ان معاملوں میں ضرور خدا

تعالیٰ مدد فرماتا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کے جو بندے اس کے بندوں کی اعانت میں مصروف رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی اعانت اپنے اوپر فرض کر لیتا ہے۔ وہ خدا کے بندوں کی مدد کر رہے ہیں اللہ ان کی مدد کر رہا ہے خواہ پھر وہ مونہہ سے مانگیں نہ مانگیں یہ کام از خود جاری ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جس کا رحمانیت کے ساتھ ایک بہت گہرا اور عجیب تعلق ہے جس کے متعلق میں انشاء اللہ آئندہ کبھی بیان کروں گا۔

رحمانیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بن مانگے دینے والا اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی دعا بتاتی ہے کہ مانگو۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یہ بظاہر تضاد کیوں ہیں؟۔ ایک اس کا حل یہ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں کہ جہاں جہاں بھی آپ خدا تعالیٰ کی صفات سے تعلق جوڑتے ہیں عملی زندگی میں وہاں وہاں مانگے بغیر بھی وہ دیتا ہے وہاں وہ رحمان بن کر نکلتا ہے۔ اور جہاں آپ تعلق توڑ لیتے ہیں اس سے، وہاں بھی جب دیتا ہے اور دیتا ہے تو پھر بطور رحمان نہیں بطور رحیم دیتا ہے کیونکہ وہ مانگنے پر دیتا ہے۔ پس اس کے لئے وہ اعلیٰ درجے کی شرط نہیں ہے جو دوسرے معاملات میں خدا تعالیٰ نے عائد فرمادی ہے۔ مثلاً ایک مشرک، پتہ ہے کہ اس نے دوبارہ شرک کرنا ہے مصیبت میں پھنسا ہوا کہتا ہے میں تیری مدد مانگ رہا ہوں اس لئے مانگ رہا ہوں کہ اور مدد باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ تو کوئی وقت نہیں مانگنے کا، یہ تو کوئی طریقہ نہیں مگر پھر بھی مان لیتا ہے یہ اس کی رحیمیت سے تعلق رکھنے والا مضمون ہے یعنی مانگنے پر عطا کر دیتا ہے۔

اور رحمانیت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحریرات بھی اس مضمون پر خوب روشنی ڈال رہی ہیں کہ جو عباد الرحمن بن جائیں وہ سوتے ہیں تو اللہ ان کے لئے جاگتا ہے، وہ اپنے مفاد

سے بے خبر ہوتے ہیں اور اللہ ان سے باخبر ہوتا ہے ان کی حفاظت کرتا ہے، ان کو پتہ ہی نہیں کہ دشمن کیا سازش کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ مستعد ہو کر دشمن کی ہر سازش کو حملہ بننے سے پہلے پہلے نابود کر دیتا ہے۔ پس رحمانیت اور رحیمیت دونوں اپنے اپنے مقام پر جلوے دکھاتی ہیں۔ کہیں نہ مانگنا خدا تعالیٰ کے قریب تر کر دیتا ہے کہیں مانگنا خدا تعالیٰ کے قریب تر کر دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذات میں یہ دونوں جلوے بڑی عظیم، حیرت انگیز صفائی سے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے انشاء اللہ آئندہ کسی خطبے میں اس مضمون پر جو ایک علیحدہ مضمون ہے تفصیلی بعد میں روشنی ڈالوں گا۔

اس وقت میں اس مضمون کی طرف واپس آ رہا ہوں کہ شیطان کی عبادت کی پہچان اب کیا ہوگی۔ پہلی اپنی ربوبیت کی حفاظت کریں یعنی اپنی رزق کی تمنا، اپنی دولت کی تمنا، اپنی جائیدادوں کی تمنا یہ سارے ربوبیت سے تعلق رکھنے والے مضامین ہیں ان کی نگرانی کریں اور حفاظت کریں۔ جہاں جہاں آپ غیر اللہ سے اپنے آپ کو چھڑا کر اللہ کی ربوبیت کے سائے تلے آئیں گے وہاں لازماً آپ کو خدا تعالیٰ کی عبادت ایسی نصیب ہوگی کہ ہر عبادت کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا جلوہ آپ پر پہلے سے زیادہ روشن ہوگا۔ اور اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے نتیجے میں اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا مضمون ایک قانون قدرت کی طرح جاری ہوگا اس میں پھر کوئی روک پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن سب سے بڑا فتنہ ربوبیت ہی کا فتنہ ہے یعنی غیر اللہ کو رب بنانا۔

پس فرمایا ہم نے تمہیں کہا نہیں تھا، عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کو رب نہ بنانا، یہ مطلب ہے اس کی عبادت نہ کرو اور تم اس کو رب بنا بیٹھے ہو اور جب اس کو رب بنا بیٹھے ہو تو تمہارا سارا معاشرہ دکھوں سے بھر گیا ہے۔ یہ وہ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ہونے کا مضمون ہے۔ اب آپ دیکھیں جتنے بھی دنیا میں مسائل ہیں، جتنے مصیبتیں ہیں ان

میں سب سے بڑی وجہ رزق کے حصول کی پاگلوں والی تمنا جو پھر کوئی بھی اخلاقی قدر اپنی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتی۔ چور چوری کرتا ہے اور یہ رزق کی تمنا ہے اصل میں اس نے شیطان کو رب بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں کرنی، اس نے کہا میں نے تو رزق حاصل کرنا ہی ہے وہ جب کسی غیر کا دروازہ توڑتا ہے تو شیطان کے دروازے توڑ کر اس کے گھر میں داخل ہوتا ہے عملاً، یعنی جہاں تک اس کی روح کا تعلق ہوتا ہے وہ شیطان کو اپنا لیتا ہے اور یہ تمنا جتنی بڑھتی چلی جائے اتنا زیادہ سوسائٹی ظلم سے بھرتی چلی جاتی ہے۔ اس کا اگلا قدم ڈاکہ ہے، اگر گھر والے نے دیکھ لیا تو یہ خوف کہ مجھے پہچان نہ لیا ہو اس کے قتل پر اس کو آمادہ کر دیتا ہے۔ پھر یہ اور ظلم بڑھتا ہے تو گلیاں محفوظ نہیں۔ آتے جاتے یہاں تک بھی ہوتا ہے بعض معاشروں میں، امریکہ میں مثلاً واشنگٹن، نیویارک وغیرہ میں روزمرہ کی بات ہے کہ کسی عورت کے ہاتھ میں بہت قیمتی گھڑی ہے اس کی کلائی میں یا سونے کا کڑا پہنا ہوا ہے تو اس نے تیز دھار کا آلہ مارا اور ہاتھ بھی کٹ گیا اور کڑا کھل کے زمین پر گرا اور وہ اٹھا کے بھاگ گیا یعنی ایک کڑے کی خاطر یا ایک گھڑی کی خاطر ہاتھ کاٹنا ان کے لئے کچھ بھی نہیں، کوئی بُرائی بھی دکھائی نہیں دیتی تو عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ہوا کہ نہیں شیطان۔ جو معاشرے کو ایسے ایسے ظلموں سے بھر دے وہ تمہارا دوست کیسے ہو گیا اور جب یہ ظلم پھیلتے ہیں تو جگہ جگہ چوری، ڈاکہ اور اس کے نتیجے میں لوٹ مار، رستوں پہ کھڑے ہو کر ڈاکے ڈالنا اور پھر جتنے مظالم ہوتے ہیں یہ دکھائی دے رہے ہیں۔ معاشرہ چیخ رہا ہوتا ہے کہ یہ ظالم ہیں لیکن اسی معاشرے میں وہ شیطان کے دوست بس رہے ہیں جو ان شیطانی صفات کے نتیجے میں معاشرے کو دکھ عطا کر رہا ہے اور ہر شخص اگر اس مقام پر آ جائے جہاں اس کو حاصل ہو جائے کچھ، تو وہاں دھوکے میں کام لینے سے کوئی بھی تردد نہیں کرے گا خواہ وہ پیسے دے کر عدالتوں کو اپنے حق میں جھوٹے فیصلے لے یا بچے چرا کر فیصلے لے،

ہر ظلم ہی کی ایک قسم ہے جو شیطان کی دوستی کے مظاہر ہیں اور جب ساری سوسائٹی اولیاء الشیطان بن چکی ہو تو وہاں سے خیر کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

اور ربوبیت کا مضمون جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے سب سے اہم اور سب سے زیادہ وسیع طور پر انسانی زندگی پہ پھیلا پڑا ہے۔ چھوٹے، بڑے، امیر، غریب سارے ممالک اس میں ملوث ہیں۔ تمام انسان اس میں ملوث ہیں، اگر احمدی بھی ملوث ہو گئے تو یہ لوگ بچیں گے کیسے۔ یہ سوال ہے جو میں اٹھانا چاہتا ہوں۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے

پھر تو یہ حال ہے جو آپ پر صادق آئے گا۔ غالب کا یہ شعر کہ جن سے ہمیں توقع تھی کہ خستگی کی داد پائیں گے وہ تو ہم سے بھی زیادہ خستہ نکلے تو پھر تو دنیا اسے یہ کہے گی کہ تم سے ہم امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ تم ہمیں بچاؤ گے تم تو خود غیر اللہ کی عبادت کر رہے ہو۔ جب تمہارا اپنا رزق پاک صاف نہیں رہا تو بنی نوع انسان کے رزق کو کیسے پاک صاف کرو گے اور جب یہ حال ہوگا پھر اللہ آپ کا رب بنے گا کیسے؟۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ شیطان کو رب قبول کر لو اور اللہ رب بن جائے۔ اور اللہ رب نہ ہو تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا، پھر تو سارا قصہ ہی ختم ہے۔

تو اس دنیا کو بچانے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں تم وہ آخری خدا کی جماعت ہو اگر تم نہیں بچاؤ گے تو کوئی بچانے والا نہیں آئے گا۔ اتنی اہم ذمہ داریوں کو سمجھے بغیر آپ روزمرہ کی زندگی میں ایسے معاملات میں ملوث ہوں، کوئی دن نہیں ہوتا ڈاک میں جہاں ایسے خط نہ ملتے ہوں فلاں نے مجھے یہ کہا اتنے پیسے لے کے بھاگ گیا، فلاں اتنے پیسے کھا گیا، فلاں مکر ہی گیا ہے کہ میں نے لئے تھے پیسے۔ کسی نے کہا پیسے دو میں فلاں ملک پہنچاتا ہوں ہم نے ڈھونڈا تو دیکھا،

نظر آنا بند ہوا تو پتہ لگا کہ آپ اس ملک میں پہنچ گیا ہے، وہاں بیٹھا ہوا ہے۔اس قدر ظالمانہ کارروائیاں ہو رہی ہیں اور دعوے یہ ہوں کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ دعائیں مانگیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں بعض ایسے لوگ۔تو کس کی عبادت کر رہے ہیں مدد اس سے مانگیں پھر۔کیونکہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ نے شرط لگا دی ہے ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اس لئے مدد کے لئے تیرا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اگر عبادت کسی اور کی کر رہے ہیں تو آواز آئے گی کہ اے لعنتیو! دُور ہٹ جاؤ میرے دروازے سے۔جس کا دروازہ تمہارے دل کھٹکھٹا رہے ہیں وہی تمہارا معبود ہے اسی سے جا کے مدد مانگو۔تو دعاؤں کی قبولیت کا راز اس بات میں خدا تعالیٰ نے کھول دیا ہے اور کتنا کھل کر یہ مضمون سامنے آجاتا ہے آپ اپنے تعلقات کو اللہ تعالیٰ سے ٹھیک کریں، اپنی عبادت کا رخ اس طرف پھیریں اور یہ ہو نہیں سکتا جب تک شیطان کی عبادت سے کلیتہً اجتناب نہ کریں۔اب یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ سمجھ میں صاف آگیا ہے اور پھر اگر ہاتھ نہ پڑے پھر بھی یہی آیت آپ کے کام آئے گی مگر پھر اس میں ایک اور درد کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

ایک انسان ایک بددیانتی کے معاملے میں ملوث ہے، گندی عادتیں پڑ چکی ہیں اور کئی قسم کی اقتصادی بے راہ روی کا عادی ہو گیا ہے، وہ تعلق توڑنا چاہتا ہے ان باتوں سے، خدا کے حضور حاضر ہونا چاہتا ہے کہ اے خدا! جو پاک رزق تو عطا کرے وہی میرے لئے کافی ہے اور بس نہیں چلتا تو اس وقت یہی دعا اور طرح کام آتی ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اے خدا! ہم تیری عبادت کرنا چاہتے ہیں مگر ہو شیطان کی رہی ہے اس لئے ہم تجھ سے مدد مانگ رہے ہیں کچھ ایسا کر ہمارے لئے کہ ہمیں اپنی عبادت نصیب فرما۔ جب دل میں درد پیدا ہو اور یہ دعا اس مضمون کے ساتھ کی جائے تو پھر اس کا اثر آپ ضرور دیکھیں گے لازماً ظاہر ہوگا۔پس اللہ تعالیٰ

نے تو ہر توقع جو انسان سے رکھی ہے، اپنے بندوں سے، اس کو آسان کر کے دکھا دیا ہے کھول کھول کر سمجھا دیا ہے یہ طریق اختیار کرو، یہ طریق اختیار کرو تو پھر تم میری راہ پر قدم رکھنا مشکل نہیں پاؤ گے، وہ راہ آسان ہوتی چلی جائے گی۔

وَاَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ سیدھی بات یہ ہے میری عبادت کرو سیدھے رستے پر چل پڑو گے کوئی خطرہ نہیں، کوئی وہاں ڈاکہ نہیں، کوئی چور اچکا نہیں آسکتا اور وہ ترقی کی راہ وہ ہے اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ والی۔ ان لوگوں کی راہ ہے کہ اے خدا جن پر تو نے نعمتیں نازل فرمائیں۔ تو ہر انسان اپنی سربلندی کے لئے یا نعمتوں کے حصول کے لئے یا رزق میں برکت کے لئے دنیا میں جھک مارتا پھرتا ہے۔ ساری توجہات، ساری محنتیں ان چیزوں کے لئے وقف کر رکھی ہیں اور جو آسان سیدھا رستہ خدا نے سمجھا دیا ہے اس پر چل کے دیکھتا نہیں اس وجہ سے کہ یقین کی کمی ہے اور اگر یقین کی کمی ہے تو پھر جس پر یقین زیادہ ہے اس کی عبادت ہوگی جس پر یقین کم ہے اس کی نہیں ہوگی تو یہ شرک کی پہچان کا پیمانہ بن گیا اور اللہ تعالیٰ پر کس حد تک یقین ہے، یہ پہچانا ہو تو اپنے روزمرہ کے ردعمل سے آپ لازماً پہچان سکتے ہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی رہے۔

آگے رحمانیت کا مضمون ہے جب بھی آپ بنی نوع انسان کو یا ان میں سے بڑے لوگوں کو رحمٰن سمجھیں تو جب کوئی مشکل پڑے ان کی چوکھٹ پہ جا کے رحمان، رحمان کی آوازیں دیتے ہیں اور ان سے تعلق بعض دفعہ اس طرح بھی رکھتے ہیں جیسے رحمانیت کا اپنے بندوں سے تعلق ہے یا بندوں کا رحمان سے ہے۔ بن مانگے دینے کا مضمون بھی یہاں بالکل بعینہٖ صادق آتا ہے۔ بہت سے انسان بڑے لوگوں سے اس لئے تعلق نہیں رکھتے کہ ہم ان سے مانگیں گے بلکہ وہ تعلق ہی میں بن مانگے کے فائدے پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ تعلق ایسے ہیں جن کے نتیجے میں فائدہ

پہنچنا ہی پہنچنا ہے۔ شاہ کا مصاحب بنا ہوا اِتراتا پھرتا ہو بڑے لوگوں سے واسطے ہوں، بڑی چوکھٹوں پر جاتا ہو تو اردگرد کے فوائد اسے خود بخود ملتے ہیں، ضروری نہیں کہ اس سے مانگے۔ کوئی آج کل یہ نظر رکھتا ہو کہ نواز شریف صاحب کے محل سے کون نکلتا ہے اور کون جاتا ہے یا اس سے پہلے بھٹو صاحب کے محل سے کون نکلا کرتا تھا اور کون جاتا تھا یہ باتیں اتنی ہی کافی ہیں اس کے لئے۔ اور ایسے لوگوں کی چٹھیاں پھر مچلکوں کی طرح چلتی ہیں۔

اور ایک دفعہ ایک تحقیق کے نتیجے میں واقعتہً ایسی باتیں سامنے آئیں کہ جن لوگوں کو حکومت کے قریب سمجھا گیا وہ یہ بھی نہیں کہتے تھے کہ فلاں نے ہمیں یہ کہا ہے اور فلاں طرف سے آرڈر آیا ہے وہ صرف دو حرف ڈال دیتے تھے کہ یہ کام کرنا ہے اور وہ کام ہو جاتا تھا، بڑے بڑے افسروں کی مجال نہیں تھی کہ یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں کا دوست ہے یا آنا جانا رکھتا ہے وہاں اس کے حکم کا انکار کرسکیں۔ تو رحمان یہ بن جاتے ہیں ان معنوں میں کہ بن مانگے دینے والے بن گئے ہیں ان کے کہنے کی ضرورت نہیں اور اگر کہہ کے مانگیں تو اکثر انکار ہی ہو جائیں گے۔ تو انسان رحمان کسی اور کو سمجھے اور اللہ سے تعلق رکھے یعنی بظاہر، اور کہے اے رحمان! تیری صفت رحمانیت نے ایسا میرے دل کو کھینچا ہے کہ اب میں یہ فیصلہ کرتا ہوں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

تو جو ربوبیت کی چمک تھی، ربوبیت کی کشش تھی وہ اپنی جگہ کام کر رہی ہے۔ ایک رحمانیت کی کشش ہے وہ اپنی جگہ کام کرتی ہے پھر گناہوں سے بخشش کے لئے رحمانیت کام آتی ہے جہاں کوئی شخص پھنسا وہاں اس کا رحمان بدل جاتا ہے۔ اللہ کی طرف دوڑنے کے بجائے پہلا خیال اپنے دوستوں کا آتا ہے، اپنے تعلق والوں کا آتا ہے، افسر متعلقہ کا آتا ہے، اس سے رحم کی بھیک مانگوں اور جو بھی بخشش ہے اس کے

بغیر ممکن نہیں گویا اس کی رحمانیت ہی ہے جو ڈھانپ لے تو میں بخشا جاؤں گا نہ ڈھانپے تو نہیں بخشا جاؤں گا۔ واقعتہً یہ توکّل کس پر ہے یہ ہے اصل بات۔ اگر توکل غیر اللہ پر ہو تو اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا بالکل بے معنی ہوگا۔ مرغی کے متعلق آتا ہے کہ انڈے کہیں دے، بیٹھیں کہیں اور کرے۔ پس دین کو تو آپ نے بیٹوں سے بھر دیا ہو اور انڈے دوسرے گھروں میں دیتے ہوں اور جب ضرورت پڑے تو بیٹوں کے مقام پر جاکہ انڈے مانگیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ نے اگر رحمان سے تعلق رکھنا ہے تو پاکیزگی کا، رحم کا تعلق، اس طرح رکھیں کہ اس کی رحمانیت کے مقابل پر کسی کی رحمانیت کو خاطر میں نہ لائیں۔ ہر مشکل، ہر مصیبت کے وقت پہلا خیال دعا کا ہو اور اس طرح بھی انسان اپنی شناخت کرسکتا ہے۔ اگر پہلا خیال دوسروں کا ہو اور ساتھ دعا بھی مانگے یا کہے کہ آپ میرا یہ کام کروادیں اور دعا بھی کریں تو یہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ اگرچہ یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اس راہ کے خطرات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہوئے ہمیں سمجھایا ہے۔

فرمایا ہے توکّل اللہ پر کرنا، اس کی رحمانیت پر توکّل کرنا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کے ذرائع جو خدا تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں ان سے آپ مونہہ پھیر لیں اس لئے وہ ذرائع اختیار کرنے ہیں اور اس کے باوجود رحمان خدا کو سمجھنا ہے یا رب خدا کو سمجھنا ہے۔ جب تک آپ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکیں گے آپ کے تعلقات اپنے رب سے یا اپنے رحمان خدا سے درست ہو ہی نہیں سکتے۔ سوال یہ ہے کہ وہ تعلقات آپ کی نظر میں ادنیٰ ہیں جو دنیا کے ہیں یا اللہ سے جو رحم کی توقع ہے وہ ادنیٰ ہے۔ اور یہ باریک فیصلہ ہر انسان اپنی ذات کے اندر کرسکتا ہے، کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر کہیں دنیا کے اسباب انسان اس لئے اختیار کرتا ہے کہ میرے اللہ کا حکم ہے اور مسلسل یقین رکھتا ہے کہ ان اسباب کو پھل لگیں گے ہی نہیں جب تک خدا نہیں چاہے گا تو یہ

اسباب پھر شرک نہیں ہیں، یہ عبادت بن جاتے ہیں اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں یہ داخل ہو جاتے ہیں پھر۔

پس اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا یہ مضمون بنے گا کہ اے خدا ہم مانگتے ہی نہیں بلکہ تو نے جو کچھ ہمیں مہیا کیا ہے سب کچھ اس راہ میں صرف کر رہے ہیں اب باقی ہمارے پاس کیا رہا ہے۔ لیکن جو کچھ تو نے ذرائع اور اسباب ہمیں مہیا فرمائے تھے وہ تیری مرضی کے بغیر کام کر ہی نہیں سکتے اس لئے اپنا سب کچھ لے کے تیرے دربار میں حاضر ہو گئے ہیں۔ مانگتے بھی تجھ سے ہیں اور جیسے تو نے کہا وہ سب کر دیکھا ہے۔ اب نتیجہ نکالنا تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہم تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں اور مدد چاہنے میں دعاؤں کے رنگ سیکھنے کا مضمون بھی داخل ہے اس کو وہاں تک پھیلائیں تو پھر اور بھی زیادہ آپ کی دعا میں وسعت پیدا ہو جائے گی اور گہرائی پیدا ہو جائے گی۔

یہ جو دعا کے مختلف طریق اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے حوالے سے میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اس میں یہ بات بھی داخل اگر آپ کر لیں کہ اے خدا ہم تیری عبادت کرتے ہیں واقعۃً تعلق توڑ بیٹھے ہیں دوسروں سے جو تو نے کہا یہ کیا کروا ایسے موقع پر وہ کر رہے ہیں ہم اور اس کے باوجود ہم اپنی طاقت سے کچھ بھی حاصل نہیں کرتے کیونکہ ہماری دعاؤں میں بھی نہیں جانتے کہ وہ سوز اور وہ قوت ہے دل کی گہرائی سے اٹھنے والی دعاؤں کی قوت جو مقبولیت کا نشان بن جایا کرتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ وہ قوت ان دعاؤں کو حاصل ہے کہ نہیں، ہم نہیں جانتے کہ ہمارے ذرائع کافی ہیں کہ نہیں۔ اب ذرائع ناکافی ہوں تو پھر انسان غیر اللہ کی طرف بھی دوڑ سکتا ہے۔ غیر اللہ کی طرف دوڑنے کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ پورے ذرائع کام نہیں کرتے چلو رشوت دے کر کچھ ذرائع کو آسان کر لیں۔

تو یہ دعا ان معنوں میں پھر ایک عظیم دعا بنے گی اور کار آمد ہوگی کہ یہ فیصلہ کریں کہ جو کچھ ہماری طاقت میں تھا اس لئے کیا تھا کہ تو نے فرمایا تھا۔ اس لئے تو نہیں کیا کہ ہم ان چیزوں پر سہارا کر رہے ہیں اور ثبوت یہ ہے اِیَّاکَ یعنی صرف تیرا۔ صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ بعض ناجائز ذرائع ہمارے رستے میں آئے تھے مہیا ہوئے تھے ہمیں لوگوں نے سمجھایا کہ اگر چاہو تو یہ کام کیا جا سکتا ہے مگر ہم رک گئے، ہم نے نہیں کیا تا کہ جب تیرے حضور یہ دعا لے کر حاضر ہوں کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ تو اس میں کسی قسم کا کوئی رخنہ نہ ہو، کوئی کھوٹ شامل نہ ہو۔ اس لئے اب سب کچھ ہم تیرے حضور حاضر کر رہے ہیں یہ دعا نامقبول ہو ہی نہیں سکتی، ناممکن ہے۔ اور کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بندوں نے اس کو آزما کے دیکھا ہے۔

جب ان شرطوں کے ساتھ آپ خدا کے حضور حاضر ہوں تو ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دعائیں مقبول نہ ہوں۔ اگر کہیں مقبول نہیں ہورہیں یا لگتا ہے کہ مقبول نہیں ہورہیں تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس کے دو ایسے پہلو ہیں جو پیش نظر رکھنا۔ ایک ہے وفا اور صبر کا پہلو۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں یہ بھی مضمون ہے کہ اے اللہ! ہم تیری عبادت کرتے ہیں وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں، یہ چند دن کا قصہ نہیں رہا، یہ چند مہینوں کی بات نہیں یہ سال دو سال کا ماجرا نہیں ہے ساری زندگی ہم یہی کریں گے تو پھر مایوسی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، پھر تو بال بڑھاپے سے بھڑک بھی اٹھیں تب بھی انسان یہی کہے گا کہ تیری دعا سے میں مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہوں تو بعض دفعہ دعا میں ایک صبر کا مضمون داخل ہوتا ہے جو اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں شامل ہے۔

پس اس لئے یہ کہنا کہ دعا مقبول نہیں ہوئی یہ درست نہیں، یہ دعا کی شرطوں کی آزمائش کا ایک طریق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم جو کہتے ہو کہ سب کچھ مجھے دے

بیٹھے ہو، سب کچھ میرے سپرد کر دیا ہے، ساری زندگی کی وفائیں میرے قدموں میں ڈال دیں تو چلو دیکھتے ہیں کہ واقعتہً سچے بھی ہو کہ نہیں اور جب پھر انسان وفا کا معاملہ کرے تو بعض دفعہ ساری عمر کی مانگی ہوئی دعائیں بھی خدا ایسے لمحات میں قبول کر لیتا ہے جن لمحات میں دوسرے خدا کو چھوڑ کر جا رہے ہوتے ہیں اور ایسا شخص جو وفا کے ساتھ دعاؤں پر قائم رہتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے خدا کی گود میں آ جاتا ہے تو ایک یہ بھی وجہ ہے کہ بسا اوقات انسان دھوکہ کھا جاتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہو رہی۔

ایک اور بھی وجہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اور وجوہات میں سے بیان فرمائی ہے کہ بعض دفعہ جو انسان مانگ رہا ہے وہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوتا اور خدا تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں کرتا بلکہ اس سے بہتر دے دیتا ہے اور بعض دفعہ جو مانگ رہا ہے اس کے لئے حالات کی تیاری قانون قدرت کے مطابق کچھ وقت چاہتی ہے اور وہ آناً فاناً تیاری ہو نہیں سکتی کیونکہ قانون قدرت کے خلاف ہے تو اس کے لئے بھی صبر کی بھی ضرورت ہے اور توکّل کی ضرورت ہے۔ فرمایا جہاں تم بظاہر نامقبول دعائیں بھی دیکھتے ہو یاد رکھنا اگر اس پر تم صبر سے کام لو اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ کا پیچھا نہ چھوڑو، اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کی آواز بلند کرنی بند نہ کر دو تو جو تم مانگ رہے تھے اس سے بہت زیادہ دے گا، کچھ اس لئے کہ اس دعا نے جس رنگ میں یہ مانگی گئی ہے وہ قبول تو ہونا ہی ہونا تھا کچھ اس لئے کہ تمہیں جو وقتی طور پر ٹھوکر سی لگی صدمہ سا آیا کہ جو میں نے مانگا تھا وہ تو نہیں ملا۔ تو بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اس طرح اشک شوئی کرتا ہے جو دیتا ہے اس سے زیادہ دیتا ہے جو مانگا گیا تھا اور بظاہر وہ قبول نہیں ہوا تو اپنی طرف سے جرمانہ ڈال دیتا ہے، خدا تعالیٰ کا تو کوئی جرمانہ نہیں مگر بندے بعض دفعہ اپنے پیار کے اظہار میں کہتے ہیں میں نے تمہیں کہا تھا نا میں چیز دوں گا، میں بھول گیا اب یہ میری طرف سے ایک اور ہے یہ جرمانہ ہے میرا۔ تو اللہ تعالیٰ کی عجیب شان ہے جب

وہ جھکتا ہے تو اتنا جھک جاتا ہے ذلیل ترین بندوں کے مقام تک پہنچ کر ان کو عطا کرتا ہے اور اپنے اوپر پابندیاں ڈال دیتا ہے کہ او ہو تمہیں تکلیف پہنچی اب میں تمہیں بڑھا کردوں گا تا کہ تمہارے سارے صدمے دور ہو جائیں، ساری کوفت ختم ہو جائے۔

یہ عبادت کا مضمون ہے جس کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں مگر سر دست میں یہ بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ عباد اللہ بننا لازم ہے ہم پر۔ اگر ہم اللہ کے بندے بن جائیں تو خدا کی ساری کائنات ہماری ہو جائے گی۔ لیکن اللہ کے بندے اس لئے نہیں کہ کائنات ہماری ہو جائے گی۔ یہ کہ ہماری ساری کائنات اس کی ہو جائے اس روح کے ساتھ عبادت کریں، اس روح کے ساتھ خدا سے عبادت مانگیں تو دیکھیں دنیا کی تقدیر کتنی جلدی جلدی بدلتی ہے۔ کل عالم میں انقلاب برپا ہو جائے گا جس کی آپ تمنا لے کے اٹھے ہیں آج اور وہ آپ کے وقت کے اندازے، آپ کے اندازوں کے پیمانے بدل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور قرآن کریم کی آیات سے سچی راہنمائی حاصل کر کے اس راہنمائی پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین

(الفضل انٹرنیشنل 9 مئی 1997ء)

مسند خلافت پر متمکن ہونے سے قبل حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے ربوہ کے جلسہ سالانہ 1968ء کے موقع پر ''فلسفہ دُعا'' کے عنوان پر ایک دلربا اور دلوں کی تاروں کو ہلا دینے والی معرکۃ الاراء تقریر فرمائی۔ جس میں عبادالرحمٰن کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت قبولیت دُعا بیان فرمائی۔ اس لیکچر میں حضورؒ نے عباد کے تین درجے بیان فرمائے اور تیسرے درجے کو عبادالرحمٰن قرار دے کر عبد کامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو قرار دیا آپ تیسرے درجے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اب ہم تیسرے درجے کے عباد کے حالات پر نظر کرتے ہیں جو حقیقی معنوں

میں عباد اللہ ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خدائے قریب ومجیب کیسے کیسے پیار کے ساتھ ان کے قریب ہوا اور کس کس شفقت اور رحمت اور کریمانہ نوازشات کے ساتھ ان کی تضرعات کو سنا اور کس طرح اپنے آسمان سے خود ان کی دنیا میں اُتر آیا اور انہی کے قلوب اور سینوں کو اپنا عرش بنالیا۔ یہی وہ حقیقی عباد اللہ ہیں جن کے حق میں قبولیت دعا کے تمام وعدے اپنی تمام شان کے ساتھ پورے ہوئے اور یہی وہ حقیقی بندگان خدا ہیں جنہیں ان کا رب بڑے پیار کے ساتھ کبھی تو عبادالرحمان کے محبت بھرے القاب کے ساتھ یاد فرماتا ہے اور کبھی عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِينَ کہہ کر ان کا ذکر کرتا ہے۔ پھر یہی وہ حقیقی عباد ہیں جن کی وفا اور بندگی پر ناز کرتے ہوئے ان کا رب تمام طاغوتی طاقتوں کے سرغنے کو یہ پوری شوکت کے ساتھ چیلنج دیتا ہے:

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: 65-66) اور ہم نے کہا کہ اے شیطان جا ان میں سے جس پر تیرا بس چلے اسے اپنی آواز سے فریب دے کر اپنی طرف بُلا اور اپنے سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھا لا اور ان کے مالوں اور اولادوں میں ان کا حصہ دار بن اور ان سے جھوٹے وعدے کر اور پھر اپنی کوششوں کا نتیجہ دیکھ۔ شیطان جو بھی وعدے کرتا ہے فریب ہی کی نیت سے کرتا ہے لیکن سن کہ جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا ہرگز تسلّط نہیں ہوسکتا! اور اے میرے بندے محمدؐ! تیرا رب کارسازی میں تیرے لئے کافی ہے۔

یہ ہے وہ خوش بخت عبادالرحمٰن کا گروہ جو قبولیت دعا کے وعدے کا حقیقی مصداق ہے لیکن یہ گمان کر لینا بھی خطا ہے کہ محض خشک صالحیت کا جامہ پہن لینا ہی

قبولیت دعا کے لئے کافی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تو عشق و محبت کا ایک زندہ اور پیچ در پیچ تعلق ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ تو کُـــــــنْ کے مقام پر کھڑا ہو جائے اور معبود فَیَکُوْنُ کے انتظام میں مصروف رہے۔ یہ تو دو طرفہ ناز و نیاز کا تعلق ہے اور عجیب در عجیب افسانہ ہائے ہجر و وصل اور مناجات اور زاری اور قدم تھامنا اور قدم چومنا، کبھی ماننا اور کبھی منوانا۔ یہ تمام واردات فلسفہ دعا کی کنہ میں شامل ہیں۔

قبولیت دعا کے آداب کا مضمون بہت ہی وسیع ہے اور اس کا احاطہ کرنا ایک ناقص العلم انسان کے بس کا روگ نہیں بھلا کون ہے جو ان اداؤں کا احاطہ کر سکے جو معشوق کو پسند آتی ہیں اور عشاق کی قسمت سنوارنے کا موجب بنا کرتی ہیں۔ پس آج کی مجلس میں محض نمونۃً جستہ جستہ بعض بنیادی آداب دعا کا ذکر کروں گا جو دعا کی قبولیت میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک یقین کامل ہے۔ جب تک دعا گو بندہ اپنے رب کی لامتناہی قوتوں پر کامل ایمان نہ رکھتا ہو اور یہ یقین نہ رکھتا ہو کہ میرا رب ضرور میرے حال پر رحم فرمائے گا دعا میں وہ قوت اور جان پیدا نہیں ہوتی جو تقدیر الٰہی کی محرک بنا کرتی ہے چنانچہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

''جب تو دعا کے لئے کھڑا ہو تو تجھے لازم ہے کہ یہ یقین رکھے کہ تیرا خدا ہر ایک چیز پر قادر ہے تب تیری دعا منظور ہوگی اور تو خدا کی قدرت کے عجائبات دیکھے گا جو ہم نے دیکھے ہیں اور ہماری گواہی رؤیت سے ہے نہ بطور قصہ کے۔۔۔۔۔۔ تیرا خدا وہ ہے جس نے بے شمار ستاروں کو بغیر ستون کے لٹکا دیا اور جس نے زمین و آسمان کو محض عدم سے پیدا کیا۔ تو کیا تو اس پر بدظنی رکھتا ہے کہ وہ تیرے کام میں عاجز آجائے گا؟ بلکہ تیری ہی بدظنی تجھے محروم رکھے گی۔ ہمارے خدا میں بے شمار عجائبات ہیں۔ مگر وہی دیکھتے ہیں جو صدق اور وفا سے اس کے ہو گئے ہیں۔''

(کشتیٔ نوح روحانی خزائن جلد19 ص21)

اس غیر متزلزل یقین اور اپنے رب پر حسن ظن کی ایک نہایت پیاری مثال قرآن کریم میں حضرت زکریاؑ کی دعا کی صورت میں بیان کی گئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ (مریم:3-5) یعنی اے میرے بندے! ہم تیرے رب کی رحمت کا ذکر چھیڑ رہے ہیں جس کا ایک بندہ زکریاؑ بھی تھا وہ وقت عجیب سوز و گداز کا حامل تھا جب اس نے راز کے پردوں میں اپنے رب کو آواز خفی سے پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے رب! میں تو اس حد تک عمر رسیدہ ہو چکا ہوں کہ میری ہڈیاں بھی کمزور پڑ گئیں اور بڑھاپے کی سفیدی سے میرا سر آگ کے شعلوں کی طرح بھڑک اٹھا ہے لیکن باوجود اس کے اے آقا! میرا یقین متزلزل نہیں کیونکہ آج تک میں تیرے حضور میں گریہ زاری کے نتیجے میں شقی اور محروم نہیں رہا۔

یہ نمونہ ہے ان مقبول دعاؤں میں سے ایک دعا کا جو غیر متزلزل یقین اور حسن ظن کے ساتھ عباد الرحمٰن اپنے رب کے حضور کرتے ہیں پھر بتاؤ بھلا کیسے وہ کریم ذات انکار کرے؟ ایک بوڑھا جس کی ہڈیوں میں دم خم باقی نہیں اور سر کا ایک ایک بال سفید ہو چکا ہے دعا یہ مانگ رہا ہے اور خدا معلوم کتنے لمبے عرصے سے مانگ رہا ہے کہ اے میرے رب! مجھے ایک صالح بیٹا عطا فرما جو تیری رضا کی راہوں پر چلنے والا اور برگزیدہ ہو۔ عمر کی ہر سانس کے ساتھ ظاہری اسباب کے لحاظ سے قبولیت دعا کا امکان کم تر ہوتا جا رہا ہے اور بیٹے کی پیدائش ایک امر موہوم بن رہی ہے۔ ہڈیوں کی کمزوری بڑھ رہی ہے اور سر کی سفیدی گاڑھی ہو کر آگ کے شعلوں کی طرح بھڑک اٹھی ہے لیکن یقین کامل پر آنچ تک نہیں آئی اور اللہ اللہ پھر مانگا بھی کس ناز اور ادا کے

ساتھ ہے کس زعم کے ساتھ ہے کہ آقا بھلا مجھے کیوں یہ وہم آنے لگا کہ میرا بڑھاپا تیری قدرت کاملہ کے اختیار سے بڑھ جائے گا۔ میں تو آج تک تیرے در سے محروم نہیں پھرا اور کبھی بھی میرے نامے میں یہ بدبختی نہیں لکھی گئی کہ تیری ذات کریم سے مانگ کر خالی ہاتھ لوٹ آؤں اب بتائیے کون ہے جو اس دعا کو رد کر سکے؟ کیا وہ خدا جو سب عطا کرنے والوں سے بڑھ کر عطا کرنے والا ہے؟ کیا وہ خدا جو خود کہتا ہے میرے بندو! مجھ سے مانگو میں عطا کروں گا؟ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ یہاں تو مانگنے والا ایک برگزیدہ نبی تھا کوئی عام بوڑھا نہ تھا۔ خدا کی قسم آنحضور ﷺ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ میرا رب اتنا فیاض ہے اور ایسی حیا والا ہے کہ جب کوئی بھی عمر رسیدہ بندہ اس سے مانگتا ہے تو بسا اوقات اس کے بالوں کی سفیدی سے حیا کھا کر وہ اس کی مراد کو پوری کر دیتا ہے۔

آداب دعا میں سے ایک اہم ادب صبر ہے اور وہ انسان جو بے صبر اور چھوٹے ظرف کا ہو اور تھوڑی سی آزمائش کو بھی برداشت نہ کر سکے وہ اس عالی دربار تک رسائی نہیں پاتا۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”دعا اور اس کی قبولیت کے زمانہ کے درمیانی اوقات میں بسا اوقات ابتلاء پر ابتلاء آتے ہیں اور ایسے ایسے ابتلاء بھی آ جاتے ہیں جو کمر توڑ دیتے ہیں مگر مستقل مزاج سعید الفطرت ان ابتلاؤں اور مشکلات میں بھی اپنے رب کی عنایتوں کی خوشبو سونگھتا ہے اور فراست کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کے بعد نصرت آتی ہے۔“

(ملفوظات جلد 2 ص 707)

امت محمدیہ ﷺ میں سے ایک بزرگ کا قصہ اس ضمن میں بیان کے لائق ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بزرگ ہر شب تہجد کے وقت ایک خاص دعا مانگا کرتے تھے لیکن اسی وقت انہیں اللہ جل شانہ کی طرف سے یہ جواب ملتا تھا کہ ہم نے یہ تیری دعا رد کر دی ہے۔ ایک دفعہ ان کا ایک ارادت مند صحبت صالحہ کا فیض پانے کے لئے ان

کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کرنے لگا چنانچہ جب بعد از دعا ان کو یہ الہام ہوا کہ ہم نے یہ دعا رد کر دی ہے تو مشیت الٰہی سے اس مرید کے کانوں میں بھی یہ آواز پڑی۔ دوسری شب پھر یہی ماجرا گزرا اور تیسری شب پھر یہی ماجرا گزرا۔ اس پر وہ خام کار ارادت مند مزید صبر نہ کر سکا اور عرض کیا یا حضرت تین راتوں سے میں یہ ماجرا دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اسے رد فرما دیتا ہے پھر میں نہیں سمجھ سکا کہ کس برتے پر آپ بار بار وہی دعا کرتے ہیں۔ اس بزرگ کی طبیعت پر یہ سوال ناگوار گزرا اور بڑے جوش سے فرمایا کہ اے کم ظرف اور بے صبرے! تو صرف تین دن میں گھبرا گیا، اللہ کی قسم! میں مسلسل بارہ سال سے بلا ناغہ یہ دعا کر رہا ہوں اور مسلسل بارہ سال سے میرے کانوں نے یہ آواز سنی ہے کہ ہم اس دعا کو قبول نہیں کرتے، ہم اس دعا کو قبول نہیں کرتے، پھر بھی میرا یہ مقام نہیں کہ دعا ترک کروں۔ وہ مالک الملک ہے اور میں ایک حقیر اور عاجز بندہ۔ میرا کام یہ ہے کہ مانگتا چلا جاؤں اور اس کی شان یہ ہے کہ چاہے تو قبول فرمائے چاہے تو رد کرے۔ یہ الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ غیب کے پردوں کو چیرتی ہوئی ایک پُرشوکت آواز آئی۔ اے میرے بندے! میں نے تیری یہ دعا بھی قبول کر لی ہے اور اس بارہ سال کے عرصہ میں جتنی دعائیں تو نے مجھ سے مانگیں تھیں وہ ساری کی ساری آج قبول کرتا ہوں۔

وہ عبادالرحمٰن جو بسا اوقات اپنے رب کو منوا کر ہی رہتے ہیں وہ صبر کے ساتھ اپنی دعاؤں میں عاجزی اور فروتنی کو بھی کمال تک پہنچا دیتے ہیں چنانچہ اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”پس دعاؤں سے کام لینا چاہئے اور خدا تعالیٰ کے حضور استغفار کرنا چاہئے کیونکہ خدا تعالیٰ غنی بے نیاز ہے۔ اس پر کسی کی حکومت نہیں ہے۔ ایک شخص اگر عاجزی اور فروتنی سے اس کے حضور نہیں آتا تو وہ اس کی کیا پرواہ کر سکتا ہے......

خدا تعالیٰ سے اڑ کر مانگتا ہے اور اپنے ایمان کو مشروط کرنا بڑی بھاری غلطی ہے اور ٹھوکر کا موجب ہے۔

(ملفوظات جلد 2 ص296)

قرآن کریم نے انبیاء گزشتہ کی جو دعائیں بطور نمونہ زندہ رکھی ہیں ان سب میں عاجزی اور فروتنی کا عنصر بہت نمایاں نظر آتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعض چھوٹی چھوٹی دعائیں اس پہلو سے ایک عجیب شان رکھتی ہیں۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کتنے سادہ مگر عمیق الاثر الفاظ میں اپنی عاجزی اور بے مائیگی کا اظہار کرتے ہیں رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ (القصص:25) کہ اے میرے رب! جو چیز بھی تو میری جھولی میں بطور خیر ڈال دے میں اسی کا محتاج وفقیر ہوں۔ پھر مخالف قوتوں کے مقابل پر اپنی ناطاقتی اور بے مائیگی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ○(المائدۃ:26) کہ اے میرے رب! مجھے تو اپنی تنہا جان اور ایک بھائی کے سوا کسی پر کوئی اختیار نہیں۔ پس تو ہی ہے جو ہمارے اور فاسقوں کے درمیان تفریق کر کے دکھا۔

سوز و گداز کا ہونا بھی ضروری ہے اور آنسوؤں اور دعا کا ایک ایسا فطری اور ازلی جوڑ ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا اِنَّمَاۤ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَحُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (یوسف :87) کا دل گداز فقرہ ایسی پُر درد حقیقت کی طرف اشارے کر رہا ہے اور بچے کی چیخ و پکار پر ماں کے سینے میں جذبات رحم کا متلاطم ہو جانا بھی اسی کی سچائی کی ایک دلیل ہے۔ اسی طرح عبد اور معبود کے مابین بھی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی دعا الفت و جذب کی نہایت قوی لہریں دوڑا دیتی ہے جو قبولیت دعا کا موجب بنتی ہے۔ حضور علیہ السلام اس عجیب کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ خیال مت کرو۔ کہ ہم بھی ہر روز دعا کرتے ہیں۔ اور تمام نماز دعا ہی ہے

جو ہم پڑھتے ہیں کیونکہ وہ دعا جو معرفت کے بعد اور فضل کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے وہ اور رنگ اور کیفیت رکھتی ہے۔ وہ فنا کرنے والی چیز ہے۔ وہ گداز کرنے والی آگ ہے۔ وہ رحمت کو کھینچنے والی ایک مقناطیسی کشش ہے۔ وہ موت ہے پر آخر کو زندہ کرتی ہے۔ وہ ایک تندسیل ہے پر آخر کشتی بن جاتی ہے۔ ہر ایک بگڑی ہوئی بات اس سے بن جاتی ہے اور ہر ایک زہر آخر اس سے تریاق ہو جاتا ہے۔

مبارک وہ قیدی جو دعا کرتے ہیں تھکتے نہیں کیونکہ ایک دن رہائی پائیں گے۔ مبارک وہ اندھے جو دعاؤں میں سست نہیں ہوتے کیوں کہ ایک دن دیکھنے لگیں گے۔ مبارک وہ جو قبروں میں پڑے ہوئے دعاؤں کے ساتھ خدا کی مدد چاہتے ہیں کیونکہ ایک دن قبروں سے باہر نکالے جائیں گے۔

مبارک تم جبکہ دعا کرنے میں کبھی ماندہ نہیں ہوتے اور تمہاری روح دعا کے لئے پگھلتی اور تمہاری آنکھ آنسو بہاتی اور تمہارے سینہ میں ایک آگ پیدا کر دیتی ہے اور تمہیں تنہائی کا ذوق اٹھانے کے لئے اندھیری کوٹھڑیوں اور سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہے اور تمہیں بے تاب اور دیوانہ اور از خود رفتہ بنا دیتی ہے کیونکہ آخر تم پر فضل کیا جاوے گا۔ وہ خدا جس کی طرف ہم بلاتے ہیں نہایت کریم و رحیم۔ حیا والا۔ صادق وفادار۔ عاجزوں پر رحم کرنے والا ہے۔ پس تم بھی وفادار بن جاؤ اور پورے صدق اور وفا سے دعا کرو۔"

(لیکچر سیالکوٹ۔ روحانی خزائن جلد 20 ص222-223)

عبادالرحمٰن کا یہ گروہ جس کے سر پر ہمارے آقا و مولیٰ حضرت رسول اکرم ﷺ کھڑے ہیں رحمانیت اور ربوبیت کی صفات میں اپنے رب رحمٰن سے ایسی مشابہت اختیار کر لیتا ہے کہ ظلی طور پر بنی انسان کے حق میں انہیں ربوبیت اور رحمانیت کی چادر پہنائی جاتی ہے۔ رب رحمٰن کے فیوض کا دودھ انہی کی چیخوں اور آہ و پکار کے

اُترتا ہے اور انہی کے واسطے سے اہل طلب میں بٹتا ہے اگر ان کی دعائیں نہ ہوتیں تو بلاشبہ یہ دنیا فیوض روحانی سے عاری رہ جاتی اور بنی نوع انسان کی سیرابی اور احیا کے لئے کوئی پانی آسمان سے نہ اُترتا اور دنیا ایک ایسے ہولناک صحرا میں تبدیل ہو جاتی جس پر مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي (الفرقان: 78) پر ہیبت حکومت طاری ہوتی۔ پس لاکھوں درود ہو اس محسن اعظمؐ پر جس کی ربوبیت تمام بنی نوع انسان اور تمام زمانوں کے لئے عام ہوگئی اور وہ مربی اعظم بنا۔ لاکھوں درود ہوں اس محسن اعظمؐ پر جس کی رحمت نے ایسا جوش مارا کہ قیود زمانہ اور حدود شرق و غرب سے آزاد ہوگئی اور وہ خدائے رحمٰن کے ہاتھوں رحمۃ للعالمین کے منصب پر فائز کیا گیا۔ لاکھوں درود ہوں اس محسن اعظمؐ پر جس کی گریہ وزاری آسمان کی رفعتوں سے قرآن کا دودھ کھینچ کر لائی اور جسے رحمتوں کا نہ ختم ہونے والا کوثر عطا کیا گیا۔ بخدا اگر اس کی دعائیں نہ ہوتیں تو یہ دنیا ویران ہو جاتی اور عالم روحانیت میں ہر طرف خاک اُڑتی پھرتی۔ اگر اس کی دعائیں نہ ہوتیں تو آج اس خطہ ارض سے زندگی کا نشان مٹ چکا ہوتا۔ اگر اس زندہ کرنے والے کی ، اس محیی کی دعائیں نہ ہوتیں تو یہ دنیا خاک کے تودوں اور بے روحوں کے چلنے پھرنے والے لاشوں کی دنیا بن جاتی۔ اسلام کا زندگی بخش انقلاب اسی کی دعاؤں کے طفیل آیا اور اسی کی دعاؤں کے طفیل دلوں نے اسے قبول کیا لیکن یہ ماجرا میری ناچیز اور حقیر اور عاصی زبان سے سننے کے لائق نہیں۔ سنو اور غلام احمدؑ کی پاک زبان سے احمدؐ پاک کی مقبول دعاؤں کا تذکرہ سنو:

”وہ جو عرب کے بیابانی ملک میں ایک عجیب ماجرا گزرا کہ لاکھوں مُردے تھوڑے دنوں میں زندہ ہو گئے اور پشتوں کے بگڑے ہوئے الٰہی رنگ پکڑ گئے اور آنکھوں کے اندھے بینا ہوئے اور گونگوں کی زبان پر الٰہی معارف جاری ہوئے اور دنیا میں یک دفعہ ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ نہ پہلے اس سے کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی

کان نے سنا۔ کچھ جانتے ہو وہ کیا تھا؟ وہ ایک فانی فی اللہ کی اندھیری راتوں کی دعائیں ہی تھیں جنہوں نے دنیا میں شور مچا دیا اور وہ عجائب باتیں دکھلائیں کہ جو اس اُمّی بے کس سے محالات کی طرح نظر آتی تھیں اللھم صل و سلم و بارك علیه واله بعد همه وغمه وحزنه لِهذِهِ الامة وأنزل علیه انوار رحمتك الى الابد۔

(برکات الدعا۔ روحانی خزائن جلد6 ص10-11)

یہ ہے عبادالرحمان کا وہ رفیع الشان گروہ جو وعدہ اِنّیِ قَرِیبٌ کا حقیقی مصداق ہے اور اپنی اس وسعت میں افق تا افق پھیلا ہوا ہے اور اپنی ذات میں ایک عظیم الشان جہان ہے۔ اس روحانی دنیا کی رفعتوں پر انبیاء علیہم السلام کے ہفت آسمان صاف علم ہیں۔ جن میں سب سے آخری اور سب سے بالا اور سب سے ارفع اور سب سے روشن ہمارے آقا و مولیٰ سید الانبیاء خاتم النبیین رحمۃ للعلمین حضرت نبی اکرم ﷺ ہیں۔ آپؐ ابدیت کے سب سے آخری مقام پر جلوہ افروز ہیں اور سب زمرۂ خلائق میں حقیقی اور کامل معنوں کے اعتبار سے بس ایک ہی آپؐ عبداللہ ہیں اور ایک معبود ہے اور باقی تمام بندگانِ خدا کے حق میں یہ تقدیر جاری نظر آتی ہے کہ جس حد تک وہ اپنی صفاتِ حسنہ میں اس عبدِ کامل کے قریب پہنچتے ہیں اور اسی حد تک انہیں ابدیت کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔

اے قبولیت دعا کا انکار کرنے والو! دیکھو کہ اسی عبدِ کامل کا ایک غلام کامل اس زمانہ میں بھی پیدا ہوا اور ان اخلاق اور اطوار اور حسن و احسان کو اپنایا جو اس نے اپنے آقاؐ میں دیکھے وہ قدم قدم اس کے پیچھے چلا اور روش روش اس کی پیروی کی۔ اپنے آقاؐ کی طرح وہ بھی مجسم دعا بن گیا اور اپنے آقاؐ کی طرح اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر ہر سانس کے ساتھ اور کروٹ کروٹ اس نے دعائیں کیں۔ صبح بھی وہ دعا گو ہوا اور شام

کو بھی اور دن کو بھی اور رات کو بھی، روشنی میں بھی اور اندھیرے میں بھی، شب ہائے غم میں بھی اور ایام خوشی میں بھی اپنے محبوب رسولؐ اپنی جان سے پیارے آقاؐ کی طرح وہ دعا ہی کے ساتھ پیدا ہوا، دعا ہی کے ساتھ زندہ رہا اور دعا کے ساتھ ہی اس نے جان دی۔ وہ آنکھیں ابھی زندہ ہیں جو اسے دیکھتی تھیں اور اس کی دعاؤں کی قبولیت کا نظارہ کرتی تھیں۔ وہ دل ابھی دھڑک رہے ہیں جو ازلی اور ابدی حقیقت پر گواہ ٹھہرے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعائیں سنتا اور قبول فرماتا ہے جو خلوص کامل کے ساتھ اُسی کے ہو رہتے ہیں دنیا اس حقیقت سے بے خبر ہو تو ہو لیکن اے مسیح محمدیؑ کے غلامو! تمہارے لئے قبولیت دعا کی حقیقت سے بے خبر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ مستجاب الدعوات احمد عربیؐ کا غلام گو آج ہم میں نہیں مگر ہزارہا غلامانِ غلام احمدؑ ایسے چھوڑ گیا ہے جو قبولیت دعا کا زندہ نشان ہیں۔

پس لوگوں کے لئے جگ بیتی ہو تو ہو لیکن تمہارے لئے تو یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جو ہزارہا بار تم پر بیت چکی۔ بارہا تم ابتلاؤں کی چکی میں پیسے گئے مگر ماں سے زیادہ پیار کرنے والے رحمان خدا نے تمہیں صحیح سالم نکال لیا۔ بارہا تم پر مخالف وطن کی آگ بھڑکائی گئی مگر رحمت باری کا پانی آسمان سے برسا اور اسے ٹھنڈا کر دیا۔ وہ دن یاد کرو جب اسی وطن عزیز کی گلیاں تمہیں کاٹنے کو دوڑتی تھیں اور اپنے تمہیں بیگانوں کی طرح دیکھتے تھے، جب ماحول کے تیور بدل گئے تھے اور شر پھیلانے والوں نے ایسا شر پھیلا رکھا تھا کہ اپنے اور بیگانے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ جب وہ عشاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنانِ محمدؐ کہہ کر گردن زدنی قرار دیا جا رہا تھا اور ایک احمدی کی نہ تو جان محفوظ رہی تھی، نہ ہی مال و عزت، خطرات ایسی مہیب صورت اختیار کر چکے تھے کہ ظاہر بین آنکھ احمدیوں کو چند دن کے مہمان دیکھ رہی تھی اور دم توڑتے ہوئے مریض کی سانسوں کی طرح عدم اور وجود کے درمیان لٹکا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس وقت خدا کے مومن بندے

ایک شدید زلزلے کی ابتلاء میں ڈالے گئے اور خطرات میں گھرے ہوئے ہر گھر سے خدا کے حضور گریہ وزاری کے شور بلند ہوئے۔ یہ وہ دن تھے جب جماعتی نظام کے سینے میں مصلح موعود کا دل دھڑک رہا تھا۔ پس وہ دل ایسا مضطرب و بے قرار ہوا اور اس زور کے ساتھ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ کا آوازہ بلند کیا کہ عرش کے پائے بھی لرز اُٹھے اور آسمان سے خدا تعالیٰ کی فوجوں کو اس نے اپنی مدد کے لئے بارش کے قطرات کی طرح اُترتے دیکھا جس نے ہر آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور ہر دشمنی کو محبت اور پیار میں بدل دیا۔ پس اے مسیح محمدی کے غلامو! اور خلافت احمدیہ کے جانثارو! دنیا اگر غافل ہے تو ہو تم تو گواہ ہو اٹھو اور گواہی دو کہ ہمارا رب اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا اور جواب دیتا ہے۔

(خطبات طاھر قبل از خلافت ص146-155)

# ارشادات

## حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ

ہمارے پیارے امام ہمام حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کی آیت 64 پر دو خطبات میں عبادالرحمٰن کی علامت عاجزی وانکساری پر احباب جماعت کو توجہ دلائی۔ آپ نے مؤرخہ 2-جنوری 2009ء کو اسی آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا۔

عاجزی اور انکساری ایک ایسا خلق ہے جب کسی انسان میں پیدا ہو جائے تو اس کے ماحول میں اور اس سے تعلق رکھنے والوں میں باوجود مذہبی اختلاف کے جس شخص میں یہ خلق ہو اس پر انگلی اٹھانے کا موقعہ نہیں ملتا بلکہ اس خُلق کی وجہ سے لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، اس سے تعلق رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہمیں تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ عاجزی اگر کسی میں نظر آتی ہے تو وہ آنحضرت ﷺ کی ذات ہے چنانچہ دیکھ لیں باوجود خاتم الانبیاء ہونے کے آپؐ اپنے ماننے والوں کو یہی فرماتے ہیں کہ مجھے موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو اور اس یہودی کو بھی پتہ تھا کہ باوجود اس کے کہ میں یہودی ہوں اور جھگڑا میرا مسلمان سے ہے اور پھر معاملہ بھی آپ ﷺ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اپنے اس جھگڑے کا معاملہ آپ ﷺ کے پاس ہی لاتا ہے، آپؐ کی خدمت میں ہی پیش کرتا ہے۔ کیونکہ مذہبی اختلاف کے باوجود اس کو یہ یقین تھا اور وہ اس یقین پر قائم تھا کہ یہ عاجز انسان ﷺ کبھی اپنی بڑائی ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور اس یہودی کو یہ بھی یقین تھا کہ میرا دل رکھنے کے لئے اپنے مرید کو یہی کہیں گے کہ مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔ یہ یقین اس لئے قائم تھا کہ آپ کی جو زندگی اس یہودی کے سامنے تھی اس سے یہی ثابت ہوا تھا اور آپؐ کا یہ حسن خلق

اس کو پتہ تھا اور یہ حسنِ خلق آپؐ میں اس لئے تھا کہ وہ شرعی کتاب جو آپؐ پر اُتری یعنی قرآن کریم اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو میں نے آیت پڑھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو جواباً کہتے ہیں سلام۔ یعنی جھگڑے کو بڑھاتے نہیں بلکہ وہیں معاملہ نپٹا کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی جھگڑا کرنے کی کوشش بھی کرے تو اس کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ جاہلوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر سالوں جنگیں لڑنے کی ان کو عادت نہیں ہے۔ تو یہ ہے وہ حسن خلق جو آنحضرت ﷺ میں تھا اور جو آپؐ اپنی امت میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

اس بارہ میں علامہ رازی آیت قرآنی اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ھَوْن سے مراد نرمی اور ملائمت ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ چال میں نرمی ہو چال میں نرمی ہوتی ہے، سکینت ہوتی ہے، وقار اور تواضع ہوتی ہے اور تکبر اور نخوت سے اپنے پاؤں زمین پر نہیں مارتے اور متکبر لوگوں کی طرح اکڑ کر نہیں چلتے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا۔ یعنی وہ زمین پر اکڑ کر نہیں چلتے۔ لکھتے ہیں کہ زید بن اسلم بیان کرتے ہیں کہ میں نے ھَوْنَ کی تفسیر تلاش کی تو مجھے نہ ملی تو خواب میں مجھے بتایا گیا کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد نہیں چاہتے۔

پھر ایک روایت ہے، حضرت عیاض بن حمار سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ہم سے خطاب فرمایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ انکساری اختیار کرو اس حد تک کہ تم میں سے کوئی کسی پر فخر نہ کرے۔

اب امت کو تو یہ حکم ہے کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے لیکن کیا ہمارے عمل اس کے مطابق ہیں۔ کسی کو اپنی قوم کا فخر ہے، خاندان کا فخر ہے، تو کسی کو دولت کا فخر ہے، کسی کو

دوستوں کا فخر ہے، کسی کو اولاد کا فخر ہے اور جس طرف بھی نظر ڈالیں آپ کوئی نہ کوئی فخر کا راستہ یا کوئی نہ کوئی فخر کی سوچ ہر ایک میں نظر آ جاتی ہے۔ پھر اور تو اور بعض دفعہ بعض لوگ اچھے سوٹ سلوالیں یا کپڑے پہن لیں تو اسی پر فخر ہونے لگ جاتا ہے۔ اس تعلیم پر نظر نہیں۔ اگر ہر ایک کی اس تعلیم پر نظر ہو جو ہمیں آنحضرت ﷺ نے دی تو فخر کے بجائے ہم میں سے ہر ایک میں ہر وقت عاجزی ہی عاجزی نظر آنی چاہئے۔

پھر دیکھیں روایت میں ہے جس میں آپؐ نے اپنے زبردست مقام کے بارے میں اعلان فرمایا ہے کہ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَلَافَخْرَ یعنی پہلی بات تو یہ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ۔ اور پھر ساتھ ہی عاجزی کا بھی ایسا اعلیٰ نمونہ دکھایا ہے کہ پھر فرما رہے ہیں وَلَا فَخْرَ۔ کہ میں تمام بنی آدم کا سردار ہوں اور یہ بہت بڑا اعلان ہے لیکن عاجزی کی انتہا کہ مگر کوئی فخر نہیں کرتا۔ اس میں مجھے کوئی فخر نہیں ہے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 3 ص 2 مطبوعہ بیروت)

پھر آپؐ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے لئے اس طرح تواضع اختیار کی۔ یہ فرماتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے اپنی ہتھیلی کو زمین کے ساتھ لگا دیا۔ اس کو میں اس طرح بلند کروں گا اور یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے اپنی ہتھیلی کو آسمان کی طرف اونچا کرنا شروع کیا اور بہت بلند کر دیا یعنی جو عاجزی اختیار کرے اور زمین کے ساتھ لگ جائے اس کو خدا تعالیٰ خود بلند کرتا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل مسند العشر المبشرین بالجنۃ جلد 1 ص 44 مطبوعہ بیروت)

اب ایسے لوگ جن کو اپنی بڑائی بیان کر کے اپنے مقام کا اظہار کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے ان کو یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ بلند مقام عاجزی سے ہی ملتا ہے۔ اچھا باغبان یا مالک ہو باغ کا وہ ہمیشہ درخت کی اُس شاخ کی قدر کرتا ہے۔ جو پھلوں سے لدی ہو اور زمین کے ساتھ لگی ہو۔ اسی طرح مالک ارض وسما اس سر کی قدر کرتا ہے جو

زمین کی طرف جھکتا ہے۔ عاجزی کے مقابلے پہ فخر، غرور اور تکبّر ہی ہے یعنی اس کا الٹ، تو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ شرک کے بعد تکبّر جیسی کوئی بلا نہیں۔ اگر غور کریں تو تکبّر ہی آہستہ آہستہ شرک کی طرف بھی لے کر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر احمدی کو ہمیشہ عاجزانہ راہوں پر چلائے۔

پھر ایک روایت ہے حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا جس نے اللہ کی خاطر ایک درجہ تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ رفع کرے گا یعنی اس کو ایک درجہ بلند کرے گا۔ جس نے عاجزی اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرے گا یہاں تک کہ اسے علّیین میں جگہ دے گا۔ بہت اونچے مقام پر لے جائے گا اور جس نے اللہ کے مقابل پر ایک درجہ تکبّر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایک درجہ نیچے گرا دے گا یہاں تک کہ اسے اسفل السافلین میں داخل کر دے گا

(مسند احمد بن حنبل باقی مسند المکثرین من الصحابۃ جلد 3 ص76)

یعنی انتہائی نچلے درجے پر جہنم کے بھی نچلے درجے میں لے جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر احمدی کو اسفل السافلین میں گرنے سے بچائے۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا ہر انسان کا سر دو زنجیروں میں ہے۔ ایک زنجیر ساتویں آسمان تک جاتی ہے اور دوسری زنجیر ساتویں زمین تک جاتی ہے۔ جب انسان تواضع یا عاجزی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ زنجیر کے ذریعہ اسے ساتویں آسمان تک لے جاتا ہے اور جب وہ تکبّر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ زنجیر کے ذریعہ اسے ساتویں زمین تک لے جاتا ہے۔ انتہائی نیچے گرا دیتا ہے۔

(کنز العمال حدیث 5745)

پھر ایک روایت میں آتا ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں اپنا سر بلند کیا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کاٹ دے گا۔ اور جس نے خدا کی خاطر دنیا

میں تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف ایک فرشتہ بھجوائے گا جو اسے مجمع میں سے اپنی طرف کھینچ لے گا اور کہے گا کہ اے صالح بندے! اللہ تعالیٰ کہتا ہے میری طرف آ، میری طرف آ، کیونکہ تو ان لوگوں میں سے ہے جن کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(کنز العمال حدیث:5734)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے مجھے فرمایا کہ اے عائشہ! اے عائشہ! عاجزی اختیار کر کیونکہ اللہ تعالیٰ عاجزی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور تکبّر کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے۔

(کنز العمال ٥٧٣٤)

اب حضرت عائشہؓ کو حالانکہ ان کا بھی ایک مقام تھا اور بڑی عاجزی تھی ان میں بھی۔ آپؐ نصیحت فرما رہے ہیں کہیں ہلکی سی کوئی چیز دیکھی ہو شائد۔ تو آج کل اگر کسی کو نصیحت کرو تو وہ کہتا ہے کیا ہم تو بڑے عاجز ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہم میں عاجزی۔

پھر حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تواضع انسان کو صرف بلندی میں ہی بڑھاتی ہے۔ پس تواضع اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں رفعتیں عطا کرے گا۔

(کنز العمال حدیث5740)

پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے عاجزی اور انکساری کی وجہ سے عمدہ لباس ترک کیا حالانکہ وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ اختیار دے گا کہ ایمان کی پوشاکوں میں سے جو پوشاک چاہے پہن لے۔

(ترمذی کتاب الصفۃ القیامۃ باب ما جاء فی صفۃ اوانی الحوض)

اب صرف اس سے یہی مرادنہیں۔اصل میں تونیّت مراد ہے۔اب دیکھیں کہ آج کل بھی شادی بیاہوں میں صرف ایک دو دفعہ پہننے کے لئے دلہن کے لئے یا دولہا کے لئے بھی اور رشتہ داروں کے لئے بھی کتنے مہنگے جوڑے بنوائے جاتے ہیں جو ہزاروں میں بلکہ لاکھوں میں چلے جاتے ہیں،صرف دکھانے کے لئے کہ ہمارے جہیز میں اتنے مہنگے مہنگے جوڑے ہیں یا اتنے قیمتی جوڑے ہیں یا ہم نے اتنا قیمتی جوڑا پہنا ہوا ہے۔صرف فخر اور دکھاوا ہوتا ہے۔کیونکہ پہلے تو یہ ہوتا تھا پُرانے زمانے میں کہ قیمتی جوڑا ہے تو آئندہ وہ کام بھی آجاتا تھا۔کام سُچا ہوتا تھا اچھا ہوتا تھا پھر اب تو وہ بھی نہیں رہا کہ جو اگلی نسلوں میں یا اگلے بچوں کے کام میں آجائیں ایسے کپڑے۔یونہی ضائع ہو جاتے ہیں،ضائع ہو رہے ہوتے ہیں۔پھر فیشن کے پیچھے چل کر دکھاوے اور فخر کے اظہار کی رَو میں بہہ کر قرآن کریم کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کر رہے ہوتے ہیں کہ اپنی زینتوں کو چھپاؤ۔فیشن میں بس ایسے ایسے عریاں قسم کے لباس سل رہے ہوتے ہیں کسی کو کوئی خیال ہی نہیں ہوتا۔تو احمدی بچوں اور احمدی خواتین کو ایسے لباسوں سے جن سے ننگ ظاہر ہوتا ہو پرہیز کرنا چاہئے۔اور پھر فخر کے لئے لباس پہنیں گے تو دوسری بُرائیاں بھی جنم لیں گی۔اللہ تعالیٰ ہر احمدی بچی،ہر احمدی عورت کو ایمان کی پوشاک ہی پہنائے اور دنیاوی لباس جو دکھاوے کے لباس ہیں ان سے بچائے رکھے۔اسی طرح مرد بھی اگر دکھاوے کے طور پر کپڑے پہنتے ہیں،لباس پہن رہے ہیں تو وہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔صاف ستھرا اچھا لباس پہننا منع نہیں۔ اس سوچ کے ساتھ یہ لباس پہننا منع ہے کہ اس میں فخر کا اظہار ہوتا ہو،دکھاوا ہوتا ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تواضع میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان اپنے بھائی کا جوٹھا پی لے۔اور جس نے اپنے بھائی کا جوٹھا پی لیا اللہ تعالیٰ اس کے ستّر (70) درجے بڑھائے گا۔اس کے

ستّر (70) گناہ معاف کردے گا اور اس کے لئے ستّر (70) نیکیاں لکھی جائیں گی۔

(کنز العمال حدیث 5748)

بعض لوگ اس لئے کراہت کرتے ہیں کہ جوٹھا ہے یا فلاں میرے ہم پلہ نہیں۔ اس لئے اس کا جوٹھا نہیں پینا، دوسرے کا پی لینا ہے۔ اس میں بھی ایک قسم کا تکبّر ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے ہمارے ایک بزرگ تھے ان کے بچے نے آکر شکایت کی کہ ابّا! فلاں بھائی نے یا بہن نے میرا پانی پی کر جوٹھا کر دیا ہے۔ تو انہوں نے کہا بچے! ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اور اسی پانی کو پی لیا۔ دیکھو اس کا جوٹھا میں نے پی لیا۔ جوٹھا کوئی نہیں ہوتا۔ تو بچے نے اور رونا شروع کر دیا کہ اب آپ نے بھی جوٹھا کر دیا۔ تو بہرحال یہ جوٹھ کوئی نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ کوئی بیماری ہو اور چھوت لگنے والی ہو اس میں احتیاط ضروری ہے۔

پھر ایک دفعہ کسی نے آنحضرت ﷺ کو یَا خَیْرُ الْبَرِیَّہ کہہ دیا (یعنی اے مخلوق کے بہترین وجود) تو آپؐ نے فرمایا وہ تو ابراہیم علیہ السلام تھے۔ عاجزی کی انتہا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 3 ص 178)

پھر ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آکر آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے محمد ﷺ۔ ہم میں سے سب سے بہترین اور اے ہم میں سے سب سے بہترین لوگوں کی اولاد۔ اے ہمارے سردار اور اے ہمارے سرداروں کی اولاد۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا۔ کہ دیکھو! تم اپنی اصلی بات کہو اور کہیں شیطان تمہاری پناہ نہ لے۔ میں محمد بن عبداللہ ہوں اور اللہ کا رسول ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ میرا مقام اس سے بڑھا چڑھا کر بتاؤ جو اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 3 ص 349 مطبوعہ مصر)

آج کل یہاں کسی کی تعریف کر دیں تو پھولے نہیں سماتا بلکہ فخر ہو رہا ہوتا ہے چاہے وہ اس مقام کا ہو بھی یا نہ۔ اور آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ دیکھیں۔

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ تم میں سے کسی کو اس کے اعمال جنت میں لے کر نہیں جائیں گے۔ صحابہؓ نے تعجب سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا آپؐ کے عمل بھی؟۔ تو آپ نے فرمایا ہاں۔ مجھے بھی اگر خدا کی رحمت اور فضل ڈھانپ نہ لیں تو میں بھی جنت میں نہیں جا سکتا۔

(مسلم کتاب صفات المنافقین و احکامهم باب لن یدخل احد الجنة بعمله)

اب دیکھیں عاجزی کی کتنی انتہا ہے حالانکہ کائنات کو آپؐ کی خاطر پیدا کیا گیا۔ اور آپؐ کی عاجزی اس حد تک ہے اس انتہا تک ہے۔

پھر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر کوئی حسین اخلاق والا نہیں تھا۔ آپؐ کے صحابہ میں سے یا اہل خانہ میں سے جب بھی کسی نے آپؐ کو بلایا تو ہمیشہ آپؐ کا جواب یہ ہوتا تھا کہ میں حاضر ہوں۔ تب ہی تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ آپؐ عظیم خلق پر قائم تھے۔

(الوفاء باحوال المصطفیٰ از علامہ ابن جوزی ص 467 حامد اینڈ کمپنی لاہور)

پھر اپنی عاجزی کے اظہار اور اپنے خاندان کو صحیح راستے پر ڈالنے کے لئے اور ان کو عباد الرحمٰن بنانے کے لئے آپؐ نے کیسی خوبصورت نصیحت فرمائی۔ ایک موقع پر آپؐ نے اپنی پھوپھی صفیّہ کو فرمایا۔ اے میری پھوپھی صفیّہ بنت عبدالمطلب اور اے میری لخت جگر فاطمہ! میں تم کو اللہ کے عذاب سے ہرگز نہیں بچا سکتا۔ اپنی جانوں کی خود فکر کر لو۔

(بخاری کتاب التفسیر سورۃ الشعراء زیر آیت و انذر عشیرتک الاقربین)

تو ہمیشہ اللہ کا فضل اور صرف اس کا فضل ہی ہے جو انسان کو بچائے اور ہر وقت

اس کے آگے جھکے رہنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی ہر وقت تعمیل کرتے رہنا چاہئے اور اس کی مخلوق کی خدمت کرتے رہنا چاہئے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اگر خدا کو تلاش کرنا ہے تو مسکینوں کے دلوں کے پاس تلاش کرو۔ اسی لئے پیغمبروں نے مسکینی کا جامہ ہی پہن لیا تھا۔ اسی طرح چاہئے کہ بڑی قوم کے لوگ چھوٹی قوم کو ہنسی نہ کریں اور نہ کوئی یہ کہے کہ میرا خاندان بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم میرے پاس جو آؤ گے تو یہ سوال نہ کروں گا کہ تمہاری قوم کیا ہے؟ یا تمہارا خاندان کیا ہے؟ بلکہ سوال یہ ہوگا کہ تمہارا عمل کیا ہے۔ اسی طرح پیغمبر خدا نے اپنی بیٹی کو فرمایا کہ اے فاطمہ! خدا تعالیٰ ذات کو نہیں پوچھے گا اگر تم کوئی برا کام کرو گی تو خدا تعالیٰ تم سے اس واسطے درگذر نہ کرے گا کہ تم رسول کی بیٹی ہو۔

(ملفوظات جلد 3 ص380)

پھر دیکھیں آج کل اگر کسی کو کوئی عہدہ مل جائے یا مالی حالت کچھ بہتر ہو جائے تو زمین پر پاؤں نہیں ٹکتے۔ اپنے آپ کو کوئی بالا مخلوق سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ ماتحتوں سے یا غریب رشتہ داروں سے اس طرح بات کرتے ہیں جیسے کوئی انتہائی کم درجہ کے لوگ ہوں۔ لیکن اسوۂ رسولؐ دیکھیں کیا ہے۔

ابو مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضورؐ کے پاس ایک شخص آیا آپ اس سے گفتگو فرما رہے تھے تو اسی دوران میں اس پر آپؐ کا رعب اور ہیبت طاری ہوگئی اور اس وجہ سے اس کو کپکپی طاری ہوگئی کانپنے لگ گیا وہ۔ تو آپؐ اسے فرمانے لگے۔ کہ دیکھو اطمینان اور حوصلہ رکھو، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے میں کوئی جابر بادشاہ تھوڑا ہی ہوں میں تو ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔

(ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب القدید)

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

مومن کی یہ شرط ہے کہ اس میں تکبر نہ ہو بلکہ انکسار، عاجزی، فروتنی اس میں پائی جائے اور یہ خدا تعالیٰ کے ماموروں کا خاصہ ہے ان میں حد درجہ کی فروتنی اور انکسار ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر آنحضرت ﷺ میں یہ وصف تھا۔ آپؐ کے ایک خادم سے پوچھا گیا کہ تیرے ساتھ آپؐ کا کیا معاملہ ہے۔ اس نے کہا سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ وہ میری خدمت کرتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَ سَلِّمْ تو یہ ہے وہ نمونہ اعلیٰ اخلاق اور فروتنی کا اور یہ بھی سچ ہے کہ زیادہ تر عزیزوں میں خدام ہوتے ہیں جو ہر وقت گردو پیش حاضر رہتے ہیں۔ فرمایا اس لئے اگر کسی کے انکسار اور فروتنی اور تحمل اور برداشت کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان سے معلوم ہو سکتا ہے بعض مرد یا عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ خدمت گار سے ذرا کوئی کام بگڑا۔ مثلاً چائے میں نقص ہوا تو جھٹ گالیاں دینی شروع کر دیں یا تازیانہ لے کر مارنا شروع کر دیا اور ذرا شوربے میں نمک زیادہ ہو گیا تو بس بیچارے خدمتگاروں پر آفت آئی۔

(ملفوظات جلد 4 ص437-438)

ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک کم سن لونڈی کو بازار میں روتے دیکھا جو گھر کے مالکوں کا آٹا پیسنے نکلی تھی مگر درہم گم کر بیٹھی۔ آپؐ نے اسے درہم بھی مہیا کئے اور اس کے مالکوں کے گھر جا کر سفارش بھی کی۔ اس بات پر کہ آنحضرت ﷺ سفارش کرنے کے لئے آئے ہیں مالکوں نے اس کو آزاد بھی کر دیا۔

(مجمع الزوائد از علامہ ہیثمی جلد 9 ص41 مطبوعہ بیروت)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ ایک مجلس میں اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا، ذرا پاگل پن

تھا تھوڑا۔ تو حضورؐ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ مجھے آپؐ سے کچھ کام ہے لیکن میں آپؐ سے ان لوگوں کے سامنے باتیں نہیں کروں گی۔ علیحدگی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ٹھیک ہے جہاں بھی مدینہ کے راستوں میں سے جس رستہ پہ چاہو یا سڑک پہ چاہو یا جو بیٹھنے کی جگہیں ہیں وہاں چاہو مجھے بتادو میں وہاں جا کر بیٹھتا ہوں اور تم بات کرو اور میں تمہاری بات سنوں گا۔ اور فرمایا جب تک تیری بات سن کر تیری ضرورت پوری نہ کردوں وہاں سے نہیں ہٹوں گا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں حضورؐ کی بات سن کر وہ حضورؐ کو ایک راستہ پر لے گئی پھر وہاں جا کر بیٹھ گئی حضورؐ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور جب تک اس کی بات سن کر اس کا کام نہیں کر دیا حضورؐ وہیں بیٹھے رہے۔

(الشفا لقاضی عیاض باب تواضعہ ص192)

تو اس زمانہ میں یہی مثال یہی اسوۂ ہمیں آپ کے عاشق صادق اور غلام حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اپنے تو درکنار میں تو یہ کہتا ہوں کہ غیروں اور ہندوؤں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق کا نمونہ دکھاؤ اور ان سے ہمدردی کرو اور لاابالی مزاج ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں سیر کو جارہا تھا تو ایک پٹواری میرے ساتھ تھا وہ ذرا آگے تھا اور میں پیچھے۔ راستے میں ایک بڑھیا ۷۰،۷۵ سال کی ملی پہلے ان پٹواری صاحب کو اس نے خط پڑھنے کو کہا مگر اس نے اسے جھڑکیاں دے کر ہٹا دیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ پھر اس بڑھیا نے وہ خط مجھے دیا تو فرماتے ہیں کہ میں اس کو لے کر ٹھہر گیا اور اس کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھا دیا۔ اس پر پٹواری کو بڑی شرمندگی ہوئی کیونکہ ٹھہرنا تو پڑا اور ثواب سے بھی محروم رہا۔

(ملفوظات جلد4 ص82-83)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عاجزی کی ایک اور مثال دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور کس طرح عاجزانہ مناجات کرتے ہیں باوجود اس کے کہ آپؐ کو ہر طرح کی ضمانت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی، باوجود اس کے کہ آپؐ کو علم تھا کہ آپؐ کے پاس شیطان کا گزر نہیں ہوتا جیسا کہ فرمایا کہ میرا تو شیطان بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی کس خوف اور عاجزی سے مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے۔

روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کی شام میں اس طرح دعا کی کہ:

اے اللہ! تو میری باتوں کو سنتا ہے اور میرے حال کو دیکھتا ہے، میری پوشیدہ باتوں اور ظاہر امور سے تو خوب واقف ہے میرا کوئی بھی معاملہ تجھ پر مخفی نہیں میں ایک بدحال فقیر اور محتاج ہی تو ہوں تیری مدد اور پناہ کا طالب، سہما اور ڈرا ہوا اپنے گناہوں کا اقراری اور معترف ہو کر تیرے پاس چلا آیا ہوں۔ میں تجھ سے عاجز مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں ہاں تیرے حضور میں ایک ذلیل گناہگار کی طرح زاری کرتا ہوں، ایک اندھے نابینے کی طرح ٹھوکروں سے خوف زدہ تجھ سے دعا کرتا ہوں میری گردن تیرے آگے جھکی ہوئی ہے اور میرے آنسو تیرے حضور بہہ رہے ہیں، میرا جسم تیرا مطیع ہو کر سجدے میں گرا پڑا ہے اور ناک خاک آلودہ ہے۔ اے اللہ! تو مجھے اپنے حضور دعا کرنے میں بد بخت نہ ٹھہرا دینا اور میرے ساتھ مہربانی اور رحم کا سلوک فرمانا۔ اے وہ جو سب سے بڑھ کر التجاؤں کو قبول کرتا اور سب سے بہتر عطا فرمانے والا ہے میری دعا قبول کر لینا۔

(مجمع الزوائد ھیثمی مطبوعہ بیروت جلد نمبر 3 ص252)

تو اندازہ کریں کہ ان عاجزانہ دعاؤں کا۔ کیا ہم اس سے کم عاجزانہ دعائیں مانگ کر اللہ تعالیٰ کی بخشش کے طالب ہو سکتے ہیں۔ ہمیں تو بہت بڑھ کر اپنی عاجزی کا

اظہار کرنا چاہئے۔ اصل میں تو یہ وہ طریقے ہیں یا اسلوب ہیں جو آنحضرت ﷺ نے دعا کر کے ہمیں سکھائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم بھی اس اسوۂ حسنہ پر چل کر اسی طرح عاجزی اور انکساری اختیار کرنے والے ہوں۔

پھر حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! میری مدد کر میرے خلاف کسی کی مدد نہ کرنا اور میری نصرت کر اور میرے خلاف کسی کی مدد نہ کرنا، اور میرے حق میں تدبیر کر مگر میرے خلاف تدبیر نہ کرنا اور مجھے ہدایت دے اور ہدایت کو میرے لئے آسان بنا دے اور مجھ پر زیادتی کرنے والے کے خلاف میری مدد کر۔ اے اللہ! مجھے اپنا بہت شکر کرنے والا کثرت سے ذکر کرنے والا اور بہت زیادہ ڈرنے والا بنا دے مجھے اپنا بے حد مطیع، اپنی طرف انکساری کے سر تسلیم خم کرنے والا بہت نرم دل اور سچے دل سے جھکنے والا بنا دے۔ اے اللہ! میری توبہ قبول کر اور میرے گناہوں کو دھو ڈال میری دعا قبول کر اور میری دلیل کو مضبوط بنا دے اور میری زبان کو بہتری بخش اور میرے دل کو ہدایت عطا کر اور میرے سینے کے کینے کو دور کر دے۔

(ترمذی کتاب الدعوات باب فی دعاء النبی ﷺ)

وہ جو داعیان الی اللہ ہیں وہ بھی جب جائیں تو اس دعا کے ساتھ ان کو باہر نکلنا چاہئے۔

پھر فرمایا کہ اے اللہ! میں تجھ سے ایسے دل سے پناہ مانگتا ہوں جس میں عاجزی اور انکساری نہیں اور ایسی دعا سے پناہ مانگتا ہوں جو مقبول نہ ہو اور ایسے نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو۔ اور ایسے علم سے جو کوئی فائدہ نہ دے میں ان چاروں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

(ترمذی کتاب الدعوات باب ماجاء فی جامع الدعوات عن رسول اللہ)

تو یہ عاجزی اور انکساری کے وہ چند نمونے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہمیں نظر آتے ہیں بہت سارے بے شمار واقعات ہیں ان میں سے ہی یہ چند لئے گئے ہیں تو آپؐ کی زندگی کا تو لحہ لحہ عاجزی اور انکساری میں گزرا باوجود اس کے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کل عالم کے لئے نبی مبعوث فرمایا تھا اور آپؐ خاتم الانبیاء تھے۔ کوئی نبی آپؐ کے بعد بجز آپؐ کی سچی اتباع کے اور اطاعت کے آنہیں سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے پیار کے نظارے آپؐ ہر روز دیکھتے تھے لیکن پھر بھی عاجزی کی یہ انتہا تھی جس کی چند مثالیں میں نے دیں۔ اب اس زمانے میں بھی دیکھیں آپؐ سے وفا اور غلامی کے طفیل حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس عاجزی کی وجہ سے جو آپ علیہ السلام نے اپنے آقا سے سیکھی تھی پیار کے جلوے دکھائے اور پھر آپ نے اپنی جماعت کو ان اسلوب اور طریقوں کو اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ جماعت احمدیہ کی اجتماعی ترقی ہو یا ہر احمدی کی انفرادی ترقی ہو اس کا راز اب عاجزی دکھانے میں اور عاجز رہنے میں ہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو الہاماً بتایا ہے کہ ”تیری عاجزانہ راہیں اسے پسند آئیں“۔

(الہام 18 / مارچ 1907ء۔ تذکرہ طبع چہارم ص 595)

ایک موقع پر حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے بارہ میں فرماتے ہیں:

”خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ مَیں تجھے برکت پر برکت دوں گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔

سوائے سننے والو! ان باتوں کو یاد رکھو اور ان پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں محفوظ رکھ لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پورا ہو گا۔ (اور ہم اللہ کے فضل سے ان کو پورا ہوتے بھی دیکھ رہے ہیں)۔ مَیں اپنے نفس میں کوئی نیکی نہیں دیکھتا اور مَیں نے وہ

کام نہیں کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا اور مَیں اپنے تئیں صرف ایک نالائق مزدور سمجھتا ہوں۔ یہ محض خدا کا فضل ہے جو میرے شامل حال ہوا۔ پس خدائے قادر اور کریم کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس مشت خاک کو اس نے باوجود ان تمام بے ہنریوں کے قبول کیا''

(تجلیات الٰہیہ روحانی خزائن جلد 20 ص409-410)

آپؑ اپنے ایک کلام میں، شعروں میں فرماتے ہیں ؎

کون کہتا ہے کہ نالائق نہیں ہوتا قبول
میں تو نالائق بھی ہو کر پا گیا درگہ میں بار
تیرے کاموں سے مجھے حیرت ہے میرے قدیر
کس عمل پر مجھ کو دی ہے خلعت قرب و جوار

حضرت مصلح موعود اس بارہ میں فرماتے ہیں کہ:

وہ عبادالرحمٰن جنہوں نے دنیا میں انکسار اور عدل و انصاف کے ساتھ اپنی عمر بسر کی۔ جو دن کے اوقات میں بھی احکام الٰہی کے تابع رہے اور رات کی تاریکیوں میں بھی سجدہ و قیام میں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے اور دعائیں کرتے رہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرتے ہوئے انہیں ساتویں آسمان پر جگہ عنایت فرمائے گا یعنی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر ہی ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل جلد 4 صفحہ 207-208)۔ اس کی طرف رسول کریم ﷺ نے اس حدیث میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ اِذَا تَوَاضَعَ الْعَبْدُ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ (کنز العمال جلد 2 ص52) کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ساتویں آسمان میں جگہ دیتا ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے خدا کے لئے ھَوْن اور تَذَلُّلْ اختیار کیا ہوگا اس لئے خدا تعالیٰ بھی انہیں سب سے اونچا مقام رفعت عطا فرمائے گا

اور انہیں منازل قرب میں سے سب سے اونچی منزل عطا کی جائے گی۔

(تفسیر کبیر جلد 6 ص597)

اسی مضمون کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

جو خاک میں ملے اسے ملتا ہے آشنا
اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما

جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ اس زمانے میں عاجزی اختیار کرنے کے طریقے اور سلیقے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے ہمیں سکھائے اس لئے آپ علیہ السلام کے نسخوں پر عمل کرکے ہی ہم اس خلق کو حاصل کر سکتے ہیں۔

آپؑ فرماتے ہیں کہ تذلّل اور انکساری کی زندگی کوئی شخص اختیار نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہ کرے۔ اپنے آپ کو ٹٹولو، اگر بچے کی طرح اپنے آپ کو کمزور پاؤ تو گھبراؤ نہیں۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا صحابہؓ کی طرح جاری رکھو۔ راتوں کو اٹھو اور دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی راہ دکھائے۔ آنحضرت ﷺ کے صحابہ نے بھی تدریجاً تربیت پائی۔

(ملفوظات جلد اول ص28)

پھر آپؑ فرماتے ہیں: عاجزی اختیار کرنی چاہیے۔ عاجزی کا سیکھنا مشکل نہیں ہے اس کا سیکھنا ہی کیا ہے۔ انسان تو خود ہی عاجز ہے اور وہ عاجزی کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (اَلذّاریات:57)

(ملفوظات جلد 3 ص 232)

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ عاجزی اختیار کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور جھکو، اس کی عبادت کرو۔ تو عاجزی سمیت تمام خلق پیدا ہوتے جائیں گے۔

انشاء اللہ۔

پھر آپؑ فرماتے ہیں: ”پانچ وقت اپنی نمازوں میں دعا کرو۔ اپنی زبان میں بھی دعا کرنا منع نہیں ہے۔ نماز کا مزہ نہیں آتا جب تک حضور نہ ہو اور حضورِ قلب نہیں ہوتا ہے جب تک عاجزی نہ ہو۔ عاجزی جب پیدا ہوتی ہے جو یہ سمجھ آجائے کہ کیا پڑھتا ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں اپنے مطالب پیش کرنے کے لئے جوش اور اضطراب پیدا ہوسکتا ہے“۔

(ملفوظات جلد 3 ص434)

جب آدمی دعا کر رہا ہو سمجھ نہ آرہی ہو تو عاجزی کس طرح پیدا ہوگی اگر مطلب نہ آرہا ہو۔ اس لئے اپنی زبان میں دعائیں کریں۔

اللہ تعالیٰ سے مانگیں اس کے آگے روئیں، گڑگڑائیں۔

پھر آپؑ فرماتے ہیں: ”...... انبیاء میں بہت سے ہنر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہنر سَلبِ خودی کا ہوتا ہے۔ ان میں خودی نہیں رہتی۔ وہ اپنے نفس پر ایک موت وارد کر لیتے ہیں۔ کبریائی خدا کے واسطے ہے۔ جو لوگ تکبر نہیں کرتے اور انکساری سے کام لیتے ہیں وہ ضائع نہیں ہوتے“۔

(ملفوظات جلد 5ص216)

پھر آپؑ جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”انسان بیعت کنندہ کو اول انکساری اور عجز اختیار کرنی پڑتی ہے اور اپنے خودی اور نفسانیت سے الگ ہونا پڑتا ہے تب وہ نشوونما کے قابل ہوتا ہے لیکن جو بیعت کے ساتھ نفسانیت بھی رکھتا ہے اسے ہرگز فیض حاصل نہیں ہوتا“۔

(ملفوظات جلد 3 ص455)

پھر آپؑ نے فرمایا: ”میں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ تکبر سے بچو کیونکہ

تکبر ہمارے خداوند ذوالجلال کی آنکھوں میں سخت مکروہ ہے۔......ایک شخص جو اپنے بھائی کی بات کو تواضع سے سننا نہیں چاہتا اور منہ پھیر لیتا ہے اس نے بھی تکبر سے حصہ لیا ہے۔......کوشش کرو کہ کوئی حصہ تکبر کا تم میں نہ ہو تا کہ ہلاک نہ ہو جاؤ اور تا تم اپنے اہل و عیال سمیت نجات پاؤ۔ خدا کی طرف جھکو اور جس قدر دُنیا میں کسی سے محبت ممکن ہے تم اس سے کرو۔ اور جس قدر دُنیا میں کسی سے انسان ڈر سکتا ہے تم اپنے خدا سے ڈرو۔ پاک دل ہو جاؤ اور پاک ارادہ اور غریب اور مسکین اور بے شر تا تم پر رحم ہو"۔

(نزول المسیح۔ روحانی خزائن جلد 18 ص402-403)

فرمایا: انسان جو ایک عاجز مخلوق ہے اپنے تئیں شامت اعمال سے بڑا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ کبر اور رعونت اس میں آ جاتی ہے۔ اللہ کی راہ میں جب تک انسان اپنے آپ کو سب سے چھوٹا نہ سمجھے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ کبیر نے سچ کہا ہے۔

بھلا ہوا ہم نیچ بھئے ہر کو کیا سلام

جے ہوتے گھر اونچ کے ملتا کہاں بھگوان

(یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم چھوٹے گھر میں پیدا ہوئے۔ اگر عالی خاندان میں پیدا ہوتے تو خدا نہ ملتا۔ جب لوگ اپنی اعلیٰ ذات پر فخر کرتے تو کبیر اپنی کم ذات پر نظر کر کے شکر کرتا تھا۔)۔ پس انسان کو چاہئے کہ ہر دم اپنے آپ کو دیکھے کہ میں کیسا ہیچ ہوں۔ میری کیا ہستی ہے۔ ہر ایک انسان خواہ کتنا ہی عالی نسب ہو مگر جب وہ اپنے آپ کو دیکھے گا بہر نہج وہ کسی نہ کسی پہلو میں بشرطیکہ آنکھیں رکھتا ہو تمام کائنات سے اپنے آپ کو ضرور بالضرور نا قابل و ہیچ جان لے گا۔ انسان جب تک ایک غریب و بیکس بڑھیا کے ساتھ وہ اخلاق نہ برتے جو ایک اعلیٰ نسب عالی جاہ انسان کے ساتھ برتتا ہے یا برتنے چاہئیں اور ہر ایک طرح کے غرور و رعونت و کبر سے اپنے آپ کو نہ بچاوے وہ ہرگز ہرگز خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔

(ملفوظات جلد 3 ص314-315)

فرمایا: خدا تعالیٰ کی یہ عادت ہرگز نہیں کہ جو اس کے حضور عاجزی سے گر پڑے وہ اسے خائب و خاسر کرے اور ذلت کی موت دیوے۔ جو اس کی طرف آتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے ایسی نظیر ایک بھی نہ ملے گی کہ فلاں شخص کا خدا سے سچا تعلق تھا اور پھر وہ نامراد رہا۔ خدا تعالیٰ بندے سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہش اس کے حضور پیش نہ کرے اور خالص ہو کر اس کی طرف جھک جاوے۔ جو اس طرح جھکتا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور ہر ایک مشکل سے خود بخود اس کے واسطے راہ نکل آتی ہے جیسے کہ وہ خود وعدہ فرماتا ہے مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا۔ وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ اس جگہ رزق سے مراد صرف روٹی نہیں بلکہ عزت علم وغیرہ سب باتیں جن کی انسان کو ضرورت ہے اس میں داخل ہیں۔ خدا تعالیٰ سے جو ذرہ بھر بھی تعلق رکھتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔ ہمارے ملک ہندوستان میں نظام الدین صاحب اور قطب الدین صاحب اولیاء اللہ کی جو عزت کی جاتی ہے وہ اسی لئے ہے کہ خدا تعالیٰ سے ان کا سچا تعلق تھا......"

(البدر جلد 2 نمبر 14 مورخہ 24 اپریل 1903ء ص 107)

پھر فرمایا: "خدا تعالیٰ کی طرف قدم اٹھاؤ اور پرہیزگاری کی باریک راہوں کی رعایت رکھو۔ سب سے اول اپنے دلوں میں انکسار اور صفائی اور اخلاص پیدا کرو اور سچ مچ دلوں کے حلیم اور سلیم اور غریب بن جاؤ کہ ہر یک خیر اور شر کا بیج پہلے دل ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر تیرا دل شر سے خالی ہو تو تیری زبان بھی شر سے خالی ہوگی اور ایسا ہی تیری آنکھ اور تیرے سارے اعضاء۔ ہر یک نور یا اندھیرا پہلے دل میں ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ تمام بدن پر محیط ہو جاتا ہے۔ سو اپنے دلوں کو ہر دم ٹٹولتے رہو۔

پھر آپؑ نے فرمایا: "اور عبادت کی فروع میں یہ بھی ہے کہ تم اس شخص سے بھی

جوتم سے دشمنی رکھتا ہوایسی ہی محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے اوراپنے بیٹوں سے کرتے ہواور یہ کہ تم دوسروں کی لغزشوں سے درگزر کرنے والے اوران کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنے والے بنواور نیک دل اور پاک نفس ہوکر پرہیزگاروں والی صاف اور پاکیزہ زندگی گزارو۔ اورتم بُری عادتوں سے پاک ہوکر باوفا اور باصفا زندگی بسر کرو۔ اور یہ کہ خلق اللہ کے لئے بلاتکلف وتصنع بعض نباتات کی مانند نفع رساں وجود بن جاؤ۔ اور یہ کہ تم اپنے کبر سے اپنے کسی چھوٹے بھائی کو دکھ نہ دو۔ اور نہ کسی بات سے اس (کے دل) کو زخمی کرو۔ بلکہ تم پرواجب ہے کہ اپنے ناراض بھائی کو خاکساری سے جواب دواوراسے مخاطب کرنے میں اس کی تحقیر نہ کرواور مرنے سے پہلے مرجاؤ اوراپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرلواور جوکوئی (ملنے کے لئے) تمہارے پاس آئے اس کی عزت کروخواہ وہ پُرانے بوسیدہ کپڑوں میں ہو نہ کہ نئے جوڑوں اور عمدہ لباس میں اورتم ہر شخص کو السلام علیکم کہوخواہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہواور (لوگوں کی) غم خواری کے لئے ہردم تیار کھڑے رہو۔''

(ترجمہ عربی عبارت اعجاز المسیح) از تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام جلد اول ص204)

خلاصہ ان باتوں کا یہ ہوا کہ تم عاجزی دکھانے والے تب شمار کئے جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو حاصل کرنے والے تب ہوگے جب تم اپنے سے نفرت کرنے والوں سے بھی محبت کرو، جب ضرورت ہوتو ان کے کام آؤ اوران کے لئے دعا کرو۔ اور پھر دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے والے بنو۔ غلطیوں کی وجہ سے کسی کے پیچھے نہ پڑ جاؤ۔ اوران کی تشہیر نہ کرتے پھرو۔ کسی کی غلطی کو دیکھ کر دوسروں کو بتاتے نہ پھرو بلکہ پردہ پوشی کی بھی عادت ڈالو۔

پھراس میں یہ بھی فرمایا کہ اپنے دل کو ٹٹولتے رہو، اس کو پاک رکھنے کی کوشش کرو، اپنا

خود محاسبہ کرتے رہو۔ کسی کے لئے بھی دل میں کینہ، نفرت، بغض، حسد وغیرہ نہ ہو۔ کیونکہ اگر یہ چیزیں دل میں ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ دل بڑائی اور تکبر سے بھرا ہوا ہے اور اس میں عاجزی نہیں ہے۔ پھر کسی کو اپنی باتوں سے دکھ نہ دو اور ہر ایک کی عزت کرو۔ چاہے کوئی غریب ہو، فقیر ہو، کم طاقت کا ہو یا ماتحت ہو یا ملازم ہو سب کی عزت کرو۔ پھر سلام کہنے کی عادت ڈالو۔ اس سے بھی معاشرے میں محبت اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہوتی ہے اور عاجزی اور انکساری بڑھنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، اپنے اندر بھی اور دوسرے ماحول میں بھی۔ تو فرمایا کہ یہ کام تو بہت مشکل ہے اور یہ تب ہی کر سکتے ہو جب گویا کہ اپنے آپ کو مار لیا، اپنے نفس کو بالکل ختم کر دیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لئے ہمیشہ اس کا فضل مانگتے رہو۔ اس کے سامنے جھکے رہو اور دعائیں کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عاجزی اور انکساری کے اعلیٰ معیار قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس بارہ میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے چند شعر ہیں وہ مَیں پڑھتا ہوں ؎

اے کرم خاک چھوڑ دے کبر و غرور کو
زیبا ہے کبر حضرت رب غیور کو
بدتر بنو ہر ایک سے اپنے خیال میں
شاید اسی سے دخل ہو دارالوصال میں
چھوڑو غرور و کبر کہ تقویٰ اسی میں ہے
ہو جاؤ خاک مرضیٔ مولیٰ اسی میں ہے

اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب نصائح پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(خطبات مسرور جلد 2ص4-22)

مؤرخہ 11 مارچ 2005ء کو پیارے حضور انور ایدہ اللہ نے ایک دفعہ پھر جماعت کو سورۃ الفرقان کی آیت 64 میں بیان عبادالرحمٰن کے وصف عاجزی و انکساری کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی اور عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں سلام۔

ان عبادالرحمٰن میں سے سب سے بڑے عبدرحمٰن وہ نبیوں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کی قوت قدسی نے عبادالرحمٰن پیدا کئے۔ تکبر سے رہنے والوں کو عجز کے راستے دکھائے۔ ان کے ذہنوں سے غلام اور آقا اور امیر اور غریب کی تخصیص ختم کر دی۔ یہ سب انقلاب کس طرح آیا۔ یہ اتنی بڑی تبدیلی دلوں میں کس طرح پیدا ہوئی۔ کیا صرف پیغام پہنچانے سے؟ تعلیم دینے سے؟ نہیں، اس کے ساتھ ساتھ خود بھی عبدیت کے اعلیٰ معیار آپؐ نے قائم کئے۔ خود بھی یہ عاجزی اور انکساری کے نمونے دکھا کر اپنے عمل سے ثابت کر کے دکھایا کہ جو کچھ مَیں کہہ رہا ہوں اس کے اعلیٰ معیار بھی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ عاجزی اور انکساری کے نمونے آپؐ نے عمل سے دکھائے کہ یہ میری زندگی کے ہر پہلو میں نظر آئیں گے۔ معاشرے کے غریب اور کمزور طبقے سے بھی میرا یہی سلوک ہے، جاہل اور اجڈ لوگوں سے بھی میرا یہی سلوک ہے، بڑوں سے بھی یہی سلوک ہے اور چھوٹوں سے بھی یہی سلوک ہے۔

اور یہی سلوک ہے جو میری زندگی کے ہر لمحے میں ہر ایک کے ساتھ تمہیں نظر آئے گا۔ اور یہی کچھ دیکھتے ہوئے خدا تعالیٰ نے آپؐ کو یہ سند عطا فرمائی کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:5) یعنی ہم قسم کھاتے ہیں کہ تو اپنی تعلیم اور عمل میں نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر قائم ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اس قسم نے آپ کو عاجزی میں اور بھی بڑھایا۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے۔ حضرت حسین بن علیؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ مجھے میرے حق سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بندہ پہلے بنایا ہے اور رسول بعد میں۔

(مجمع الزوائد للهيثمي ۔كتاب علامات النبوة -باب في تواضعه ﷺ)

اور حضرت حسینؓ کا یہ جو بیان ہے یہ کسی شخص کے اُس روّیہ پر ہے جس نے آپؓ سے بے انتہا محبت کر کے غیر ضروری طور پر بعض الفاظ آپؓ کے لئے استعمال کر دیئے تھے۔ آپؓ نے فرمایا تم جو میرے لئے الفاظ استعمال کر رہے ہو مجھے تو نبی کریم ﷺ کی یہ بات اپنے لئے یاد ہے کہ یہ الفاظ آپؐ نے اپنے لئے فرمائے تھے کہ مجھے بھی میرے حق سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش نہ کرو۔ پس یہ ہے عاجزی کی وہ اعلیٰ مثال جو آپؐ نے اپنی اولاد در اولاد میں بھی پیدا کر دی کہ یاد رکھو کہ میں بھی اللہ کا بندہ ہوں یعنی بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف:111) کی وضاحت فرمائی اور پھر فرمایا کہ پھر یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے مجھ پر وحی نازل فرمائی اور اپنا رسول بنایا۔ یہ اعلیٰ درجہ کی ہدایت اور آپؐ کا جواب آپؐ کے مقام کو اور بھی بلند کرتا ہے۔ آپؐ کیونکہ ایک اعلیٰ درجہ کے عبد کامل تھے اس لئے یہ تعلیم دی اور اس پہ بڑا زور دیا کہ مجھے اللہ کا بندہ ہی سمجھنا۔

اس بارے میں ایک اور روایت میں آتا ہے، حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضور ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری بہت زیادہ تعریف نہ کرو جس طرح

عیسائی ابن مریم کی کرتے ہیں۔ مَیں صرف اللہ کا بندہ ہوں۔ پس تم صرف مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو۔

(بخاری - کتاب احادیث الانبیاء۔باب قول اللہ وذکر فی الکتب مریم.....)

تو فرمایا کہ مَیں تو ایک عاجز انسان ہوں، ایک بشر ہوں، اللہ کا بندہ ہوں۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کے ناطے، اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلتے ہوئے تم نے میری پیروی کرنی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری شریعت مجھ پر اُتاری ہے اور یہ کامل اور مکمل تعلیم بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خدا کے مقام کو بندے کے مقام سے نہ ملاؤ۔ اور عیسائیوں کی طرح نہ کرنا جنہوں نے ایک عاجز انسان کو جو خدا کا نبی تھا اور نبی بھی ایک محدود قوم کے لئے تھا، اس عاجز انسان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنالیا۔ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپؐ کی اطاعت خدا تعالیٰ کی اطاعت کے برابر ہے لیکن آپؐ نے امت کو یہی تلقین کی کہ اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میرا مقام بندگی سے بڑھ گیا ہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

''ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں کسی کامل انسان کا نمونہ موجود نہیں اور نہ آئندہ قیامت تک ہوسکتا ہے۔ پھر دیکھو کہ اقتداری معجزات کے ملنے پر بھی حضورؐ کے شامل حال ہمیشہ عبودیت ہی رہی اور بار بار اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف: 111) ہی فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ کلمہ توحید میں اپنی عبودیت کے اقرار کا ایک جزو لازم قرار دیا۔ جس کے بدوں مسلمان، مسلمان ہی نہیں ہوسکتا۔ سوچو اور پھر سوچو، پس جس حال میں ہادیٔ اکمل کی طرز زندگی ہم کو یہ سبق دے رہی ہے کہ اعلیٰ ترین مقام قرب پر بھی پہنچ کر عبودیت کے اعتراف کو ہاتھ سے نہیں دیا تو اور کسی کا تو ایسا خیال کرنا اور ایسی باتوں کا دل میں لانا ہی فضول اور عبث ہے''۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ 1897ء ص 140)

پھر روزمرہ کے معمولات ہیں ان میں بھی امت کی تربیت کے لئے کوئی موقع بھی آپؐ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے جس سے آپؐ کے بشر ہونے اور عاجز ہونے کا اظہار نہ ہوتا ہو۔

چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی مگر اس میں کچھ کمی بیشی ہو گئی۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو عرض کی گئی کہ کیا نماز میں کوئی نیا حکم نازل ہوا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو صحابہؓ نے عرض کی کہ آپؐ نے اتنی نماز پڑھائی ہے، کچھ کم یا زیادہ تھی۔ یہ سن کر آپؐ قبلہ رخ مڑ گئے اور دو سجدے کئے۔ سجدہ سہو کیا، پھر سلام پھیرا، پھر ہماری طرف چہرہ کر کے فرمایا کہ اگر نماز کے بارے میں کوئی نیا حکم نازل ہوتا تو مَیں تمہیں ضرور بتاتا لیکن مَیں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔ مَیں بھی بھولتا ہوں جس طرح کہ تم بھولتے ہو۔ پس جب مَیں بھول جاؤں تو مجھے یاد کروا دیا کرو۔ اور جب تم میں سے کسی کو نماز پڑھتے ہوئے شک گزرے کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تو چاہئے کہ وہ یقینی بات کو اختیار کرے اور پھر فرمایا کہ سجدہ سہو کر لیا کرو۔

(بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ - باب التوجہ نحو القبلۃ حیث کان)

پھر حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا تم لوگ اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے ہو اور مَیں بھی ایک بشر ہوں اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک اپنی دلیل پیش کرنے میں دوسرے سے زیادہ تیز ہو اور مَیں جو سنوں اس کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ پس جس کو مَیں اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دوں تو وہ اس کو نہ لے کیونکہ ایسی صورت میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں گا۔

(بخاری - کتاب الجہاد و السیر - باب حفر الخندق)

باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ آپؐ کامل انسان تھے اور ظاہر

ہے کہ کامل انسان کی فراست بھی ایک اعلیٰ درجہ پر پہنچی ہوئی فراست تھی۔ اور اس فراست سے بھی آپؐ جھوٹ اور سچ کا کچھ اندازہ لگا سکتے تھے لیکن ایک بشر ہونے کا احساس آپؐ کو اس قدر تھا، فرمایا کہ اگر مجھ سے اپنے حق میں غلط فیصلہ کرواؤ گے تو آگ کا ٹکڑا کھاؤ گے۔

آج کل دیکھ لیں ایک معمولی عقل والا انسان بھی ہو کوئی، اس کو فیصلے کا اختیار دیا جائے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ مجھے تمہاری باتوں سے اندازہ ہو گیا ہے۔ اتنی فراست مجھ میں ہے کہ میں سچ اور جھوٹ کو دیکھ لوں۔ لیکن آپؐ کا ایک بڑا محتاط طریقہ تھا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ آپؐ عاجزی اور انکسار کا کس طرح اظہار فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ کوئی شخص آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر حسن خلق کا مالک نہیں تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ صحابہؓ میں سے یا اہل بیت میں سے کسی نے آپؐ کو بلایا ہو اور آپ نے اس کو 'لبیک' یا 'حاضر ہوں' کہہ کر جواب نہ دیا ہو۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اسی وجہ سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:5) کہ تو خلق عظیم پر فائز کیا گیا ہے۔ تو دیکھیں بادشاہِ دو جہان اللہ کا سب سے پیارا، آخری نبی لیکن عاجزی کی یہ انتہا کہ ہر بلانے والے کو ایک عام آدمی کی طرح جواب دے رہے ہیں کہ مَیں حاضر ہوں۔ بلکہ عام آدمی سے بھی بڑھ کر عاجزی دکھاتے ہوئے۔

پھر حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کو ہم نے دیکھا کہ حضورؐ اپنی سوٹی کو ٹیکتے ہوئے ہماری طرف آ رہے ہیں۔ ہم حضور کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں بیٹھے رہو اور دیکھو جس انداز میں عجمی ایک

دوسرے کے احترام کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تم ایسے نہ کھڑے ہوا کرو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مَیں تو اللہ کا صرف ایک بندہ ہوں۔ اس کے دوسرے بندوں کی طرح مَیں بھی کھاتا پیتا ہوں اور انہیں کی طرح اٹھتا بیٹھتا ہوں۔

(الشفاء لقاضی عیاض - الباب الثانی - الفصل التاسع عشر - باب تواضعه ﷺ)

پھر حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ آپؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب کسی کی طرف رخ پھیرتے تو پورا رخ پھیرتے۔ نظر ہمیشہ نیچی رہتی۔ یوں لگتا جیسے فضا کی نسبت زمین کی طرف آپ ﷺ کی نظر زیادہ پڑتی ہے۔ آپ ﷺ اکثر نیم وا آنکھوں سے دیکھتے، اپنے صحابہؓ کے پیچھے پیچھے چلتے اور جب کبھی خاص جگہوں پہ جانا ہوتا تو ان کا خیال رکھتے۔ ہر ملنے والے کو سلام میں پہل کرتے۔

(شمائل ترمذی باب خلق رسول اللہ ﷺ)

اور آپ ﷺ کا یہ صحابہؓ کے ساتھ اس طرح گھل مل کر بیٹھنا اور کوئی تخصیص نہ ہونا بعض نئے آنے والوں کو مشکل میں ڈال دیتا تھا۔ جو آپ ﷺ کو جانتے نہ تھے ان کے لئے آپ ﷺ کو پہچاننا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔

چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر جب مدینہ میں ورود فرما ہوئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ کی شدت تھی۔ آنحضور ﷺ ایک درخت کے سائے میں تشریف فرما ہوئے۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے جو آپ ﷺ کے ہم عمر ہی تھے۔ اہل مدینہ بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے اکثر نے آپ ﷺ کو اس سے قبل نہ دیکھا تھا۔ لوگ آپ ﷺ کے پاس آنے لگے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وجہ سے آپ ﷺ کو نہ پہچانتے تھے۔ پہچاننا مشکل ہو گیا۔ تو آپ ﷺ اس قدر عاجزی اور سادگی کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ سب لوگ حضرت ابوبکرؓ کو ہی سمجھنے لگے کہ وہ ہی نبی ہیں،

رسول خدا ہیں۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ محسوس کیا تو کھڑے ہو گئے اور حضور ﷺ پر اپنی چادر سے سایہ کرنے لگے جس سے لوگوں نے جان لیا کہ رسول اللہ ﷺ کون ہیں۔

(السیرۃ النبویۃ لابن ہشام - منازل المہاجرین بالمدینۃ - باب قدومہ ﷺ قباء)

پھر آپؐ کی انتہائی عاجزی کا ایک اور روایت میں یوں ذکر آتا ہے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آکر آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: اے محمد! ﷺ، اے ہم میں سے سب سے بہترین اور اے ہم میں سے بہترین لوگوں کی اولاد، اور اے ہمارے سردار اور ہمارے سرداروں کی اولاد!۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا کہ دیکھو تم اپنی اصل بات کہو اور شیطان کہیں تمہاری پناہ نہ لے۔ مَیں محمد بن عبداللہ ہوں اور اللہ کا رسول ہوں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ تم لوگ میرا مقام اس سے بڑھا چڑھا کر بتاؤ جو اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ یہ ساری باتیں جو آنے والے نے کہی تھیں سچ تھیں ایک بھی غلط نہیں تھی لیکن آپؐ کی عاجزی نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس طرح کوئی آپؐ کی تعریف کرے۔ فوراً اسے ٹوک دیا۔ کسی دنیاوی بادشاہ کے دربار میں جائیں بلکہ کسی عام امیر آدمی کے پاس ہی چلے جائیں تو جب تک اس کی تعریف نہ کریں وہ آپ کی بات سننا نہیں چاہتا۔ اکثر یہی ہوتا ہے اور وہ بھی جھوٹی تعریفیں ہوتی ہیں، مبالغہ سے پُر ہوتی ہیں۔ لیکن آپؐ کے بارے میں حقیقت بیان کی جا رہی ہے اس کو بھی آپ کہہ رہے ہیں کہ نہیں اس طرح بیان نہ کرو۔ پھر باوجود اس کے کہ آپؐ کو اپنے اعلیٰ مقام کا خوب خوب علم تھا لیکن عاجزی کا اظہار اس سے بڑھ کر تھا۔

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مَیں بنی آدم کا سردار ہوں مگر اس میں کوئی فخر کی بات نہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے مجھ سے زمین کو پھاڑا جائے گا۔ مگر اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔ قیامت کے دن مَیں

سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا۔ اور سب سے پہلا ہوں گا جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ لیکن وَلَافَخْرَ اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔ اور قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی فخر نہیں۔

(ابن ماجہ - کتاب الزھد - باب ذکر الشفاعۃ)

پھر سفروں یا جنگوں وغیرہ پر جاتے ہوئے بھی سواریوں کی کمی کی وجہ سے جو سلوک دوسرے قافلے والوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا آپؐ اپنے لئے بھی وہی پسند فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر جب آنحضور ﷺ جنگ کے لئے تشریف لے گئے تو صرف ستّر سواریاں تھیں اور تمام صحابہؓ ان پر سوار نہ ہو سکتے تھے چنانچہ تین تین اور چار چار صحابہؓ باری باری ایک ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ آنحضور ﷺ کے لئے بھی کوئی الگ اونٹ نہ تھا۔ آپؐ اور حضرت علیؓ اور مرثد بن ابی مرثدؓ، ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔

(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام - غزوۃ بدر الکبری عدد ابل المسلمین)

اور باوجود اصرار کے بھی آپؐ نہیں مانا کرتے تھے کہ نہیں اسی طرح باری کے حساب سے ہم بیٹھیں گے۔

پھر ایک روایت میں آتا ہے عبداللہؓ بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ کہیں تشریف لے جارہے تھے۔ آپؐ کے لئے کپڑے کا سایہ کیا گیا۔ جب آپؐ نے سایہ دیکھا اور سر اوپر اٹھایا اور دیکھا آپؐ کو کپڑے سے سایہ کیا جارہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا رہنے دو۔ کپڑا لے کر رکھ دیا اور فرمانے لگے مَیں بھی تمہاری طرح کا انسان ہوں۔

(مجمع الزوائد للھیثمی کتاب علامات النبوۃ باب فی تواضعہ ﷺ)

پھر ایک روایت میں ایک سفر کا حال یوں بیان ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے کچھ صحابہ کے ساتھ سفر پر تھے۔ راستہ میں کھانا تیار کرنے کا وقت آیا تو ہر ایک نے اپنے اپنے ذمے کچھ کام لئے۔ کسی نے بکری ذبح کرنے کا کام لیا تو کسی نے کھال اتارنے کا، اور کسی نے اسے پکانے کی ذمہ داری لی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا مَیں جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لاؤں گا۔ صحابہ نے عرض کیا حضور! ہم کام کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آپؐ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا مَیں جانتا ہوں لیکن مَیں امتیاز پسند نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو ناپسند کرتا ہے جو اپنے ساتھیوں میں امتیازی شان کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہو۔

پھر باوجود اس کے کہ بعض کاموں کے لئے کارندے مقرر کئے ہوئے تھے لیکن آپ کے پاس وقت ہوتا تھا تو وہ کام خود بھی کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے۔ عبداللہ بن طلحہؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ مجھ سے انس بن مالکؓ نے کہا کہ صبح کے وقت میں ابوطلحہ کے ساتھ اس کے نومولود بیٹے کو گھٹی دلوانے کے لئے حضور ﷺ کے پاس گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ اس وقت حضور ﷺ کے ہاتھ میں اونٹ داغنے کا آلہ تھا اور آپ ﷺ زکوٰۃ کے اونٹوں کو نشان لگا رہے تھے۔ جو زکوٰۃ میں بیت المال کے پاس اونٹ آئے تھے ان کو نشان لگا رہے تھے۔

(بخاری - کتاب الزکاۃ - باب وسم الامام ابل الصدقۃ)

آپؐ اس انتظار میں نہیں رہے کہ بیت المال کے اونٹ ہیں جن لوگوں کے سپرد یہ کام کیا ہوا ہے وہ خود آ کر یہ کام کر لیں گے۔ بلکہ جب دیکھا کہ وقت ہے تو ایک عام کارکن کی طرح خود ہی یہ کام سرانجام دینے لگے۔

پھر گھر کے کام کاج بھی آپؐ ایک عام آدمی کی طرح کیا کرتے تھے۔ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے اور یہی آپؐ فرماتے تھے کہ مَیں تو محض ایک انسان ہوں اور عام

انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہوں اور اٹھتا بیٹھتا ہوں اور اس لئے مَیں کام بھی کرتا ہوں۔

پھر ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے گھر میں، اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھریلو کام کاج میں مدد فرماتے تھے۔ آپؐ کپڑے خود دھو لیتے تھے۔ گھر میں جھاڑو بھی دے لیا کرتے تھے۔ خود اونٹ کو باندھتے تھے۔ اپنے پانی لانے والے جانور اونٹ وغیرہ کو خود چارہ ڈالتے تھے۔ بکری خود دوہتے تھے، اپنے ذاتی کام بھی خود کر لیتے تھے۔ خادم سے کوئی کام لیتے تو اس میں اس کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ مل کر آٹا بھی گوندھ لیتے۔ بازار سے اپنا سامان خود اٹھا کر لاتے۔

(تلخیص از مسند احمد بن حنبل جلد 6 صفحہ 121 و اسد الغابۃ ذکر محمدؐ ذکر جمل من اخلاقہ ومعجزاتہ ﷺ، مشکوۃ المصابیح - کتاب الفضائل - باب فی اخلاقہ وشمائلہ ﷺ)

اب جو گھر میں کام ہو رہے ہیں وہ تو کسی کو باہر نظر نہیں آ رہے لیکن بازار سے جب سامان لا رہے ہیں کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ خود اپنی چیزیں بازار سے اٹھا کر لاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ یہ اس معاشرے میں جہاں بڑائی کا بہت زیادہ اظہار ہوتا تھا اس معاشرے میں یہ ایک عجیب چیز تھی۔ کبھی بھی آپؐ کو اس جھوٹی عزت کی پرواہ نہیں تھی۔

پھر حضرت ابو مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ اس سے مخاطب ہوئے تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو سنبھالو مَیں کوئی بادشاہ نہیں بلکہ ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔

(ابن ماجہ - کتاب الأطعمۃ - باب القدید)

تو اپنی عاجزی کا اظہار فرمایا۔ آپؐ کو یہ برداشت نہ تھا کہ کوئی آپؐ کو ایک عام انسان سے زیادہ سمجھے۔ یہ تو دنیاداروں کی نشانی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بڑا سمجھتے ہیں اور یہ ذہنیت اس تکبر کی وجہ سے ہوتی ہے جو ایک دنیا دار کے ذہن میں ہوتا ہے اور آپؐ جو عاجزی کے اعلیٰ ترین خلق پر قائم تھے کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی آپؐ سے اس طرح خوفزدہ ہو جس طرح متکبر بادشاہ سے لوگ خوفزدہ ہوتے ہیں۔

اس بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس واقعے کا یوں ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''دیکھو ہمارے نبی کریم ﷺ کی کامیابیاں اگرچہ ایسی تھیں کہ تمام انبیائے سابقین میں اس کی نظیر نہیں ملتی مگر آپ کو خدا تعالیٰ نے جیسی جیسی کامیابیاں عطا کیں آپؐ اتنی ہی فروتنی اختیار کرتے گئے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص آپؐ کے حضور پکڑ کر لایا گیا۔ آپؐ نے دیکھا تو وہ بہت کانپتا تھا اور خوف کھاتا تھا۔ مگر جب وہ قریب آیا تو آپؐ نے نہایت نرمی اور لطف سے دریافت فرمایا کہ تم ایسے ڈرتے کیوں ہو؟ آخر میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہی ہوں اور ایک بڑھیا کا فرزند ہوں''۔

(ملفوظات جلد 5ص 548)

پھر معاشرے کے دھتکارے ہوئے طبقے، غریب لوگ بلکہ ذہنی طور پر کمزور لوگوں کے لئے بھی آپؐ انتہائی عاجزی سے ان کا خیال کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ عزت اور احترام سے پیش آیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک مجلس میں اپنے صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا، حضورؐ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ مجھے آپؐ سے کچھ کام ہے۔ لیکن آپؐ سے

ان لوگوں کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی میرے ساتھ آ کر علیحدگی میں سنیں۔ حضورؐ نے اس کی بات سن کر فرمایا کہ اے فلاں! تو مدینہ کے راستوں میں سے جس راستے پر تو چاہے میں وہاں تیرے ساتھ جاؤں گا۔ وہاں بیٹھ کر تیری بات سنوں گا اور جب تک تیری بات سن کر تیری ضرورت پوری نہ کردوں وہاں سے نہیں ہٹوں گا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کی بات سن کر وہ حضورؐ کو ایک راستہ پر لے گئی۔ وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ حضور بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور جب تک اس کی بات سن کر اس کا کام نہ کر دیا حضور وہیں بیٹھے رہے۔

(مسلم - کتاب الفضائل - باب قربة من الناس......)

اب یہ نہیں کہ بے عقل ہے، غریب ہے، چھوڑ دیا بلکہ اس سے بھی انتہائی عاجزی سے پیش آئے۔

پھر ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ: ”خالی شیخیوں سے اور بے جا تکبر اور بڑائی سے پرہیز کرنا چاہئے اور انکساری اور تواضع اختیار کرنی چاہئے۔ دیکھو آنحضرت ﷺ جو کہ حقیقتاً سب سے بڑے اور مستحق بزرگی تھے ان کے انکسار اور تواضع کا ایک نمونہ قرآن شریف میں موجود ہے۔ لکھا ہے کہ ایک اندھا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر قرآن شریف پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن آپؐ کے پاس عمائد مکہ اور رؤسائے شہر جمع تھے اور آپؐ ان سے گفتگو میں مشغول تھے۔ باتوں میں مصروفیت کی وجہ سے کچھ دیر ہو جانے سے وہ نابینا اٹھ کر چلا گیا۔ یہ ایک معمولی بات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق سورۃ نازل فرما دی۔ اس پر آنحضرت ﷺ اس کے گھر میں گئے اور اسے ساتھ لا کر اپنی چادر مبارک بچھا کر بٹھایا۔ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں عظمت الٰہی ہوتی ہے ان کو لازماً خاکسار اور متواضع بننا ہی پڑتا ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی بے نیازی

سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں''۔

(ملفوظات جلد 5صفحہ 611-612 )

پھر دیکھیں اس عاجزی کا ایک اور اعلیٰ نمونہ۔ آپؐ جن کے منہ سے نکلے ہوئے ہر کلمے کو خداتعالیٰ قبولیت کا شرف بخشتا تھا یہاں تک کہ آپؐ کو یہ دعا بھی کرنی پڑی کہ یااللہ! بعض دفعہ میں کسی کو مذاق میں یا ویسے ہی کوئی بات کہہ دیتا ہوں تو کہیں اس کی وجہ سے اس کو پکڑ میں نہ لے لینا بلکہ اس کے بد اثر سے اس کو محفوظ رکھنا۔ جس ہستی کا یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ میری اتنی سنتا ہے کہ عام کہی ہوئی بات سے بھی کوئی پکڑ میں نہ آ جائے تو اس کے باوجود وہ اپنے لئے کسی دوسرے کو دعا کے لئے کہے تو یہ عاجزی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے حضرت عمرؓ نے عمرہ پر جانے کے لئے اجازت چاہی تو آپ نے اجازت دے دی اور کمال انکسار سے فرمایا کہ اے میرے بھائی! ہمیں اپنی دعاؤں میں نہ بھولنا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے اس بات سے اتنی خوشی ہوئی کہ ساری دنیا بھی مل جاتی تو اتنی خوشی نہ ہو

(ابو داؤد -کتاب الوتر- باب الدعاء)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خوشی یقیناً اس بات سے بھی ہوئی ہوگی اور یقین ہوگا کہ آپؐ کے یہ فرمانے کے بعد میری دوسری بھی تمام دعائیں قبول ہو جائیں گی۔ کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کی دعاؤں کی قبولیت کی بھی یقیناً دعا کی ہوگی۔

پھر دیکھیں عاجزی کی انتہا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی۔ آپ کو خاتم النبیّین فرمایا ہے۔ تمام امتوں کی فلاح آپؐ کے ہاتھ پر اکٹھا ہونے میں رکھی ہے۔ لیکن جب ایک مسلمان اور یہودی کی لڑائی ہوتی ہے تو آپ مسلمان کو نصیحت کرتے ہیں، سرزنش کرتے ہیں۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی اور مسلمان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ مسلمان نے کہا اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی اور چن لیا۔ اس پر یہودی نے کہا اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام جہانوں پر فضیلت دی اور چن لیا۔ اس پر مسلمان نے ہاتھ اٹھایا اور یہودی کو تھپڑ دے مارا۔ یہودی شکایت لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور تمام واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا۔ آپؐ نے اس مسلمان کو بلا کر اس واقعہ کے بارے میں پوچھا اور تفصیل سن کر اس مسلمان پر ناراض ہوئے اور فرمایا لَا تُخَیِّرُوْنِیْ عَلٰی مُوْسٰی مجھے موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو۔

(بخاری -کتاب الخصومات -باب ما یذکر فی الاشخاص و الخصومة بین المسلم و الیهود)

پھر دیکھیں اللہ تعالیٰ کے خوف اور عاجزی کی ایک اور مثال۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی (اپنے اعمال کی وجہ سے نجات نہ پائے گا)۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ بھی؟ فرمایا: ہاں مَیں بھی اپنے اعمال کی وجہ سے نجات نہیں پاؤں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سائے میں لے لے گا۔ (یعنی اس کی رحمت کے نتیجہ میں مجھے نجات ملے گی)۔ پس تم سیدھے رہو اور (شریعت کے) قریب رہو اور صبح و شام اور رات کے اوقات میں (عبادت کے لئے) نکلو اور میانہ روی اختیار کرو اور میانہ روی اختیار کرو تو تم اپنی مراد کو پہنچ جاؤ گے"۔

(بخاری -کتاب الرقاق -باب القصد و المداومة علی العمل)

دیکھیں جس نبی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اس نبی کی بیعت بھی خدا تعالیٰ کی بیعت ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہا کہ میرے سے وہ کام ہو ہی نہیں سکتے جو

خدا تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہوں بلکہ اپنی بشریت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فرما رہے ہیں کہ مجھے بھی اپنے اعمال کی وجہ سے کچھ نہیں ملے گا بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کی وجہ سے ملے گا۔

ایک اور موقع پر اپنے عزیزوں کو اور اپنی بیٹی فاطمہ کو کہا کہ تم لوگ یہ نہ سمجھنا کہ میرے ساتھ تعلق، میرے ساتھ پیار یا محبت یا میرا تم سے پیار یا محبت تمہیں بخش دے گا، تمہاری بخشش کے سامان پیدا کر دے گا۔ فرمایا کہ بلکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کا فضل حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ کبھی نہ سمجھنا کہ خدا تعالیٰ تم سے اس لئے درگزر فرمائے گا کہ تم رسول کی بیٹی ہو (فاطمہؓ کو فرمایا تھا)۔ باوجود اس کے کہ آپؐ کو شفاعت کا حق دیا گیا تھا۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے فاطمہ! میری لاڈلی بیٹی تیرے تھوڑے عمل بھی ہوں گے تو مَیں اللہ تعالیٰ کے حضور تیری شفاعت کروں گا تو بخش دی جائے گی۔ فرمایا میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پس اس کا فضل اور رحم ہر وقت مانگنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ مجھے بھی اس کے رحم کی چادر نے ہی لپیٹنا ہے۔

پھر دیکھیں عاجزی کا وہ نظارہ جہاں اگر کوئی اور ہو تو فخر سے سر اونچا ہو اور چہرے سے رعونت ٹپکتی ہو، تکبر ہو۔ فتح حاصل کر لینے کے بعد دشمن کے بچوں اور بوڑھوں کو بھی چیونٹیوں کی طرح کچل دیا جاتا ہے لیکن جس شان اور طاقت سے آپؐ نے مکہ فتح کیا اس وقت آپؐ کے دل کی جو کیفیت تھی اس کا اظہار بھی بے اختیار آپؐ کے عمل سے ہو گیا۔ اس عمل کا نقشہ تاریخ نے یوں کھینچا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب دس ہزار قدوسیوں کے جلو میں فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے وہ دن آپ کے لئے بہت خوشی اور مسرت اور عظمت کے اظہار کا دن تھا۔ مگر حضور ﷺ خدا کے ان فضلوں کے اظہار پر خدا کی راہ میں بچھے جاتے تھے۔ خدا نے جتنا بلند کیا آپ انکساری میں اور بڑھتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ کا سر

جھکتے جھکتے اونٹ کے کجاوے سے جا لگا۔ جس کجاوہ پر بیٹھے ہوئے تھے اس کے آگے ابھرے ہوئے حصے سے جا لگا اور اللہ تعالیٰ کے نشانوں پر اس کی حمد وثنا میں مشغول تھے۔

(السیرۃ النبویۃ لابن ھشام - ذکر فتح مکۃ - باب وصول النبی الی ذی طوی)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بارے میں فرماتے ہیں:۔

''عُلُــو جو خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کو دیا جاتا ہے'' یعنی بلندی اور اعلیٰ مقام ''وہ انکسار کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور شیطان کا عُلُو استکبار سے ملا ہوا تھا'' یعنی شیطان کی بلندی تکبر میں ہوتی ہے۔ ''دیکھو ہمارے نبی کریم ﷺ نے جب مکّہ کو فتح کیا تو آپؐ نے اسی طرح اپنا سر جھکایا اور سجدہ کیا جس طرح ان مصائب اور مشکلات کے دنوں میں جھکاتے اور سجدے کرتے تھے جب اسی مکّہ میں آپؐ کی ہر طرح سے مخالفت کی جاتی اور دکھ دیا جاتا تھا جب آپؐ نے دیکھا کہ میں کس حالت میں یہاں سے گیا تھا اور کس حالت میں اب آیا ہوں تو آپؐ کا دل خدا کے شکر سے بھر گیا اور آپ نے سجدہ کیا''۔

(ملفوظات جلد 2 صفحہ 404 حاشیہ)

پس یہ ہے عاجزی کی وہ اعلیٰ ترین مثال جو طاقت و فتح حاصل کر لینے کے بعد آپؐ نے دکھائی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے بھی آپؐ کی اس عاجزی کو کس طرح انعامات سے نوازا۔

ایک روایت میں آتا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اسرافیل نے رسول کریم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس تواضع کی بدولت جو آپؐ نے اس کے لئے اختیار کی یہ انعام عطا کیا ہے کہ آپؐ قیامت کے روز تمام بنی آدم کے سردار ہوں گے۔ سب سے اول حشر بھی آپؐ کا ہو

گا۔سب سے پہلے شفیع بھی آپؐ ہوں گے۔

(کتاب الشفاء للقاضی عیاض- الباب الثانی - الفصل التاسع عشر -تواضعه ﷺ)

حجۃ الوداع کے موقع پر جو آپؐ نے دعا کی اس کے الفاظ یہ تھے۔اے اللہ! تو میری باتوں کوسنتا ہے اور میرے حال کو دیکھتا ہے۔میری پوشیدہ باتوں اور ظاہر امور سے خوب واقف ہے۔ میرا کوئی بھی معاملہ تجھ پر کچھ بھی تو مخفی نہیں ہے مَیں ایک بدحال فقیر اور محتاج ہی تو ہوں۔ تیری مدد اور پناہ کا طالب ہوں،سہا اور ڈرایا ہوا،اپنے گناہوں کا اقراری اور معترف ہو کر تیرے پاس چلا آیا ہوں۔مَیں تجھ سے ایک عاجز مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں۔ ہاں تیرے حضور میں ایک ذلیل گناہگار کی طرح زاری کرتا ہوں۔ایک اندھے نابینے کی طرح ٹھوکروں سے خوفزدہ تجھ سے دعا کرتا ہوں۔میری گردن تیرے آگے جھکی ہوئی ہے اور میرے آنسو تیرے حضور بہہ رہے ہیں۔میرا جسم تیرا مطیع ہو کر سجدے میں گرا پڑا ہے اور ناک خاک آلود ہے۔اے اللہ تو مجھے اپنے حضور دعا کرنے میں بدبخت نہ ٹھہرا دینا اور میرے ساتھ مہربانی اور رحم کا سلوک فرمانا۔اے وہ جو سب سے بڑھ کر التجاؤں کو قبول کرتا ہے اور سب سے بہتر عطا فرمانے والا ہے۔

(مجمع الزوائد للهیثمی - کتاب الحج - باب فی العرفة و الوقوف بها)

دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنی تسلیاں اور انعامات ملنے کے باوجود قرآن کریم میں کئی جگہ ان کا ذکر ہے۔اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ مَیں ہوں تو اللہ کا ایک بندہ ہی۔ ہوں تو ایک بشر ہی اس لئے آخر تک اس عاجزی کے ساتھ اپنے خدا سے اس کا رحم اور فضل مانگتے رہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

''خدا کی رضا میں فانی لوگ نہیں چاہتے کہ ان کو کوئی درجہ اور امامت دی

جاوے۔ وہ ان درجات کی نسبت گوشہ نشینی اور تنہا عبادت کے مزے لینے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر ان کو خدا تعالیٰ کشاں کشاں خلق کی بہتری کے لئے ظاہر کرتا اور مبعوث فرماتا ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ بھی تو غار میں ہی رہا کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کسی کو پتہ بھی ہو۔ آخر خدا نے ان کو باہر نکالا اور دنیا کی ہدایت کا بار ان کے سپرد کیا۔ آنحضرت ﷺ کے پاس ہزاروں شاعر آتے اور آپؐ کی تعریف میں شعر کہتے تھے مگر لعنتی ہے وہ دل جو خیال کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کی تعریفوں سے پھولتے تھے۔ وہ ان کو مُردہ کیڑے کی طرح خیال کرتے تھے۔ مدح وہی ہوتی ہے جو خدا آسمان سے کرے۔ یہ لوگ محبت ذاتی میں غرق ہوتے ہیں۔ ان کو دنیا کی مدح وثنا کی پروا نہیں ہوتی۔ تو یہ مقام ایسا ہوتا ہے کہ خدا آسمان اور عرش سے ان کی تعریف اور مدح کرتا ہے۔

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 187 جدید ایڈیشن)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

(خطبات مسرور جلد 3 صفحہ 143-158)

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے مورخہ 25 ستمبر 2009ء کو عبادالرحمٰن کی صفات پر ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا۔ حضور انور ایدہ اللہ نے سورۃ الفرقان کی آیات 64 تا 69 اور 73 تا 77 کی تلاوت کی اور اس کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد فرمایا

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بعض خصوصیات اور علامتیں بتائی ہیں جن کو اختیار کر کے یا جن پر عمل کر کے انسان عبادالرحمٰن کہلا سکتا ہے۔

یہ آیات جو مَیں نے تلاوت کی ہیں ان میں یہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں جیسا کہ آپ نے سنا۔ جن میں ذاتی ذمہ داریوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، معاشرتی ذمہ داریوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور خدا تعالیٰ کا حق ادا کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اگر ان کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو عبادالرحمٰن کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے اپنی رضا کی خوشخبری دیتا ہے، اپنی جنتوں کی خوشخبری دیتا ہے......

پہلی خصوصیت ان عبادالرحمٰن کی یہ ہے کہ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا یعنی زمین پر عاجزی اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہر فیصلہ ان کا اعتدال پر ہوتا ہے۔ بلا وجہ کی سختی اور غصّہ ان کی طبیعت میں نہیں ہوتا جو کہ پھر بعض اوقات تکبّر تک لے جاتا ہے۔ اور بلا وجہ کا ٹھہراؤ بھی ان کی طبیعت میں نہیں ہوتا کہ ان سے بے غیرتی اور مداہنت کا اظہار ہوتا ہو۔ یہ خصوصیت جو بیان کی گئی ہے صرف انفرادی نہیں ہے بلکہ جماعتی طور پر بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ من حیث الجماعت بھی اللہ تعالیٰ کے بندے اور

اس کے عبادت گزار بنتے ہوئے یہ خصوصیات پیدا کرو۔ اور پھر اس میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ جو عبادالرحمٰن ہیں ان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے غلبہ بھی ملے گا۔ اور جب غلبہ کی صورت ہو تو اس وقت تکبر پیدا نہ ہو۔ اُس وقت پُرانے بدلے لینے کی طرف توجہ نہ ہو۔ اُس وقت خدا کو بھولنے والے نہ کہیں بن جانا۔ بلکہ تمہیں عاجزی، انکسار اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنے والا ہونا چاہئے۔

دوسری خصوصیت یہ کہ خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا یہ اس بات کا ایک طرح سے اعادہ کیا گیا ہے کہ ایک تو انفرادی خصوصیت ہر اللہ کے بندے میں ہونی چاہئے کہ لڑائی جھگڑوں سے بچتے ہوئے ہر سختی کرنے والے اور جھگڑنے والے کو نرمی سے سمجھاؤ اور دوسری یہ کہ جو عاجزی تم نے اللہ تعالیٰ کے پہلے حکم کے تحت حاصل کر لی، پھر اسی طرح جماعتی طور پر جو وقار تم نے اپنے معاشرے میں، اپنے علاقے میں قائم کر لیا، جب طاقت بھی تمہارے پاس آ جائے گی تو پھر بھی اس کو یاد رکھنا۔ شیطان نے اپنا کام کئے چلے جانا ہے۔ تمہارے خلاف مختلف طریقوں سے ایسے محاذ کھڑے کئے جائیں گے کہ جس سے تمہارے جذبات کو بھڑکایا جائے گا اور پھر یہ کہا جائے گا کہ دیکھو یہ کتنے ظلم کرنے والے لوگ ہیں۔ ایسے میں اپنے جذبات کو کنٹرول رکھنا۔ اُن مثالوں کو قائم رکھنا، اُس اسوہ کو قائم رکھنا جو ہمارے سامنے آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ نے پیش فرمایا۔ گویا اس میں بھی جماعتی طور پر آئندہ حالات بہتر ہونے کی پیشگوئی ہے۔

لیکن اِس وقت بعض ملکوں اور خاص طور پر پاکستان میں ایسی صورتحال ہے کہ احمدیوں کو تنگ کیا جاتا ہے۔ ان کے جذبات انگیخت کئے جاتے ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح احمدی اس قسم کی حرکتوں پر جو مخالفین کی طرف سے ہو رہی ہیں، قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں اور پھر قانون کا بہانہ بنا کر احمدیوں کو سختی اور ظلم کا نشانہ بنایا

جائے۔تو فرمایا ان شیطانی تدبیروں کے مقابلہ پر رحمان کے بندے بنتے ہوئے، قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے تو کارروائی کرو لیکن گند کا جواب گند سے نہ دو کہ اس سے بھی بعض مسائل دوسرے احمدیوں کے لئے بھی اور جماعتوں کے لئے بھی کھڑے ہو سکتے ہیں۔

پس آجکل کے حالات کے حوالے سے مَیں احمدیوں کو کہوں گا کہ ایسے عبادالرحمٰن بننے کی کوشش کریں جو خدا تعالیٰ کی رضا سے حصہ پانے والے ہوں اور جیسا کہ مَیں نے کہا اللہ تعالیٰ نے اس میں پیشگوئی بھی رکھی ہے کہ من حیث الجماعت تمہارا ہاتھ ایک وقت میں اوپر ہو جائے گا انشاءاللہ تعالیٰ تو اُس وقت تم دنیا کو بتانا کہ انصاف کیا ہوتا ہے اور طاقت رکھتے ہوئے بھی دوسرے کے جذبات کا احساس کرنا اور اپنے جذبات کو کنٹرول کرنا کیا ہوتا ہے۔

آجکل پاکستان میں خاص طور پر مختلف طریقوں سے مخالفین کی یہ کوشش ہے کہ احمدی کسی طرح بھڑکیں اور ان کو نقصان پہنچانے کی جس حد تک ان کی کوشش ہو سکتی ہے کی جارہی ہے۔مختلف جگہوں پر منصوبے بنائے جارہے ہیں۔اس لئے بڑی احتیاط سے، بڑے محتاط طریقہ سے اس سب صورتحال کا سامنا کریں اور صبر اور دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے ان حالات کا مقابلہ کریں۔

رحمٰن خدا کے بندوں کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''رحمٰن کے حقیقی پرستار وہ لوگ ہیں کہ جو زمین پر بُردباری سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے سخت کلامی سے پیش آئیں تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے ان کا معاوضہ کرتے ہیں''۔ ہمارا واسطہ انتہائی جاہل لوگوں سے ہے اور اس کے لئے اپنے جذبات کو بہت زیادہ کنٹرول کرتے ہوئے سلامتی اور رحمت کا طریق

اختیار کرنے کا اظہار کرنا ہے۔ فرمایا کہ: ”بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دعا دیتے ہیں اور تشبہ باخلاق رحمانی کرتے ہیں کیونکہ رحمٰن بھی بغیر تفریق نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بے شمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمٰن کا لفظ خدا پر بولا جاتا ہے کہ اس کی رحمتِ وسیع عام طور پر ہر یک بُرے بھلے پر محیط ہو رہی ہے“۔

(براہین احمدیہ۔روحانی خزائن جلد 1ص449حاشیہ)

پس آج بھی اور آئندہ بھی ہم نے ہر ایک بُرے بھلے، دوست دشمن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پرتَو بننے کی کوشش کرتے ہوئے، رحمت کا سلوک کرتے چلے جانا ہے۔ درگزر کا سلوک کرتے چلے جانا ہے اور دعاؤں سے اپنے لئے مدد مانگنی ہے اور دوسروں کی ہدایت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی ہے تا کہ ہم ہمیشہ عباد الرحمٰن میں شامل رہیں۔

پھر تیسری خصوصیت عباد الرحمٰن کی یہ بتائی کہ يَبِيتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا کہ اپنے ربّ کے لئے راتیں سجدے کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔

گزشتہ دنوں (رمضان میں) چند دن کے لئے ایک بہت بڑی تعداد نے اس پر عمل کیا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ عباد الرحمٰن چند دن گزارتے ہیں۔ بلکہ مستقل اپنی راتیں عبادت اور قیام میں گزارتے ہیں۔ سجدے اور قیام میں گزارتے ہیں۔ پس یہ ایک احمدی کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ دنیا کے تمام مسلمان ممالک میں احمدیوں کے لئے مصائب اور مشکلات کا دور ہے کہ احمدی نہ صرف اپنی فرض نمازوں کی طرف توجہ دیں بلکہ اپنی راتوں کو نوافل سے

سجائیں اور تہجد کی طرف توجہ دیں۔ کیونکہ راتوں کو اٹھنا نفس کو کچلنا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اگر ہم خالص ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور راتوں کو عبادت کرنے والے بنیں گے تو یہی چیز انشاء اللہ تعالیٰ جماعت کی مشکلات کے دُور کرنے کا باعث بنے گی۔ پس یہ مدنظر رہنا چاہئے کہ راتوں کو اٹھنا صرف ذاتی اغراض کے لئے نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور جماعتی ترقی کے لئے اور دعاؤں کے لئے ہو۔ اگر دنیا میں ہر احمدی خالص ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہوئے جماعتی ترقی کے لئے رات کے کم از کم دو نفل اپنے اوپر لازم کر لے تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم دیکھیں گے کہ کس طرح خدا تعالیٰ کی مدد پہلے سے بڑھ کر ہمارے شامل حال ہوتی ہے اور کس طرح اللہ تعالیٰ دشمن کی دشمنیاں اور مخالفین کی مخالفتیں ہوا میں اڑا دیتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نوافل کے ذریعہ مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ مَیں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

(صحیح بخاری ۔ کتاب الرقاق ۔ باب التواضع)

پس اللہ تعالیٰ نوافل ادا کرنے والوں اور تہجد ادا کرنے والوں کے اتنا قریب آ جاتا ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قرب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور رمضان گزرنے کا یہ مطلب نہیں کہ پھر اسی طرح راتوں کو ضائع کریں اور دیر تک فضول مجلسیں لگائی جائیں اور صبح کی نماز کے لئے اٹھنا مشکل ہو جائے۔ نہیں، بلکہ اُن راتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جو اللہ تعالیٰ کو قریب لانے والی ہوں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والی ہوں۔

رمضان نے جو ہمیں عبادالرحمٰن بننے کے اسلوب سکھائے ہیں ان پر عمل کرتے

ہوئے ہمارا یہ کام ہے کہ اپنی راتوں کو عبادتوں سے سجائے رکھیں۔ یہی چیز ہے جو ہمارے حق میں جیسا کہ مَیں نے کہا انشاء اللہ تعالیٰ جلد انقلاب لانے والی ہوگی۔

آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ نے اس کا حق ادا کیا اور دنیا نے دیکھا کہ وہ کیا انقلاب لائے۔ دن کو اگر ان کو مجبوری کی وجہ سے جنگ کرنی پڑتی تھی تو راتوں کو وہ آرام نہیں کرتے تھے بلکہ راتیں عبادتوں میں گزارتے تھے۔ جب تک مسلمانوں میں راتوں کی عبادت کا یہ طریق قائم رہا ان کی ترقی ہوتی رہی۔ آج یہ احمدی کی ذمہ داری ہے کہ اس پر عمل کرے۔ اور احمدیت اور اسلام کی ترقی کے لئے بہت زیادہ دعائیں کرے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:

''عرب اور دنیا کی حالت جب رسول اللہ ﷺ آئے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی لوگ تھے۔ کھانے پینے کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔ نہ حقوق العباد سے آشنا، نہ حقوق اللہ سے آگاہ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایک طرف ان کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (محمد:13) یعنی صرف ان کا کام کھانا پینا تھا اس طرح کھاتے تھے جس طرح جانور کھاتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا کہ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا کی حالت ہوگئی۔ یعنی اپنے ربّ کی یاد میں راتیں، سجدے اور قیام میں گزار دیتے تھے۔ اللہ اللہ، کس قدر فضیلت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سبب سے ایک بے نظیر انقلاب اور عظیم الشان تبدیلی واقع ہو گئی۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزان اعتدال پر قائم کر دیا اور مُردار خوار اور مُردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا۔ دو ہی خوبیاں ہوتی ہیں، علمی یا عملی۔ عملی حالت کا تو یہ حال ہے کہ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا اور علمی کا یہ حال ہے کہ اس قدر کثرت سے تصنیفات کا سلسلہ اور توسیع زبان کی خدمت کا سلسلہ

جاری ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی''۔

(الحکم جلد 2 نمبر 25-24 مورخہ 27-20 اگست 1898ص 10)

پھر آپؑ فرماتے ہیں کہ:''روحانیت اور پاکیزگی کے بغیر کوئی مذہب چل نہیں سکتا۔ قرآن شریف نے بتلایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پیشتر دنیا کی کیا حالت تھی یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (محمد:13)

پھر جب انہی لوگوں نے اسلام قبول کیا تو فرماتا ہے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا۔ جب تک آسمان سے تریاق نہ ملے تو دل درست نہیں رہتا۔ انسان آگے قدم رکھتا ہے مگر وہ پیچھے پڑتا ہے۔ قدسی صفات اور فطرت والا انسان ہو تو وہ مذہب چل سکتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی مذہب ترقی نہیں کر سکتا اور کرتا بھی ہے تو پھر قائم نہیں رہ سکتا''۔

(البدر جلد 2 نمبر 37 مورخہ 2 اکتوبر 1903)

پس ہم جو یہ خواہش رکھتے ہیں کہ جماعت کی جلد ترقی ہو۔ افراد جماعت کو جن مشکلات اور مصائب سے گزرنا پڑ رہا ہے وہ جلدی دُور ہوں تو جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا آسمانی تریاق کی ضرورت ہے۔ اور آسمانی تریاق اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق حاضر ہو کر مانگنے سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

پھر چوتھی خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ عبادالرحمٰن خدا تعالیٰ سے جہنم سے دوری کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اور جہنم سے دونوں جہنم مراد ہیں، اخروی جہنم بھی جو گناہوں کی پاداش میں ملے گی اور اس دنیا کی جہنم بھی جو بعض برے کاموں کے یا غلطیوں کے بدنتائج کی صورت میں ملتی ہے۔ پس عبادالرحمٰن کا کام ہے کہ ہر وقت توبہ اور استغفار کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ سے یہ

دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ دنیاوآخرت کی ذلتوں سے بچائے۔ ہر قسم کی دنیاوی مشکلات کی جہنم سے بچائے۔ دنیا کی چمک اور توجہات اور ترجیحات کا غلام نہ بنائے کہ یہ اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ سے دُور لے جا کر پھر اخروی جہنم میں پڑنے کا باعث بناتی ہیں۔ پھر یہ کہ اولاد کی طرف سے بھی ہماری فکریں دُور ہوں اور ان کی وجہ سے بھی ہم اپنے اندر دل میں بے چینی کی آگ میں نہ جلتے رہیں۔

پھر عبادالرحمٰن کی پانچویں خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ لَمْ یُسْرِفُوْا۔ اسراف نہیں کرتے، فضول خرچی نہیں کرتے۔ نہ ہی ذاتی اموال میں دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی جماعتی اموال کو بغیر سوچے سمجھے خرچ کرتے ہیں۔

ذاتی فضول خرچی کی ایک مثال ہمارے ہاں بہت عام ہوتی جارہی ہے اور وہ ہے شادی بیاہوں پر فضول خرچی۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی یہاں بھی اور پاکستان میں بھی کئی قسم کے کھانے پکوائے جاتے ہیں اور شادی کی دعوت ہوتی ہے۔ پھر ولیمہ کی دعوت ہوتی ہے۔ دعوت کرنا کوئی حرج نہیں۔ سادہ بھی کی جاسکتی ہے۔ پھر شادی سے پہلے مہندی کی دعوت کا بھی رواج پڑ گیا ہے جو لڑکی کے گھر والے شادی کی رونق لگانے کے بہانے کرتے ہیں۔ اس پر بھی بے تحاشا خرچ کیا جاتا ہے اور اس کے لئے بھی باقاعدہ کارڈ چھپوائے جاتے ہیں، تقسیم کئے جاتے ہیں اور دعوت دے کے بلایا جاتا ہے۔ مہندی کرنی ہے تو لڑکیاں یا اس دلہن کی جو سہیلیاں ہیں وہ جمع ہوں اور رونق لگا لیں لیکن اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی چلی جارہی ہے اور صرف دیکھا دیکھی۔

پھر ایک نئی رسم یہ پیدا ہوگئی ہے کہ لڑکے والے بھی شادی سے پہلے رونق لگانے کے نام پر دعوت کرنے لگ گئے ہیں اور مَیں نے دیکھا ہے کہ یہ غلط قسم کی جو رسم ہے بلکہ بدعت ہے اس میں اچھے بھلے دین کا علم رکھنے والے بھی شامل ہو گئے ہیں۔

اور پھر جو کسی وجہ سے اتنی زیادہ زیادہ دعوتیں نہ کرے (بہر حال ہمیں حسن ظن یہی رکھنا چاہئے کہ کسی نیکی کی وجہ سے) تو اس کے متعلق پھر باتیں کی جاتی ہیں کہ یہ کنجوس ہے، یہ فلاں ہے۔ خاص طور پر باہر کے ملکوں سے لوگ پاکستان جاتے ہیں تو وہ دعوتوں، زیور اور جوڑوں وغیرہ پر بے انتہا خرچ کرتے ہیں اور ہر ایک بڑھ بڑھ کر خرچ کر رہا ہوتا ہے۔ تو یہ سب اسراف ہے۔ یہی بچت جو ہے جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی کہا یہ غریبوں کے کام آ سکتی ہے۔ غریبوں کی شادیوں میں کام آ سکتی ہے۔ بہت ساری رقوم یتیموں کو پالنے کے کام آ سکتی ہیں اور دوسرے نیکی کے کاموں میں خرچ ہو سکتا ہے۔ اس طرح اگر بچت کرنے کا احساس پیدا ہو جائے تو یہی چیز ہے جو انسان کو عباد الرحمٰن بناتی ہے۔

پھر چھٹی چیز یہ بیان فرمائی کہ لَمْ یَقْتُرُوْا کہ بخل اور کنجوسی بھی نہیں کرتے۔ اور بعض لوگ کنجوسی کر کے جہاں جائز ضرورت ہے وہاں بھی خرچ نہیں کرتے۔ کنجوسی کی انتہا کر دیتے ہیں اور وہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ مال جوڑتے چلے جائیں۔ بعض لوگ تو اس حد تک کنجوس ہوتے ہیں کہ اپنی جو ذاتی جائز ضروریات ہیں ان پر بھی خرچ نہیں کرتے۔ نہ اپنے عزیزوں کی مدد کرتے ہیں، نہ غریبوں کے لئے کچھ دیتے ہیں۔ نہ ہی جماعت کے لئے قربانی کا مادہ ان میں ہوتا ہے۔ پس جو صاحب حیثیت ہوتے ہیں مال ہوتے ہوئے بھی خرچ نہ کریں تو وہ بھی عبادالرحمٰن میں شامل نہیں ہو سکتے۔ پس جہاں اللہ تعالیٰ نے اسراف کرنے والوں کو ناپسند فرمایا ہے اور عبادالرحمٰن سے اُنہیں باہر نکالا ہے وہاں بخل کرنے والوں کو بھی انتہائی ناپسند فرمایا ہے۔ ایک تو وہ جو خرچ ہے اس کا حق ادا نہیں کر رہا۔ دوسرے پیسے کو روک کر اور صرف جمع کر کے معاشرے کی ترقی میں بھی روک ڈالنے کا باعث بن رہا ہے۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ عبادالرحمٰن میں نہ حد سے زیادہ شاہ خرچی ہو اور دنیا دکھاوے کے لئے شاہ خرچی ہو

اور نہ ہی اتنی زیادہ کنجوسی کہ جائز ضرورت پر بھی خرچ نہ کریں۔ بلکہ اس کے بین بین رہنا چاہئے اور عبادالرحمٰن کا خرچ کرنا بھی اور خرچ سے رُکنا بھی خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہو۔

پھر ساتویں علامت یہ بتائی کہ عبادالرحمٰن شرک کے قریب بھی نہیں جاتے۔ شرک خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں لیکن شرک نہیں۔ عبادالرحمٰن کے ساتھ جو شرک کو مخصوص کیا گیا ہے تو یہ صرف ظاہری شرک نہیں کہ بتوں کی پوجا کی جائے بلکہ شرک خفی سے بھی بچتے ہیں۔ ان کی عبادتوں اور دوسرے حقوق کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق ہوتی ہے اور بڑی باریکی سے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی کوئی حرکت اور ان کا کوئی عمل کسی قسم کے شرک خفی کا باعث نہ بنے۔ انتہائی محتاط ہوتے ہیں۔ نہ ان کی ملازمتیں ان کی عبادتوں کے سامنے روک بن رہی ہوں۔ جیسا کہ مَیں نے گزشتہ جمعہ میں بیان کیا تھا کہ یہ بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے۔

پھر آٹھویں شرط یا خصوصیت عبادالرحمٰن کی یہ بتائی کہ کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے اگر جنگیں لڑیں اور صحابہؓ نے یا خلفاء نے، خلفاء راشدین نے بھی اور بعد میں مسلمانوں نے بھی تقویٰ پر قائم رہتے ہوئے اگر جنگیں لڑیں تو دشمن کے حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے اور اس کے ہاتھ کو ظلم سے روکنے کی وجہ سے جنگیں لڑیں اور کوشش یہ کی بلکہ آنحضرت ﷺ نے بھی، آپؐ کے خلفاء نے بھی حکم دیا کہ کوئی بچہ، کوئی عورت، کوئی مذہبی لیڈر، پادری راہب وغیرہ جو جنگ میں شامل نہیں اس کو قتل نہیں کرنا۔ لیکن اس کے مقابلہ پر ہم دیکھتے ہیں (کہ صرف) دوسری جنگ عظیم میں لاکھوں معصوم جاپانیوں کو قتل کر دیا گیا۔

آجکل بھی امن قائم کرنے کے بہانے جہازوں سے حملے کر کے معصوم

شہریوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن جو اپنے زُعم میں اپنے آپ کو عبادالرحمٰن سمجھتے ہیں وہ بھی خودکش حملے کر کے معصوم جانوں کا خون کر رہے ہیں۔ اسلام کے نام پر، مذہب کے نام پر جو خون ہو رہا ہے یہ ایک اَور دردناک اور بھیانک کہانی ہے۔ پس خداتعالیٰ کا ایسے لوگوں کے لئے فیصلہ یہ ہے کہ وہ کبھی عبادالرحمٰن نہیں ہو سکتے۔

پھر نویں خصوصیت یا علامت عبادالرحمٰن کی یہ ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ اس میں عملی زنا بھی شامل ہے اور گندے بیہودہ پروگرام اور نظارے دیکھ کر ان سے لطف اٹھانا بھی شامل ہے اور آجکل انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلز پر جو بعض ایسے پروگرام دیکھے جاتے ہیں یہ سب ذہنی اور نظری زنا میں شمار ہوتے ہیں۔ پس احمدی کو ان سے بھی خاص طور پر بچنا چاہئے۔

پھر دسویں خصوصیت یہ ہے کہ عبادالرحمٰن نہ جھوٹ بولتے ہیں، نہ جھوٹی گواہی دیتے ہیں۔ یہ جھوٹ بھی قوموں کے تنزل اور تباہی میں بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے بندے اور الٰہی جماعتیں جو ہیں انہوں نے تو اونچائی کی طرف جانا ہے اور ان سے تو اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے کہ ان کے لئے ترقی کی منازل ہیں جو انہوں نے طے کرنی ہیں اور اوپر سے اوپر چلتے چلے جانا ہے۔ اُن میں اگر جھوٹ آ جائے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے نہیں رہتے جن پر اللہ تعالیٰ فضل فرماتا ہے یا جن سے اللہ تعالیٰ نے فضل فرمانے کا وعدہ فرمایا ہوا ہے۔ پس احمدیوں کو اپنی گواہیوں میں بھی اور اپنے معاملات میں بھی جب پیش کرتے ہیں تو سو فیصد سچ سے کام لینا چاہئے۔ مثلاً عائلی معاملات ہیں۔ نکاح کے وقت اس گواہی کے ساتھ رشتہ جوڑنے کا عہد کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم قولِ سدید سے کام لیں گے۔ سچ سے کام لیں گے۔ ایسا سچ بولیں گے جس میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔ جس سے کوئی اور مطلب بھی اخذ نہ کیا جا

سکتا ہو۔صاف ستھری بات ہو۔لیکن شادی کے بعد لڑکی لڑکے سے غلط بیانی کرتی ہے اور لڑکا لڑکی سے غلط بیانی کرتا ہے۔دونوں کے سسرال والے ایک دوسرے سے غلط بیانی کر رہے ہوتے ہیں اور یوں ان رشتوں میں پھر دراڑیں پڑتی چلی جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ یہ ختم ہو جاتے ہیں۔صرف ذاتی اناؤں اور ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لئے گھر ٹوٹ رہے ہوتے ہیں۔اگر بچے ہو گئے ہیں تو وہ بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ پہلے بھی کئی مرتبہ مَیں اس بارہ میں کہہ چکا ہوں۔پس اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کے لئے بھی اور بندوں کے حق ادا کرنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ایک مومن کو، ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو عبادالرحمٰن میں شمار کرتے ہیں ہر قسم کے جھوٹ سے نفرت ہو۔

پھر گیارھویں علامت یہ ہے کہ مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا یعنی دنیوی لذات سے متاثر ہو کر اس میں شامل نہیں ہو جاتے۔اس زمانے کی لغویات جیسا کہ مَیں نے کہا ہے انٹرنیٹ بھی ہے، یہ ٹی وی چینلز بھی ہیں جو پروگراموں کے دکھانے میں، عجیب طرح کے غلط پروگراموں کے دکھانے میں مصروف ہیں۔پھر آجکل لڑکے لڑکیاں سکولوں میں، کالجوں میں، گروپ بنا کر پھرتے ہیں، کلبوں میں جاتے ہیں، پھر ڈانس گانے وغیرہ کئے جاتے ہیں۔یا اس کے پروگرام بنائے جا رہے ہوتے ہیں یا کنسرٹ دیکھنے کے پروگرام بنائے ہوتے ہیں۔تو ایک مومن کے لئے یہ سب لغویات ہیں۔ایک طرف تو ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور ہم عبادالرحمٰن بننے کا بھی عہد کرتے ہیں۔پھر اس کے باوجود لغویات میں شامل ہونا، ایسی باتوں میں شامل ہونا جو سراسر اخلاق کو برباد کرنے والی باتیں ہیں۔پس حقیقی احمدی کے لئے ضروری ہے کہ ان سے پرہیز کرے۔

پھر لغویات میں لڑائی جھگڑا وغیرہ بھی شامل ہے۔پہلے بھی اس کا تفصیل سے ذکر آ چکا ہے۔پھر کسی بھی قسم کی بات جو معاشرے کے امن کو برباد کرنے کا ذریعہ بنے

والی ہے، یہ سب لغویات ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:

''وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا ......اگر کوئی لغوبات کسی سے سنیں جو جنگ کا مقدمہ اورلڑائی کی ایک تمہید ہوتو بزرگانہ طور پرطرح دے کر چلے جاتے ہیں اورادنیٰ ادنیٰ بات پرلڑنا شروع نہیں کردیتے۔یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے اس وقت تک ہنگامہ پردازی کواچھانہیں سمجھتے اورصلح کاری کے محل شناسی کا یہی اصول ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کوخیال میں نہ لاویں اور معاف فرماویں۔اور لغو کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے سو واضح ہو کہ عربی زبان میں لغو اس حرکت کو کہتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی بکواس کرے یا بہ نیتِ ایذا ایسا فعل اس سے صادر ہو کہ دراصل اس سے کچھ ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا۔سوصلح کاری کی یہ علامت ہے کہ ایسی بیہودہ ایذا سے چشم پوشی فرماویں اور بزرگانہ سیرت عمل میں لاویں''۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ،روحانی خزائن جلد 10ص 349)

پھر بارہویں علامت یہ ہے کہ جب اُن کے سامنے خداتعالیٰ کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو بہرے اور اندھے ہو کرنہیں گرتے بلکہ کان کھول کر توجہ سے سنتے ہیں۔قرآن کریم کے حوالے سے جو نصائح کی جائیں ان پرعمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اپنی روحانیت کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔پس عبادالرحمٰن بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر قسم کی نیک نصیحت پرعمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ نہ دیکھیں کہ کون کہہ رہا ہے۔ یہ دیکھیں کہ جو بات اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کے حوالے سے کی جارہی ہے اس پرعمل کرنا ہے۔ ورنہ عمل نہ کرنا انسان کے لئے ٹھوکر کا باعث بن سکتا ہے۔اور پھر نہ صرف یہ کہ عبادالرحمٰن کے زُمرے سے نکل جاتے ہیں بلکہ آہستہ آہستہ جماعت سے بھی دُور ہوجاتے ہیں۔

پھر تیرہویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بیویوں اور اولادوں کے لئے یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک رکھے۔ پس آئندہ نسلوں کی بقا کے لئے یہ نہایت اہم نسخہ ہے کہ جہاں ظاہری تدبیریں اور کوششیں ہو رہی ہیں جو اپنی اولاد کی دینی و دنیوی ترقیات کے لئے ایک انسان کرتا ہے وہاں دعا بھی ہو کیونکہ اصل ذات تو خدا تعالیٰ کی ہے جو اچھے نتائج پیدا فرماتا ہے۔ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ وہ لوگ اپنی ذاتی صلاحیت سے اپنی اولاد کی تربیت کر رہے ہوتے ہیں تو یہ بھی خیال غلط ہے۔ ایسے لوگ جو دنیا دار لوگ ہیں اگر اپنی اولاد کی ترقی دیکھتے ہیں تو یہ ترقی اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے صدقے تو بے شک انہیں فائدہ دے رہی ہے یا اس سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور یہ صرف دنیاوی ترقی ہے، دنیاوی معاملات کی ترقی ہے۔ لیکن وہ رحمان کے بندے کہلانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں متقیوں کا امام ہونے کا اعزاز نہیں بخشا اور متقیوں کا امام ہونے کی وجہ سے اپنے تقویٰ میں بڑھنے کی طرف ان کی توجہ نہیں پھیری۔ لیکن جو اپنی اولاد کے لئے تقویٰ میں بڑھنے کی دعا بھی مانگے گا وہ صرف ان کی دنیاوی ترقی نہیں مانگے گا بلکہ دینی اور روحانی ترقی بھی مانگے گا اور پھر خود بھی تقویٰ میں بڑھنے کی کوشش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو حاصل کرنے والا ہوگا۔

آجکل دنیا میں ہر جگہ معاشرے میں بچوں کی تعلیم اور دنیاوی ترقی کے لئے والدین بڑے پریشان رہتے ہیں لیکن روحانیت کی طرف بہت کم توجہ ہے۔ یہاں مغربی ممالک میں تو آزادی کے نام پر اب بچوں کو اتنا بے باک کر دیا گیا ہے کہ وہ والدین کی نصیحت ماننے سے بھی انکاری ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اب ان لوگوں کو احساس ہو رہا ہے، پروگرام بھی ٹی وی پر آنے شروع ہو گئے ہیں کہ یہ ضرورت سے زیادہ آزادی ہے جو بچوں کو دی جا رہی ہے۔ والدین نے بچوں کا امام کیا بننا ہے

اب تو بچے والدین کے آگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بہت سے کیس ایسے ہونے لگ گئے ہیں کہ بچے والدین پر ہاتھ اٹھانے لگ گئے ہیں۔ ذرا سی روک ٹوک بھی برداشت نہیں کرتے ہیں۔ کوئی نیک نصیحت کی جائے برداشت نہیں کرتے۔ جیسا کہ مَیں نے کہا اب یہ آوازیں اٹھنے لگ گئی ہیں کہ اگلی نسل کو اگر سنبھالنا ہے تو اس کی کوئی حد مقرر کی جائے کہ کس حد تک والدین نے برداشت کرنا ہے اور کہاں اپنے بچوں کو سزا دینی ہے۔ کیونکہ والدین جب کسی غلط حرکت پر سزا دیتے ہیں تو یہاں مغربی ممالک میں بچوں کی حفاظت کے جو ادارے بنے ہوئے ہیں وہ بچوں کو اپنے پاس لے جاتے ہیں یا بچے والدین کو یہ دھمکی دیتے ہیں کہ اگر ہمیں کچھ کہا تو ہم وہاں چلے جائیں گے اور اس بات نے بچوں کو حد سے زیادہ بے باک کر دیا ہے۔ وہ کسی لینے دینے میں نہیں رہے۔ بعض خاندان تو ایسے ہیں کہ ان کے بچوں کی حالت بہت ہی بُری ہو چکی ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دُعا کا خانہ خالی ہے۔ پس فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو کہ بچوں کی صحیح تربیت ہو اور پھر اس کے ساتھ ہی اپنے نیک نمونے بھی قائم کرو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:

''پھر ایک اور بات ہے کہ اولاد کی خواہش تو لوگ بڑی کرتے ہیں اور اولاد ہوتی بھی ہے مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ اولاد کی تربیت اور ان کو عمدہ اور نیک چلن بنانے اور خدا تعالیٰ کا فرمانبردار بنانے کی سعی اور فکر کریں۔ نہ کبھی ان کے لئے دعا کرتے ہیں اور نہ مراتب تربیت کو مدنظر رکھتے ہیں''۔

(تربیت کے جو مختلف درجے ہیں کہ کس طرح کرنی ہے۔ کس عمر میں کس قسم کی تربیت ہونی چاہئے۔ کس عمر سے بچوں کو سنبھالنا ہے۔ اس کی طرف توجہ نہیں ہے۔)

فرمایا کہ: ”میری اپنی تو یہ حالت ہے کہ میری کوئی نماز ایسی نہیں جس میں مَیں اپنے دوستوں اور اولاد اور بیوی کے لئے دعا نہیں کرتا۔ بہت سے والدین ایسے ہیں جو اپنی اولاد کو بُری عادتیں سکھا دیتے ہیں۔ ابتداء میں جب وہ بدی کرنا سیکھنے لگتے ہیں تو ان کو تنبیہ نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن بدن دلیر اور بے باک ہوتے جاتے ہیں“۔

”لوگ اولاد کی خواہش تو کرتے ہیں مگر نہ اس لئے کہ وہ خادم دین ہو بلکہ اس لئے کہ دنیا میں ان کا کوئی وارث ہو۔ اور جب اولاد ہوتی ہے تو اس کی تربیت کا فکر نہیں کیا جاتا۔ نہ اس کے عقائد کی اصلاح کی جاتی ہے“۔

(الحکم جلد 5 نمبر 35 مورخہ 24/ستمبر 1901ء ص 10-12)

بچوں کو سکھایا بھی نہیں جاتا۔ کسی نے مجھے بتایا، کسی دوسرے مسلمان نے کسی بچے یا بچی کو کہہ دیا کہ تم لوگ تو شیطان کی عبادت کرنے والے ہو۔ خدا کو نہیں مانتے۔ اچھا بھلا ہوش مند بچہ تھا یا بچی تھی لیکن اس کو پتہ ہی نہیں تھا کہ جواب کیا دینا ہے اور خاموش ہو گئی۔ اس خاموشی سے دوسرے بچوں نے یقیناً یہ تاثر لیا ہو گا کہ جو احمدی ہیں یہ خدا کو نہیں ماننے والے۔ تو بنیادی چیزیں بھی بعض والدین اپنے بچوں کو نہیں بتاتے۔

فرمایا: ”اور نہ اخلاقی حالت کو درست کیا جاتا ہے“۔ اخلاقی حالت کو اگر بچپن سے درست کیا جائے تو بچہ کبھی والدین کے سامنے کھڑا ہی نہیں ہو سکتا کہ آگے سے تُو تکار کرے۔ پہلے میں ایک دفعہ کہہ چکا ہوں۔ بچوں کے لباس ہیں، لڑکیوں کے لباس ہیں، بچپن میں ہی 4-5 سال کی عمر میں لباس کی طرف توجہ دلائیں گے تو بڑے ہو کر ان میں احساس پیدا ہو گا۔ 13-14 سال کی عمر میں احساس کروائیں کہ ایک دم جینز بلاؤز سے اب تم کوٹ پہن لو تو وہ بچی آگے سے ردعمل دکھائے گی۔ اس لئے فرمایا

کہ اخلاقی حالت کو درست نہیں کیا جاتا۔ اس کی طرف بچپن سے توجہ دینی چاہئے۔ فرمایا کہ: ''یہ یاد رکھو کہ اس کا ایمان درست نہیں ہوسکتا جو اقرب تعلقات کو نہیں سمجھتا۔ جب وہ اس سے قاصر ہے تو اور نیکیوں کی امید اس سے کیا ہو سکتی ہے''۔ (جو قریب قریب کے تعلقات ہیں ان کا بھی اگر خیال نہیں ہے تو باقی نیکیاں کس طرح آ سکتی ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی خواہش کو اس طرح پر قرآن میں بیان فرمایا ہے رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ یعنی خدا تعالیٰ ہم کو ہماری بیویوں اور بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرماوے اور یہ تب ہی میسر آ سکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کی زندگی بسر نہ کرتے ہوں۔ بلکہ عبادالرحمٰن کی زندگی بسر کرنے والے ہوں اور خدا کو ہر شے پر مقدم کرنے والے ہوں اور آگے کھول کر یہ کہہ دیا وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ اولاد اگر نیک اور متقی ہو تو یہ ان کا امام ہی ہوگا اس سے گویا متقی ہونے کی بھی دعا ہے''۔

(الحکم جلد 5 نمبر 35 مورخہ 24 ستمبر 1901 ص 12-10)

یعنی اس میں اپنے متقی ہونے کی بھی دعا ہے۔

پس بچوں کی تربیت کے لئے جو متقی ہونا اور عبادالرحمٰن ہونا شرط ہے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اپنے متقی ہونے کے لئے بھی دعا اور کوشش کرنی چاہئے اور جب ہم خود متقی ہونے کی کوشش کریں گے تو ان خصوصیات کے بھی حامل ہوں گے جو اللہ تعالیٰ نے عبادالرحمٰن کی بیان فرمائی ہیں اور یہی باتیں اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والی ہوں گی۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک جگہ فرماتے ہیں کہ: ''انسانوں میں سے بھی جو سب سے زیادہ قابل قدر ہے اسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھتا ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا سچا تعلق رکھتے اور اپنے اندرونہ کو صاف رکھتے ہیں اور نوع

انسان کے ساتھ خیر اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں اور خدا کے سچے فرمانبردار ہیں"۔

(الحکم جلد 6 نمبر 36 مورخہ 10 اکتوبر 1902 ص 16)

ایک سچے احمدی میں یہ خصوصیات ہونی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہمیں اس کے ساتھ سچا تعلق ہو اور ہمارا اندرونہ ہمیشہ صاف رہے اور ہم اُن خصوصیات کے حامل بنیں جو عبادالرحمٰن بننے کے لئے ضروری ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں ہمیشہ اپنی دائمی جنتوں کا وارث بنائے۔ آمین

(الفضل انٹر نیشنل 16 اکتوبر 2009ء)